

کرشن چندر



باون پتے



PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081



پی ڈی ایف (PDF) کتب حاصل کرنے اور واٹس ایپ گروپ «کتاب کارنر»
میں شمولیت کے لیے مندرجہ بالا نمبرز کے واٹس ایپ پہ رابطہ کیجیے۔ شکریہ

باون پتے
ایک ناول

باون پتے

کرشن چندر

ایک ناول

مکتبہ شعروادب، سمن آباد، لاہور



| | | |
|------|-------|-------------------|
| نقشہ | | توازنہ |
| طبع | | مفہم پر نظر لاہور |
| قیمت | | ۲ روپے |

.....

رفعیہ داد میں روڈ پر بحیثیت سٹوڈیو کے قریب ایکسٹراوین کے آفس کے باہر بھی کے کعبے سے لگی اپنی سسلی رضیہ سے باتیں کر رہی تھی کہ اتنے میں نو بھارت پر ڈکشن کا سسٹمنٹ ڈائریکٹر بٹھا چارہ دوڑا دوڑا اُس کے پاس آیا۔ اور کہنے لگا "سیٹو تمہیں بلاتے ہیں" رفعیہ نے ہاتھ جلا کے گویا پوسٹلے کو لپٹے ذہن سے دور دفنان کرتے ہوئے کہا "جاؤ۔ جاؤ تمہارے سیٹو دس بار بلانے کی کام نہیں دیتے۔ میں نہیں آؤں گی۔"

مسلے بٹھا چارہ کا دوڑتے دوڑتے دم پھول گیا تھا۔ حالانکہ نو بھارت پر ڈکشن کا دفتر یہاں سے پچاس ساٹھ گز سے زیادہ دور نہ تھا۔ پھر بھی وہ بانپ رہا تھا۔ اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "نہیں رضیہ ابھی تھوڑی دیر میں ناچنے والی لوکیوں کی ٹرائل ہوگی۔ ابھی فیصلہ ہو جائے گا۔ راستہ کو شوٹنگ ہے۔ ناچ لوکیاں موجود ہیں۔ ایک اور چل جائے۔ تم چلی چلو۔ ورنہ۔"

بٹھانے رضیہ کی طرف دیکھا۔ رضیہ نے اپنی گولڈ ڈائج کی طرف دیکھا اور پھر رضیہ سے سفارش کرتے ہوئے کہا "تو چلی جا۔ میری تو آج اپنے دلدار کے ساتھ جوہر پراجوائنٹ میمنٹ ہے۔"

"ہاں ہاں۔ رضیہ جگ کر رہی" تو جا جوہر۔ عیش کرے۔"

تقریباً ہاتھ جوڑتے ہوئے ٹنگ لگاتے ہوئے اس سے کہہ رہا تھا: رضیہ بولی، تم کہاں ظلم پس آگئیں؟ یہ سب سے تم بہت شریف معلوم ہوتی ہو۔ یہ لائن تمہارے لئے ٹھیک نہیں ہے۔ اب اگر آگئی ہو تو ان مندرجہ ذیل پتہ یوں، گہرائیوں کے ساتھ کام کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ صرف بوچھالی ڈائریکٹروں کے ساتھ کام کرو۔ بوچھالی لوگ بڑے پکڑ ڈھوٹے ہیں۔ ہمیرا بھال، ہمیرا ٹیگور، ہمیرا دیو کی بابو، ہمیرا فیروز تھیسرس، یہاں میں نے ستین گھنٹہ سے تمہارا بات کیا ہے۔“

بھٹا چا دی نے رضیہ کی طرف اس طرح پگھلی جھ ہوں سے دیکھا۔ جیسے بچہ اپنے سالگرہ کے ایک کی طرف دیکھتا ہے۔ وہ کچھ اور کہنے والا تھا کہ اتنے میں نو بھارت پروڈکشن کا دفتر آگیا۔ اور رضیہ جلدی سے اندر جا کے بڑے ہال میں ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے سامنے پانچ اور لوگ یاں بیٹھی تھیں۔ غالباً اس کی طرح ڈانس کی ٹرانی دینے آئی تھیں۔ وہ اُن میں سے تین کو نہیں جانتی تھی۔ دو سے ہیں علیک سلیک تھی۔ رضیہ نے ہاتھ اوپر اٹھا کے انہیں آداب کیا۔ اُن دونوں نے سر کی جنبش سے بڑی نخوت سے آداب کا جواب دیا۔ کیونکہ وہ دونوں بے حد خوب صورت تھیں۔ گوری چنچی، اچھے لباس، اچھے زمین زریروں میں بھی جھائی۔ گویا بالکل ڈھن بن کر ڈول میں بیٹھنے کے لئے تیار۔ اور رضیہ کی شکل صورت خدایوں ہی سی تھی۔ رنگ سانولا۔ آنکھیں بڑی بڑی گرہنے حلقے بڑے ہوئے۔ ناک بینی۔ مگر ہونٹ موٹے۔ اور ہر کے دانت خدا کی طرح سے میٹھے۔ قد نہ چھوٹا نہ لمبا۔ مگر چہرے سے نیچے جسم بے حد متناسب تھا۔ سینہ، کمر، گورھے، رانیں، پنڈلیاں۔ اک منہی ہوئی، مشاق لہجے والی کی مشرق کی کیفیت لئے ہوئے۔ رضیہ جب سٹوڈیو کے فرش پر ناچتی تھی۔ تو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا جیس کی سٹار پر کوئی کنول نقش کر رہا ہے۔ مگر سٹی میں خود ار تھی اس لئے کام خدا شکل سے ملتا تھا۔

رضیہ نے ہال کا دیوار پر لگے ہوئے کواک کی طرف دیکھا۔ اُسے یہاں آئے ہوئے چند بے منت ہوئے تھے۔ اور ابھی تک ڈائریکٹر کا کوئی پتہ نہ تھا۔ اُس نے نظر گھا کر ہال کے اندر دروازے

کی طرف دیکھا۔ جو پلائی ڈڈ اور دودھیا رنگ کے کالج کے استخراج سے بنا ہوا تھا۔ دودھیا رنگ کے کالج پر ایک نئی عورت کی تصویر تھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے کالج ہی کی طرح پر ابھرے ہوئے فضا میں لکھا ہوا تھا۔ "نوجوانت پر ڈکشن" اتنے میں پلائی ڈڈ کا دروازہ کھلا۔ اور بٹھا چاریہ ایک بے قد کے گھنے اور گندی رنگ کے آدمی کو جس نے ایک سفید پتلون اور بوکی کی تیس پہن رکھی تھی اپنے ساتھ لے کر ہال میں آیا۔ اندر آئے اس نے رفیع کی طرف اشارہ کیا رفیع نے اٹھ کے آداب کیا۔ لائے گھنے آدمی نے اپنی بیوی کی سی جھوٹی مگر نہایت تیز آنکھوں سے رفیع کو دُور سے بھانپا۔ پھر وہ اس کے قریب چلا گیا۔ اور اس کے گرد ایسے گھوم گیا۔ جیسے کسی شے کے گرد گھوم رہا ہو۔ اس نے چہرہ، سینہ، اکر، کو لہجے سب کا اندازہ کر لیا۔ پھر اُس نے بٹھا چاریہ کی طرف دیکھ کر کہا: "ہوں: اس کے بعد پلائی ڈڈ کا دروازہ دیر تک فیس کے دل کی طرح لڑتا رہا۔ کیونکہ یہ شخص غم ڈار، کٹر جوشی تھا۔ جس کی تصویر میں رفیع کو کام لینے والا تھا۔ رفیع نے بٹھا چاریہ سے پوچھا: "اس ہوں کا کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تم پاس ہو: بٹھا چاریہ نے جواب دیا۔

"مگر ڈانس کی ٹرائی تو لی نہیں۔ ساتھ چھ تو اب ہو گئے ہر رفیع نے کھاک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "مجھے گھر جانا ہو گا اور گھر جاکے کھانا تیار کرنا ہو گا۔ کیونکہ اماں بیمار ہیں۔ اگر میں پاس ہوں تو ان سے پوچھ کے — — —" رفیع نے پلائی ڈڈ کے دروازے کے اندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "مجھے بتادو۔ میں وقت پر شوٹنگ میں آ جاؤں گی۔ جوشی جی سے پوچھ لو؟"

بٹھا چاریہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور اندر پوچھنے کے لئے چلا گیا۔ اگلے پیر دن لوٹ آیا بولا: "ڈانس کی ٹرائی ہوگی پھر فیصلہ ہو گا؟"

"کب ٹرائی ہوگی؟" ایک پنجابی لڑکی نے اپنے رخسار پر بڑے ٹھٹھے سے اٹھی رملہ کر کہا: "ہم تو یہاں سچ بچے سے بچی ہیں۔ آں تو ہم کب ٹرائی ہو گے۔ ہم کو کوئی کام دیا نہیں ہے اور؟"

”آں؟ بھلا؟“

پنجابی لڑکی کو بڑا مختصر آ رہا تھا۔

بھٹا چاریہ نے اُسے بھلاتے ہوئے کہا ”ابھی ہوگی۔ سیٹھ کا انتظار ہے“ سیٹھ تو اندر بیٹھے ہیں۔ ایک اور لڑکی نے چمک کر کہا ”میں جب آئی تھی تو اُن کو اندر جلاتے دیکھا تھا۔ مجھ کو کیا بناتے ہو۔ دس سال سے فلم انڈسٹری میں کام کر رہی ہوں سیٹھ جیال بھائی کو میں نہیں جانتی کیا؟“

بھٹا چاریہ نے اور بھی دھیرے سے دھیرے سروں میں اُن سب سے کہا ”وہ تو کہنی کے بالک ہیں نا سیٹھ جیال بھائی بانگڑا۔ مگر یہاں اس وقت ایک دوسرے سیٹھ کا انتظار ہے۔ سیٹھ بھگت۔ لال ڈسٹری بیوٹر کا...“

”یہاں کون کس کا سیٹھ ہے کچھ پتہ نہیں چلتا“ دس سال سے فلم میں کام کرنے والی لڑکی بڑی آندگی سے بولی۔ اور بھٹا چاریہ کی طرف چٹوڑ کر کے بیٹھ گئی۔

بھٹا چاریہ نے بائیں بے بس ہو کر کہا ”بس ابھی آتے ہوں گے۔ اُن کا ٹیلی فون آیا تھا۔ ابھی آدھ گھنٹہ میں آجائیں گے۔ ٹرائی ہو جائے گی“

”ٹرائی دابچہ“ وہ پنجابی لڑکی بھٹا چاریہ کے اندر جانے کے بعد بولی ”ساڈا امر ترہوتا۔ تو اس کی ٹانگیں چیر دیتی۔ پنج درجے دا بلکے بٹھایا ہوا۔ اس سو روپے پُرنے اُ“

رفیہ کو اس کی باتیں سُن کر مزا آگیا۔ اچھا تو یہ بے چاریاں پانچ بجے سے ڈانس کی ٹرائی کے لئے بیٹھی تھیں! رفیہ نے دل ہی دل میں تسکریہ ادا کیا کہ وہ ابھی آئی ہے۔ ورنہ اُسے بھی اتنا ٹوٹا انتظار کرنا پڑتا۔ اتنے میں یلائی وڈ کے حوالہ سے کے اندر سے ایک زوردار قہقہہ سُنائی دیا۔ اور سب لوگوں کی نظرس ایک لمحے کے لئے دروازے پر جا کر جم گئیں

پلائی وڈ اور کاخ کا دروازہ ایک پلائی وڈ کین کے اندر کھلتا تھا۔ یہ دروازہ اس کین میں کچھ اس طرح سے فٹ تھا کہ بال میں بیٹھنے والے کو اس کین میں بیٹھنے والے کو صرف دھڑنظر آسکتا تھا۔ اور اس دروازے سے اوپر جھانکنے والے کو صرف دھڑ سے اوپر کا حصہ نظر آسکتا تھا۔ یہی نہ یہ دروازہ اس کین کے وسط میں اوپر سے اور نیچے سے دونوں طرف سے کھلا تھا کہ پلائی وڈ کم خرچ ہو۔ گو یا یہ دروازہ نہ تھا۔ لکڑی کا ایک ٹیکر تھا۔ جو ہر کے سامنے پر بنانے والی حسیہ کے لئے تیرکی کا لباس تھا جس میں نظر زیادہ آتا ہے۔ اور چھپایا کم جاتا ہے۔

رفیہ جو بال میں ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ پلائی وڈ کین میں ایک میز کے نیچے بہت سی کٹھی جگہوں کا اجتماع دیکھ رہی تھی۔ ہنسا چاریہ جو کین کے اندر دروازے سے لگا کھڑا تھا وہ ان ہانگوں سے اوپر کے انسانی جسم دیکھ رہا تھا جو اس وقت بظاہر زری ایسے دل چپ کھیل میں مصروف نظر آتے تھے۔ مگر ہنسا چاریہ جانتا تھا کہ ان میں سے ہر شخص کے کان ایک کونے میں پڑے ہوئے ٹیلی فون پر گئے ہوئے ہیں۔ جہاں ابھی ابھی سیٹھ بھگت لال کا کال آیا تھا۔ ہنسا چاریہ نے یہی کھینے والوں پر نظر ڈرائی۔ ان میں سب سے نمایاں ظلم کے پر وڈر سیر سیٹھ میناں بھائی بانکڑا تھے۔ اور بھانڈا۔ زریہ اندام سر کے بال بال مکمل سفید۔ موری چٹی رگت پر بڑا شست کھیتی ہوئی۔ ہاتھوں میں ہیرے کی تین انگوٹھیاں

پہننے ہوئے سب سے کم متفکر دکھائی دیتے تھے۔ سیٹھ میتال بھائی نے جنگ کے زمانے میں غلوں کے لائسنس کی بلیک مارکیٹ کی تھی، ان دنوں فلم کے ایک لائسنس کے عوض بلیک مارکیٹ سے لاکھ سالا لاکھ روپیہ لیا جاتا تھا، بس گورنمنٹ آف انڈیا سے فلم بنانے کا ایک لائسنس لے آئے اور اُسے بلیک مارکیٹ میں بیچ دیکر بیٹے سالا لاکھ روپیہ مل جائے گا۔

سیٹھ میتال بھائی ہاتھ دیا اب تک کوئی پچھتر ٹھیں بنا چکے تھے۔ جنگ سے پہلے ہر راہ تفسیراً ایک فلم تیار کر لیتے تھے۔ بارہ لائسنس یوں ہی آگئے۔ پھر ان کے پاس تین سٹوڈیو تھے۔ چار چاروں کے لائسنس اُن سٹوڈیو کے حصے میں بھی آئے۔ بارہ لائسنس یہ ہو گئے۔ جو میں لائسنس اگر وہ بازار میں بیچے تو ہر سال خیرے میں بیٹھے ٹھائے تیس لاکھ کی آمدنی ہو جاتی۔ مگر سیٹھ اتنے لالچی نہ تھے۔ انہیں قوم کا بھی خیال تھا۔ تین سٹوڈیو میں جو لوگ کام کر رہے تھے ان کی بیوی بچوں کا بھی خیال تھا۔ اس لئے وہ سال میں صرف بارہ لائسنس کا لے بازار میں بیچتے تھے اور بارہ کی تصویریں بناتے تھے۔ اُن سے جو منافع ہوتا تھا وہ اس کی ایک پانی ظم میں نہیں لگاتے تھے۔ بلکہ اس سے زمین خریدتے تھے۔ مکان، جڑی بڑی بلا لگیں۔ ۳۳ فلوڈ کے حصے۔ روٹی کے مل کی یکینی۔ شکر کی مل کی پارٹنرشپ۔ غرض کہ جہاں سرمایہ زیادہ محفوظ سمجھتے۔ وہاں اپنا منافع لگاتے تھے۔ اور یہ بات انہیں اُن کی میڈم بھائی تھیں۔ میڈم اُن کی بیوی نہ تھی۔ اُن کی بیوی تو کالابادیوی روڈ میں ایک چھوٹے سے فلیٹ میں اپنے پانی بکڑوں کے ساتھ رہتی تھی۔ میڈم اُن کی داشتہ تھی۔ ان کی جان۔ اُن کی ڈارنگ۔ اور جب سے میڈم نے اُن کے کاروبار میں دل چسپی لینا شروع کی تھی، میڈم اُن کی عقل بھی تھی۔ سیٹھ میتال بھائی بانا۔ اب اپنی عقل کا استعمال صرف خاص موقعوں پر کرتے تھے۔ کیونکہ سرائے کے حصوں میں عقل ایک اس حد تک کام کرتی ہے۔ ایک خاص حد کے بعد جب سرمایہ جڑو جاتا ہے۔ تو پھر خود بخود جڑو جاتا ہے۔ پھر عقل کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ پھر سرمایہ اور منافع کی اپنی عقل ہوتی ہے۔ جو خود بخود کٹ

کھدائیں کی طرح کام کرتی تھی ہے۔

سیٹھ میتال بھائی بائیکڑ کا سرمایہ جب پچاس لاکھ سے تجاوز کر گیا۔ تو انہوں نے بھی سرمایہ کی اس خود غفلت سے کام لینا شروع کیا۔ اتنا بڑا سرمایہ برت کے گولے کی طرح ہوتا ہے۔ جوں جوں اُسے گھماتے جاتے۔ یہ خود بخود برت کے گولے کی طرح بڑا ہوتا جاتا ہے۔ اور اپنے گرد اور روسیہ سمیت جاتا ہے۔

سیٹھ میتال بھائی بائیکڑ اپنے روپے کو منافع کی اس بڑی منزل پر پہنچا کہ خود ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ اور کاویا زیادہ قریب تک کے سپرد کر دیا تھا۔ وہ خود اس وقت نہایت ٹینگی اور زندہ دل سے بیٹھے ہوئے ری میں مار رہے تھے۔ اور بیٹھم کا انتظار کر رہے تھے۔ جولاہ بھگت لال ڈسٹری بیوٹر کو لانے کے لئے گئی ہوئی تھی۔ بٹنا چاریہ کی صفہ میٹھم کی کرسی پر گئی جہاں اس وقت بائیکڑ باسیٹھ کا نیا فلم ڈائریکٹر اکرم میز پر گھڑوں مٹیا ایک منٹھل سے اُداس انداز میں رمی کھیل رہا تھا۔ اس کے چہرے سے مٹھل ہوتا تھا۔ جیسے اُسے اس کھیل میں قطعی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ صرف وقت کاٹنے کے لئے یہاں بیٹھا ہے اور یہ صحیح بھی تھا۔ اکرم کا دل اس وقت تماش کے چٹوں میں نہ تھا۔ وہ بھی لالہ بھگت لال ڈسٹری بیوٹر کی آمد کا منتظر تھا۔ کیونکہ سیٹھ میتال بھائی بائیکڑ اپنے اس سے وعدہ کیا تھا کہ لالہ بھگت لال کے آتے ہی وہ اُسے اس کی نئی ٹکپس کے لئے جو اکرم سیٹھ صاحب کے لئے شروع کر رہا تھا ایک ہزار روپیہ دے دیا۔ اکرم کو سیٹھ میتال بھائی نے ایک قوی فلم بنانے کے لئے نوکر رکھا تھا۔ کیونکہ اکرم فلمی حلقوں میں سوشلسٹ سمجھا جاتا تھا۔ وہ دراصل فلم انڈسٹری میں بیرونی کے لئے آیا تھا۔ میانہ قد، خوب صورت کساناں چہرہ، فراخ ماتھا، گنگھریلے بال۔ اُسے کسی بھی فلم کا ہیرو بنا دینے کے لئے کافی تھے۔ فلم انڈسٹری میں آنے سے پہلے وہ اردو تاروی میں بھی ایک مستند حیثیت کا ادا تھا۔ اس نے بہت وہ فلم انڈسٹری میں آیا۔ تو شروع شروع میں اس کا بہت ادا بھگت ہوئی۔ وہ دونوں کا یکے بعد دیگرے ہیرو بننا۔ مگر اداکاری اُسے اس نہ آئی۔ ر

جس قسم کی قلعہ بندی اور کاری کی ضرورت تھی۔ وہ اس سے ہوشیار نہیں سکی۔ اور جس قسم کی نظری انداز کاری وہ پسند کرتا تھا اسے یہاں کے فلم ڈائریکٹر گماں سمجھتے تھے۔ پھر انداز کاری حمید کر اس نے گیت لکھے کمالے لکھے کہانیاں لکھیں۔ تین چار فلمیں بھی ڈائریکٹ کر ڈالیں۔ مگر ان فلموں میں وہی مسیبت تھی۔ یہ فلمیں عام راستوں سے اس قدر مٹی ہوئی تھیں ان میں جگانے نہ تھے۔ ناج تو بالکل نہیں تھے۔ وہ ہڈ ہڈی کا سیٹی بھی نہیں ان فلموں میں کوئی مسخرہ اپنی توند ہلا کے ہنسانا نہ تھا۔ نہ کوئی نظریات بشلہ کی سی موٹھیں لگائے آدمی آدمی انگریزی بولتا تھا۔ ان فلموں کا ماحول ایسا ٹریل اور گھنچو جیسے ہندوستان میں رہنے والے کروڑوں کسانوں اور غریب فردوروں کا ہوتا ہے۔ گروار ایسے فیئر شاعرانہ موضوع اس قدر روزمرہ کی بھینٹوں اور مصوحتوں کے ساتھ بندھا ہوا کہ فلم دیکھنے والے تو دوسری دن میں پکڑا گئے اور تصویریں فیل ہو گئیں۔ اور وہ جو خوب صورت تھا۔ حسین تھا۔ جو اپنے وطن سے اپنا لوکا سا جسم۔ یوسف کلاشن اور غالب کی سی نظر لایا تھا۔ جنگ کے آخری چار سالوں میں پچپک کے زد گیا۔

اس وقت اس کی وارٹی بڑھی ہوئی تھی۔ اس کی تپلوں پر میل کے چٹکتے تھے۔ اور دوسرے نظری آنے والے لٹکے تھے جنہیں اس کی درد مند بہن نے بڑی محنت سے بیا تھا۔ سیٹھ حیات بھائی باکڑیا کو جیسا سوچ رہے تھے گویا جنگ کے بعد قوی موضوعات کا زمانہ آئے گا۔ اس نے انہوں نے پہلے ہی سے سوچ بچھ کے اکرم کو اپنے ہاں دو سال کے کنٹریکٹ پر رکھ لیا۔ مگر اب وہ اکرم کی پچیس شروع کرنے میں بہت چپکا رہے تھے۔ جانے چلے نہ چلے۔ اس ملک میں جہاں دو آنے کے منافق کے لئے افراد اپنے ملک سے غداری کر جاتے ہیں! جانے اس ملک میں قوی موضوعات کو جیتنے ہونے کوئی کو چلے گی بھی کہ نہیں.... کہ ان کا حشر بھی ان تصویروں کی طرح ہو گا جو اکرم نے اس سے پہلے بنائی تھیں سیٹھ جہاں سے کوئی فیصلہ نہ کر پائے تھے۔ اکرم کی پچھر شروع نہیں ہو رہی تھی۔ اور اکرم پریشان تھا گویا اس کے پاس دو سال کا کنٹریکٹ تھا۔ لیکن جس ڈائریکٹر کے پاس پچھر نہ ہو اس کے کنٹریکٹ کی

کیا حیثیت ہوتی ہے۔ کیا کرم اب ان چار سالوں میں خوب سمجھ چکا تھا۔ دیکھتے آج قیمت کیا رنگ لاتی ہے۔ آج سیٹھ نے اس کی کچھ ضرورت کرنے کے لئے اس سے ایک ہزار کے چیک کا وعدہ تو کیا ہے۔

بھنا پارہ خوب جانتا تھا کہ کرم کے دل و دماغ پر کیا گزر رہی ہے۔ مگر اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کے اپنے غم و فکر کڑھری جوشی جی بھی اسی چیک کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ری کھیل رہے تھے۔ جوشی جی بڑے سنجے ہوئے غم و فکر کڑھتے۔ اس کی غم و صوگی، ڈالی، ڈم ڈم، اور ڈڈاں ڈڈاں ڈاں عوام میں بے مزہ مقبول ہوئی تھیں۔ جوشی جی کی ہر فلم ڈاں سے شروع ہوتی تھی، اور وہ اپنی فلموں میں عورت کے جسم کی نمائش کے بے مثال تھے۔ عورت کے بال، عورت کی آنکھیں، عورت کا سینہ، عورت کے بانو، اس کے کولے، رانیں، پنڈلیاں ہر چیز کی نمائش کرنے کے قائل تھے۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا، ورنہ عورت کو باطل نگاہ کر کے فلم میں لے آتے تھے۔ کیا کرم سیٹھ؟ جوشی جی نے ٹنگی اٹھا کر رنگ لگاتے ہوئے کہا "سنس کی قسمی سے ڈر لگتا ہے۔ ورنہ ایسی کچھ بناؤں کہ قیامت تک ڈرے۔"

سیٹھ جیتاں بھائی نے اس کی ایک ٹہلی لیتے ہوئے کہا "مگر جوشی جی تم نے اپنی جی کچھ کا نام کیا سوچا ہے؟" "نام؟ ہم؟ جوشی جی نے میز پر زور سے ٹکا مار کے کہا "اسے نام، اسے سیٹھ و ڈمنو نام ہوں گا، وہ ڈمنو نام ہوں گا۔ پھر بچا ایک رنگ کر اپنے گھنے سر پر ہاتھ پھیر کے بولے "ارے سیٹھ یہ ڈمنو نام خود کیا ہے؟ ڈھکی ڈھلا، ڈم ڈم، ڈڈاں ڈڈاں ڈاں اور ڈمنو!"

"ڈمنو کا مطلب کیا ہے؟" کرم نے ذرا اک تیز قسم کی آندہ لگی سے پوچھا جس میں تھوڑی سی حقارت بھی شامل تھی۔ "یہ ڈمنو کس زبان کا لفظ ہے؟" "کسی زبان کا بھی ہو اپنے کو اس سے کیا ہے۔۔۔۔۔ جوشی جی گرج کے بولے "مگر اچھا لگتا ہے"

کہ نہیں۔ جوتے وقت منہ بھر تلے کہ نہیں۔ ڈمنو! ذرا بول کے دیکھو۔ ایسا سالا معلوم ہوتا ہے کسی نے منہ میں خیال رکھ دیا۔ ڈمنو!!

”راہ! راہ! میرے یار!“
جوشی جی نے خود اپنی پیٹھ کو چمکی دی۔

بھٹا چارہ زور سے بولا ”راہ! راہ! جوشی جی کیا نام سُجھا ہے۔ ڈم فُ ایک دم نیا۔ ایک دم اور کھل
ایک دم بھنگلی!“

میز پر ڈالس ڈاؤن رکھ کر بابولال بھی بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں میں سرمہ لگا رکھا تھا اور کنبھو
پرانی لائبریری میں بڑا رکھی تھیں۔ اس کا چہرہ ایک دیے خارش زدہ کتے کی طرح لبو تھا اور کچکا ہوا تھا
جسے غالباً چھ مہینے سے کبھی پیٹ بھر کے کھانا نہ ملا ہو۔ مگر یہ بات نہیں تھی۔ بابولال غلی صفت کے
رقاصوں میں سب سے عمدہ اور ڈرجیا رقص مانا جاتا تھا۔ وہ ایک عمدہ خلیٹ میں رہتا تھا۔ ایک عمدہ
کار میں گھومتا تھا۔ ایک عمدہ چوکری کو اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ کاریں اور عورتیں بدنے میں اُسے یہ دھولے
حاصل تھا۔ وہ بڑے فخر سے کہا کرتا تھا کہ وہ دنیا کی ہر قوم کی عورت چمک چکا ہے۔ اور خضیا امراض میں سے
کئی ایسا مرض نہیں جو اسے لاق نہ ہو۔ اس کا چہرہ انہیں امراض کا بیٹا جاگتا تھا ”ڈمنو! پھر وہ بھی
پھل پڑا اور جوشی سے اتھلائے ہوئے کہنے لگا۔

ڈم فو۔ ڈم فو

بجم فو۔ بجم فو

کمر کما کمر۔ کمر کما کمر

ڈم فو!!!

تالی سے ترحیم کا ہواؤ تبا کے اس نے کہا۔ ایسی اسپینی ٹینگوں میں اس پر دوں گا کہ سارا بانی وڈا کا

نہے دیکھ کر کہے چکر اگے رہ جائے۔ سیٹھ ڈوم فوجیت عمدہ نام ہے۔

اب میز پر صرف ایک آدمی خاموش تھا۔ بجن دت موسیقار بینی سوزگ ڈائریکٹر بجن دت کی ذہین آنکھیں کہہ رہی تھیں۔ اور اکرم جانشا تھا کہ اسے یہ نام پسند نہیں ہے۔ بجن دت ہندوستانی فلم انڈسٹری میں آنے سے پہلے اپنی قوی موسیقی کے بہترین ماہروں میں شمار ہوتا تھا۔ اس نے محاذوں محاذوں گھوم کے کوئی دو ہزار سے زیادہ لوگ گیت اور سینکڑوں دھنیں جج کی تھیں وہ جب فلم انڈسٹری میں آیا تھا تو اکرم کی طرح ایک آئندہ شہ۔ ایک خواب۔ ایک قوی فلسفہ۔ ایک سماجی مقصد۔ ایک نیا زاویہ نگاہ لے کے آیا تھا۔ جس تصویروں کی موسیقی مرتب کرنے کے بعد اس کے دل کی چمکاری روشن تھی۔ مگر چاندی کے ڈھیروں تلے دبی تھی۔ کیونکہ اس نے کامیابی کے لئے لوگ دھنوں میں فحش اور بازی گیت باندھے تھے۔ وہ دھنیں جس میں اس کے ٹنک کے کسانوں نے گندم کی فصل بونی تھی۔ دھان کے خوشے لہرائے تھے دھنیں جو کنواریوں کے ترنجن۔ دھن کی ڈولی اور ماں کی لوری کے لئے وقف تھے۔ آج قصا بوں کی طرح کوٹھوں کا گوشت۔ مگر کاغذ اور پٹلیوں کی گاؤں دی بچ رہے تھے۔

بجن دت کو معلوم ہوا تھا کہ فلم انڈسٹری میں نہیں کسی بوجہ خانے میں آگسا ہے۔ مگر سب اُسے قوی موسیقی کو ذرا کرنے کے لئے پچاس ہزار روپے مل رہے تھے اور فلم کے باہر کوئی اُسے پاس دینے کو تیار نہ تھا۔ اس لئے بہت عرصہ ہوا بجن دت نے سوچ بھوکے آنکھ بند کر لی۔ اپنے دماغ کو اتار لگایا اپنے سماجی مقصد کو دھنوں کی گہری چاندی کی بھوت میں چھپا دیا۔ اور خود ہاتھ میں ہارمون کا بخرے کر اُن لوگ دھنوں کو ذرا کرنے بیٹھ گیا۔ جنہیں اس نے اپنی جوانی کے بہترین ایام میں اس کاوش سے اکٹھا کیا تھا۔

بجن دت نے دیکھی کہ ایک بہت بڑا بیگ ایک ہی سانس میں مٹتی ہے اور اٹھ اٹھیں بچی کر کے ہلا کر دیتا ہے۔ کیونکہ اکرم اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سیٹھ سدا پچھے (بہت عمدہ ہے) چلے گا!

سیٹھ میاں بھائی باگڑیا نے خوش ہو کر جوشی جی کی طرف دیکھا۔ پھر بیٹا چاری کی طرف دیکھ کر کہنے لگے "بیٹا کل سیٹھ جی خیر سے بہہ دے کہ وہ جوشی کی نئی فلم ڈوم فوکا شہارہ دے دے فلم نوز میں اپنا مصنفیک کر دے" اکرم نے شرم سے سر جھکا لیا۔ کیا وہ کوئی انوکھا نام نہیں کر سکتا۔ کیا وہ کہیں بھاگ کے نہیں جا سکتا کیا وہ ایشیں نہیں ڈھو سکتا۔ کیا وہ تگی گیری نہیں کر سکتا۔ کیا وہ مدوئی کی دل میں خود دہری نہیں کر سکتا۔ کیا وہ ٹوک پر جہاز لیں گا کام نہیں کر سکتا۔ کیا وہ ————— بھایک اکرم نے محسوس کیا کہ وہ جی میں سے کوئی نام نہیں کر سکتا۔ وہ بھایک ایڑیاں درگڑ کے خاموش ہو گیا اور ایک پتہ اٹھانے لگا۔ جو کہ اچو کر تھا۔ جیسا کہ نہیں رہا تھا۔ تاش کا پتہ۔ زندگی کے ایک فخریہ لمحے کی طرح اس پر تپس رہا تھا بھایک اکرم نے تاش میز پر پھینک دی۔ اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

سیٹھ میاں بھائی گہرا کراس کی طرف دیکھنے لگا۔ اکرم نے کہا "کچھ نہیں سیٹھ۔ سر میں درد ہو رہا ہے۔" اکرم یہ کہہ کر کہیں کے اس طرف کی کھڑکی میں چلا گیا جو باہر بازار کی طرف نکلتی تھی۔ اس کھڑکی پر تھے وہ بازار کا ناگ دیکھ سکتا تھا۔ ایرانی کی دوکان ظلم ایکسٹراؤں سے بھری پڑی تھی۔ پان دالے کی دوکان پر تین رنگے کھڑے پان کمار رہے تھے۔ اور چند بے ٹکڑے اُن کے گرد کھڑے ہنس رہے تھے۔ سڑک کے پار پرانی موٹر وی کے پُرزے بیچنے والا بچہ سنگھ اپنی کھاٹ پر میٹھا میٹھا ڈنگ رہا تھا۔ نیلی فون کے بجے کی تاروں پر کوڑے بیٹھے تھے اُن سے اوپر آسمان بنے مد گدلا اور کشیت تھا۔ اور اُس آسمان کی دھندلی آنکھ بدلی داری تھیں ایک پیلا بد نما وجہوں والا پانڈا ایک جلی ہوئی روٹی کی طرح نظر آ رہا تھا۔

اکرم نے غور سے اپنی ٹھنڈی گچھی لیس۔ وہ جانے تو کہاں جائے۔ کھڑکی سے واپس چلا آیا۔ میاں بھائی نے اس کے گلاس کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "تہا را گلاس اسی طرح بھرا پڑا ہے۔" اکرم پر کڑی ہنسی کر دیکھی جینے لگا۔ دیکھی تیغ! زندگی کی طرح۔ ناگامی کی طرح۔ اس کے گٹھے ہوئے کرے کی طرح۔ اچھی فلم کے خالی ہال کی طرح۔ محبوب کے آخری انکھار کی طرح۔ موت کے جاہر لمحے کی طرح۔ کیا

اتنی ساری تلخیوں سے دسکی کا ایک گھونٹ بوتلہ ہے؟ مگر لوگ تو کہتے ہیں اس میں نشہ ہوتا ہے۔ آج نشہ کہاں ہے؟

جھٹلا کے اکرم اٹھ کھڑا ہوا۔ میں اُسی وقت پلائی ڈو کے مردانے کی نگلی عورت اپنی جگہ سے ہلی۔ قریب آئی ہوئی معلوم ہوئی۔ دروازہ کھلا اور سیٹھ بھگت لال ڈھٹری بیوٹر کو اس ترک و احتشام سے داخل ہوا کہ لوگ اپنی کرسیوں سے کھڑے ہو گئے۔

سیٹھ بھگت لال کا چہرہ اس قدر گول تھا۔ گویا معلوم ہوتا تھا کسی نے پرکار رکھ کر دائرہ کھینچ دیا ہے۔ اُس کے چہرے کے نیچے کا جھٹ یعنی سینہ، مکر اور پیٹ بھی بوتلہ ہے کی وجہ سے اس قدر گول تھے کہ اس کے چہرے اور پیٹ کو دیکھ کر لوں محسوس ہوتا تھا۔ گویا کسی نے بڑے دائرے کے اوپر ایک چھوٹا دائرہ رکھ دیا ہے۔ اگر سیٹھ بھگت لال جیومیٹری کی اشکال کا ہی مجموعہ ہوتے تو خیریت تھی، مگر وہ تو اس کے علاوہ کچھ اور بھی تھے۔ وہ دشنامی ہند کے سب سے بڑے ڈھٹری بیوٹر تھے۔ تن و توش ہی میں نہیں دولت کی فراوانی کے اعتبار سے بھی وہ سب سے بڑے تھے۔ گھٹنوں میں رہتے تھے۔ سال میں چار بار بھی آتے تھے اور جب آتے تھے تو پروڈیوسر لوگ شہید کی نگلیوں کی طرح اُن سے چھٹ جاتے تھے۔ اس وقت بھی جب وہ اندر آئے تو دو چار مصاحبوں کو ساتھ لے آئے۔ ایک تو اُن میں سے جو ناما سا۔ وُجے قدا اور جی کی ہی آنکھوں والا آدمی تھا۔ وہ تو فتح چند تھا۔ امرت سر کا ایک ایگزیکٹو تھیں۔ امرت سر کا سب سے عمدہ سینا گھر اس کا تھا۔ دوسرا وہ جو کلمے رنگ کا، اونچے دانتوں والا، نہایت ہی سیاہ بالوں والا۔ جن پر اس نے بہت زیادہ تیل چھڑکھا تھا۔ وہ جو گھڑے تھا۔ چور گھڑے کے دو سینا تو احمد آباد میں تھے۔ کپ ناسک میں۔ اور ایک راج کوٹ میں تھا۔ چور گھڑے گجرات کا مشہور ایگزیکٹو تھیں۔ چور گھڑے کے ساتھ ایک ڈبل پتلا دھوئی پہنے ہوئے مرداڑی تھا۔ بٹشا نے اُسے پہچان لیا۔ یہ سیٹھ امر چند تھے جو پُر میں ماں کے تین بیٹے تھے۔ اس کے علاوہ وہ کالی مرچوں کا بیوپاری بھی کرتے تھے۔ یہ بٹشا کو اس لئے

معلوم تھا کہ سیٹھ امر چند نے ایک دفعہ اس کے ساتھ دسکی بیٹے ہوئے خود بتایا تھا کہ جب انہیں کالی مرجی کے بیوپار میں زیادہ فائدہ ہوتا ہے تو وہ اچھی کچریں حاصل کر کے اپنے سینا گروں میں چلاتے ہیں۔ اور جب نقصان ہوتا ہے یا کم فائدہ ہوتا ہے تو سٹنٹ یا دیوی دیوتاؤں کے قصوں دلی تصویریں حاصل کرتے ہیں۔ اگر آج وہ خوشی ہی کی کچر لینے آئے ہیں تو اس کا مطلب ہے، بٹلنے سوچا کہ اُن کا کالی مرجیوں والا بیوپار اچھا چل رہا ہے۔ اور اگر وہ اکرم کی تصویرے کے جلتے ہیں تو سمجھو کہ کالی مرجیوں کے بیوپار میں مسئلہ ہے؟ اس چھوٹے سے کہیں میں اتنی کرسیاں نہ تھیں کہ سب لوگ وہاں بیٹھ سکتے۔ گو سب لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ پہرچی سیٹھ بھگت لال نے یہاں بیٹھنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ جیال بھائی بانڈو کو لے کر ساتھ ملے کہیں میں چلے گئے۔ جو میڈم کا کہیں تھا۔ میڈم کے کہیں میں جلتے ہی جیال بھائی کو میڈم کی یاد آئی۔ بولے ”میڈم کہاں ہیں؟“ سیٹھ بھگت لال نے مشکرا کے کہا ”وہ تو اپنی سہیلی راج لستہ کے ہاں گئیں ہیں۔ مجھ سے کہا۔ آپ انہیں وہاں ٹیلی فون کریں۔ اگر کوئی کام ہو؟“

جیال بھائی نے ہرچھا ”چیک؟“

”ابھی دیتا ہوں“ یہ کہہ کر سیٹھ بھگت لال نے چور گھڑے کو اندر بلایا۔ ایک لمحہ جیال بھائی کی نظر دیکھا پھر چور گھڑے کو لے کر ”ایک منٹ کے لئے معاف کرنا“ کہہ کر وہ چور گھڑے کو لے کر سب سے اندر کے کہیں میں چلے گئے۔ جو میڈم کے کہیں سے ملحق تھا جس میں سیٹھ جیال بھائی خود بیٹھتے تھے۔

اندر جا کے بھگت لال نے چور گھڑے سے کہا ”اسے بار مجھے یہاں آکر دیا۔ جیال بھائی اگر ایک ہزار روپیہ دینا ہے نقد، تم اُس رقم میں سے دے دو؟“

چور گھڑے بولا ”خوشی جی کی تصویر پر دوں گا“

”اچھا۔ اچھا! بھگت لال بے صبری سے بولے۔

چور گھڑے پہلے ہی سے جیب میں ایک ہزار کی رقم لے کے آیا تھا۔ وہ یہ سب باتیں

موت کہہ رہے۔ رویہ آج کل "ہانکوا یا سیمو مونہ بنائے گئے" سلسلے بجکت لال نے ساٹھ ملے سو
 دس کے ہزار کی رسید لے لی ہے۔ یہ کوئی دھندلے کا زمانہ ہے۔ اب میں ہزار روپیہ کہہ رہے ہوں
 کروں۔ اچھا۔ اے۔ تو بھی اس ہزار کی رسید پر دستخط کر دے گا۔
 جوشی جی نے چپکے سے رسید پر دستخط کر دئے۔

باہر کی گھین میں آکے جوشی نے بھٹا کو آنکھ ماری۔ بھٹا اور وہ دونوں چپکے سے کہیں سے کسک گئے۔ اُن کا
 خیال تھا کہ یا کسی کو معلوم نہیں ہے۔ کیا ہو رہا ہے۔ حالانکہ سب جانتے تھے۔ وہ جو رلی کھیل رہے تھے
 وہ سب سے زیادہ جانتے تھے۔ مگر چپ تھے۔
 جوشی نے بھٹا کو پانسو روپے سے کہہ کر کہا "بس وہی شے نے دئے ہیں۔"
 "مگر؟"

جوشی نے بھٹا کو آنکھ مار کے کہا "اگر کچھ نہیں۔ اب اسی میں کام چلا لے۔ ہزار کی رقم اسی میں پورا کرنا چاہیگی۔"
 "ایک ہزار کی رسید بھی مجھے چاہئے۔"

"بہت اچھا جناب لال۔ وہ دونوں گا۔ بھٹا نے سر ہٹا کے بڑی خوش اسلوبی سے کہا جیسے سب کام
 ٹھیک ہو گیا ہو۔ اس کے بعد اس نے کہیں کے اندر بیٹھے ہوئے بالو لال کو بلا کر اس کے ہاتھ میں ہاتھ د
 روپے دئے اور کہا "اگلے ساٹھ چار سو ملے ہیں۔ اس میں پچاس میں نے شوٹنگ کے لئے رکھ لئے ہیں
 باقی یہ چار سو روپے تم لوگوں میں بانٹ دو۔"

"انہیں چار سو میں سب کچھ۔ بالو لال نے سختی سے غر ٹکا ہوں سے بھٹا چار سو کی طرف دیکھ کر کہا
 "جی ہاں۔ یہی نہیں بلکہ ایک ہزار کی رسید بھی انہی سے بنے گی۔ لوگیاں تو سب تمہاری بھانجیاں ہیں
 نا؟" بھٹا نے پوچھا "اُن سے زیادہ رقم کی رسید بھی حاصل کر سکو گے؟"

بالو لال نے اپنی جگہ سے جیسا وہ کھڑا تھا۔ بال میں بیٹھی ہوئی لوگوں کی طرف نظر دوڑائی۔ پوچھنے

کے حوا میں سب کو جانتا ہوں :

”رضیہ کس ٹھیک کروں گا : بھٹا چاریہ نے مسکرا کر کہا۔

”تو پھر ٹھیک ہے :“ باولال بولا ”میں لوگوں کو موٹروں میں بٹھاتا ہوں :“

چھڑکیاں تھیں۔ چھڑکتے۔ دو موٹروں میں ٹھونس ٹھانس کے کسی طرح بیٹھ گئے۔ لڑکیوں نے پہلے انہیں کہا : ہاں : ہاں : کی۔ کچھ دھڑکتے سے قہقہے لگائے۔ لیکن ”ہٹو“، ”چھوڑو“، ”مرگ بخت“ کے بعد سب سلسلے سے ٹھکانے پر لگ گئیں۔ بس ایک رضیہ تھی۔ جو سب سے الگ بیٹھی تھی۔ موٹر دائرے سے نکلی۔ خدا داد سڑک پر پہنچی۔ تنگ بریڈ پر پارکر کے شوا جی پارک کی طرف مڑ گئی۔ تو پنجابی لڑکی نے جو جگہ نہ ہونے کی وجہ سے اربھت لال کی آغوش میں بیٹھی تھی۔ اس کے پیٹ میں انگلی چھو کر کہی ”اے بیٹھے۔ تیرے پیٹ میں کتنی ہوا ہے :“

سب لوگ ہنسنے لگے۔ رضیہ جل کے ایک کونے میں سمٹ کر بیٹھ گئی۔ چور گھڑے بابا راس پر گڑا کر پڑتا تھا۔ اور وہ سمٹ کر الگ بولتی تھی۔ بیتال بھائی اس لڑکی کو گود میں لئے ہوئے تھے جو دس برس سے غلاماؤں میں کام کر رہی تھی۔ وہ بیتال بھائی کو خوب اچھی طرح جانتی تھی۔ واقعی اچھی طرح جانتی تھی بیتال بھائی اور دوسرے لوگ بھی دیکھ رہے تھے۔ کہ چور گھڑے کا سادہ کپڑا نہیں رہا ہے۔ گردہ سب ٹھیک غلاموں تھے۔ پھر باندھ کی سمجھ گئی۔ سانا کروڑ کا شیشن گیا۔ جب موٹریں کالینا کی سڑک سے کبھی آگے پہنیں تو رضیہ نے چلو کے کہا۔ اور کونسا ٹھوڈیو ہے : بھگت لال نے چور گھڑے کی طرف چور بھٹا بول سے دیکھا۔ چور گھڑے نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کے کہا : ”ایہ ٹھوڈیو تو کوئی نہیں ہے۔ بہار جیل ہے :“

بہار جیل پر چم کیا کرنے جا رہے ہیں :

”وہ تو ٹرائی ہوئی :“ ایک لڑکی نے جس کے کہا۔

اور اس کی آواز مرد اور عورتوں کے بلند بانگ فہم ہوں میں ڈوب گئی۔

رفیہ نے کہا: گاڑی مدک دو۔

گاڑی چلتی رہی۔

رفیہ نے چلا کے کہا: گاڑی مدک دو۔ نہیں تو میں شور مچاؤں گی۔

بانکڑا نے غصے سے بابولال کی طرف دیکھا جو ایک ہاتھ سے گاڑی چلا رہا تھا، اور دوسرے ہاتھ سے اپنی جیب میں چبھی ہوئی لڑکی کی کمرٹول رہا تھا۔ بابولال نے اپنے شانے ہلا کے بانکڑا سے کہا: "سیٹھ

اسے بٹالایا تھا۔ کہا تھا میں مجھ کو اس سے۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔"

بانکڑا نے بابولال سے کہا: "گاڑی مدک دو بابولال۔ بانی کو جانے دو۔ رفیہ بندی سے دردناک کر

کر اتر گئی۔ گاڑی آگے چل دی۔ ایک لڑکی غصے سے چلا کے بولی۔ بڑی شریف نادانی تھی ہے۔ دوسری

بولی نئی نئی آئی ہے۔ تلو۔ چارچہ ماویں جب جم کے خاتے لگیں گے پھر خد بخود ٹھیک ہو جائیں گی۔ سب

سننے لگے۔ گاڑیوں کی آواز رفیہ سے دُور ہوتی گئی۔ رفیہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ آج میرے گھر

میں پھر کچھ نہیں ہے۔ اسے اپنی بہن کے پانچ بچوں کا خیال آیا۔ تم کیوں مر گئیں میری بہن۔ اُس

مرحوم بہن کو بد دعا دی۔ تم کیوں مر گئے میرے شوہر! اس جوانی میں۔ اس نے اپنے مرحوم شوہر کو بد

دی۔ تم کیوں مر گئے میرے باپ۔ اُس نے اپنے مرحوم باپ کو بد دعا دی۔ اب کہاں سے پتے تھے

کنبد والوں کو ہاں۔ میرے پاس تو اس جسم کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اور نالچ لگی میں نے شوقیہ کی سکول

میں یوں ہی سیکھ لیا تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے۔ یہاں نالچ کا فن بیچنے سے پہلے جسم چھپا ہر گا۔ میرے شوہر ج

باپ۔ میری بہن۔ میرے خدا۔ میرے کنبے والو۔ میرے خاندان والو۔ میری بولی بولی کاٹ کے

کھانے والو تم پر ہمت۔

جب وہ ایک درخت سے لگ کر غروب اپنی طرف سب کو گایاں لے پئی تو پھر اس نے اپنے آنسو روک چھپائے

اُدھر ہاکڑا سیٹھ کی گاڑی میدان میں کیڑا گئی۔ اس کے کچھ عرصے کے بعد لاہور میٹروپولیٹن کی
 جیگرو نیجارت پروڈکشن کے باہر کے ٹکی گاڑی میں سے میٹروپولیٹن کے لئے کے ٹری۔ راج لٹا
 اور شاہ۔ دونوں فلم انڈسٹری کی اہل حد ہے کی سرورس میں بھی جاتی تھیں۔ جو بھی وہ گاڑی سے اُتریں
 تیر خوشبوؤں کے چھوٹے ٹکڑے ایرانی دستروں تک اُٹتے گئے اور راہ چلتے لوگ جو مسنون پرانی
 ڈبل سوئی کی باس۔ بیروں کے پرانے جاکو کی مشین اور دیں پھر گاڑی کی طرح اُٹتی ہوئی دستروں کی ٹیلیو
 کی کمانڈ سے واقف تھے۔ یہ ایک ہزار روپے کے۔ یہ خوش روکدہ عرصے آئی تھی۔ مگر اس سے پیشہ کردہ
 کچھ دیکھ سکتے۔ ریشمی لباسوں میں سرسراہٹ ہوئی۔ یہ تھیں میٹروپولیٹن کے ساتھ نیجارت پروڈکشن کے ان میں
 داخل ہو گئے۔ جہاں جوشی جی کے کہیں میں بہت کم اور بیٹا چارہ۔ وہاں یوں ہائے ہوئے جہازوں کی
 طرح بڑی بے دلی سے تاش کے پتے پھینک رہے تھے کہیں نہیں رہے تھے۔ یہ ایک بڑے تھے جہاز کے ہوتے
 رہیں گئی تھی اور کم کے ہاتھ سے ہزار کاچیک۔ اس نے زندگی کی آس کا ہر چہ چاہے نہ ہو گئی ہو بلکہ ہوس نہ
 کم اور میٹروپولیٹن کے لئے ایک ہی حیثیت رکھتا تھا اسی نے جب میٹروپولیٹن راج کا اور مشاہدہ کئے کے اندر آئی تو کم
 جان بوجھ کے نہیں اُٹا۔ اگر وہ لوگ اس کی بے عزتی کر سکتے ہیں تو وہ بھی اس کی بے عزتی کر سکتے ہیں۔ یہ

روپے والے اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں۔ مگر بٹنا کھڑا ہو گیا۔ میڈم نے کرسی پر سر ہٹا کئے اپنے جام میں غرق اکرم کی طرف دیکھا۔ اور سمجھ گئی کہ کیا ماجرا ہے۔ اس بے چارے کو آج بھی ہزار کا چیک نہیں ملا۔ اس نے اکرم سے بات بھی نہیں کی۔ وہ بھٹاسے مخاطب ہو کے بولی۔

”سیٹھ کہاں گئے ہیں؟“

”شوڈ لو!“ بھٹا چاریہ نے موڈ بانہ لہجے میں کہا۔

”ہاں دو! اس نئے شوڈ لو میں گھسنے ہیں۔ جو بہار جمیل کے کنارے تیار ہو رہا ہے۔“ اکرم نے دسکی کے پیکی ملٹ فربٹ غور سے دیکھ کر کہا: ”ساتھ میں چھ لڑکیاں بھی تھیں۔“

میڈم سب سمجھ گئی۔ مگر اس نے اپنے آپ پر قابو پایا۔ بھٹاسے پوچھنے لگی: ”اور کون کون تھا؟“

بھٹا کا ہنسی ہوئی آواز میں بولا: ”لارہ بگت لال تھے۔ خری چور گھڑے تھے۔ بالورال تھے۔ بجن دت تھے۔“

اکرم نے غصے سے کہا: ”اور اپنے ڈائریکٹر جی کا نام کیوں نہیں لیتے ہو جن کے بغیر بار جمیل کا کوئی پروگرام ممکن نہیں ہو سکتا۔“

میڈم پھر اکرم سے کچھ نہیں بولی۔ اس نے اپنے ہونٹ چبائے اپنے فزاک کو گردن کے قریب سے ٹھیک کیا۔ یہ میڈم کی عادت تھی۔ جب اسے غصہ آتا۔ یا جب وہ کسی گہری سوچ میں ہوتی یا جب کبھی بزنس میں وہ کوئی نیا داؤں کیلئے کو ہوتی وہ اس غصے پلے بالکل بے اختیار ہو کر بالکل غیر شعوری طور پر اپنی گردن کے قریب سے فزاک کو ٹھیک کرتی تھی۔ فزاک میں کوئی نقص ہوتا ہو۔ گردن کے قریب فزاک میں چاہے ایک بل یا ایک چٹ بھی نہ ہو۔ مگر میڈم اپنا فزاک ضرور ٹھیک کرے گی۔ یہ اعلان ہوتا تھا کہ میڈم کو غصہ آیا ہے یا سنبھل کے شیو نیا داؤں آیا ہے۔

مگر میڈم نے اس وقت کچھ نہ کہا۔ اس نے اپنے پتلے باریک سُرخ ہونٹ ایک دوسرے کے نیچے زور سے دبائے اور غصے کو چھٹی ہوئی راج نا اور عشاد کو لے کر اپنی کپین میں علی گئی کیوں کہ

اسے اپنی اگلی دونوں کچھڑوں کے لئے راج لا اور شاد سے فیصلہ کرنا تھا۔ اُن کے اندر چلے جانے کے بعد اکرم نے ایک گھونٹ بہت آہستہ آہستہ سے پیا۔ جیسے شراب کی تلخی ہر قطرے میں سے کشید ہو کے منظر اور مصفا ہو کے اس کی زبان پہ آ رہی ہو۔

واہ واہ! کیا تلخی ہے! میڈم کے موڈ کی طرح اس وقت اس میں کتنا غصہ ہے۔ جیسے یہ وہی اپنے دانتوں سے میری زبان کو کاٹ رہی ہو۔

بھٹا چار یہ چپ تھا وہ ابھی اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھا۔ اس نے اپنے سے بڑوں کے سامنے شراب بھی نہیں پی سکتا تھا۔

اپنے سے بڑوں سے بیمار جھیل پر دو عشرت بھی نہ دے سکتا تھا۔ کوئی کیسی ہی غلط بات کیوں نہ کہہ دے اس کا فرض تھا کہ وہ ہر ایک کی ہاں میں ہاں ملائے اسسٹنٹ کا بھلا اور کام بھی کیا ہوتا ہے۔ یوں کہنے اور کرنے کو تو کام بہت سے ہیں۔ لیکن اگر اسسٹنٹ ڈائریکٹر یہ کام نہیں کر سکتا تو کچر بھو رو کسی کام کا نہیں۔

”بھٹا! اکرم نے اپنی آنکھیں بھٹا چار یہ کی عینک پر جلتے ہوئے کہا
 ”یہ جو سُرخ و سپید عورت اس کہیں کے اندر گئی ہے۔ جس کے بال سنبلے ہیں۔ جس کی دو ٹوٹیاں ہیں
 جو ہمیشہ تنگ فراک پہنتی ہے۔ جس کے ہاتھ میں میرے کی دو انگوٹھیاں چمک رہی ہیں۔ یہ مساری
 میڈم ہے۔“

بھٹا نے کہا ”میں جانتا ہوں۔“

”تم شک نہیں جانتے۔ کچر نہیں جانتے۔“ اکرم نے اسکا ریں نید سے سر جھک کے کہا ”یہ بیماری میڈم
 ہے۔ اس کا نام میں نہیں جانتا۔ مگر برسوں سے لوگ اسے میڈم کہتے ہیں۔ اس نے ہم بھی اگر اسے میڈم
 کہیں تو کیا ہرج ہے۔ یہ میڈم جو ہے نا۔ اصل میں اس فلم کہنی کی یہی مالک ہے۔ اس دفتر کی

ہو پرائیڈ ہے۔ اس کی باگھی خوب مسورتی پر نہ بلاؤ۔ اوپر سے یہ جتنی نرم دکھائی دیتی ہے۔ اندر سے اتنی ہی سخت ہے۔ اس نے سپر سوتیوں کے سے واسوں کی چٹکتی ہوئی سکراہٹ میرے کی کئی کی مسرت سجت ہے۔ اس سکراہٹ کو آج تک کوئی نہیں کاٹ سکا بڑے بڑے بلند بانگ لہجے والے جالاک پنجابی۔ سنہی مگر نوجو۔ گراتی پاکٹ مار اور مارواڑی غانوں غپ آئے مگر غور و کٹ کر چلے گئے۔ دراصل اس سکراہٹ میں میڈم کا کوئی تصور نہیں کبھی یہ سکراہٹ برقی منسوب تھی۔ نرم تھی۔ بھولی بھالی تھی کبھی اس میں پھول کی پتیوں کی سی نرمی اور بیار کی کونپلوں کی سی ناز کی تھی مگر آہستہ آہستہ یہ سکراہٹ سخت ہوتی گئی جس میں مزید بڑے ان باپ مرگے پھر اس کے چلانے آئے دھر کے پڑا۔ اس کی سکراہٹ نے اوپر سے نرم رہنا اور اندر سے سخت ہو جانا سیکھ لیا۔ اور جس روز اس کے چلانے سے جھجھکے ہوئے ہیں ایک سکڑا کر آواز آئے ہاتھ فروخت کر دیا اس روز اس کی سکراہٹ کے اوپر آنسوؤں کے لہرے پڑ گئے لیکن اندر سے یہ سکراہٹ بوجے کی طرح سخت ہوتی گئی۔ پھر جب وہ سکڑا کر آواز دوسری کی عیاشی میں اس سے اپنی رقم وصول کر چکا تو اس نے اسے بچی کے ایکٹے ہانکے پاس آٹھ سو سی فروخت کر دیا۔ تو۔۔۔ تو اس سکراہٹ میں میرے کی کئی آگئی جتنے پر بھنا:

تجی! بٹھا بڑی نرمی سے اور آہستہ سے بولا: "کون کبھی میں میڈم نہ سن لے؟"

"اب اس سکراہٹ کو کوئی نہیں کاٹ سکتا۔" اکرم نے اپنے دونوں ہاتھوں سے انکار میں مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق کی طرف جھٹکا کر کہا: "اپنی چھوٹی سی زندگی میں میڈم نے نہ کر نہیں سکا اگر مٹا سیکو نیلے۔ اسے جلد معلوم ہو گیا۔ کبھی میں نرم دل خوردقوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے خصوصاً ایسی خوردقوں کے لئے جن کا کوئی ٹکڑہ نہ ہو۔ میڈم کا کوئی ٹکڑہ نہیں ہے۔" اکرم نے نور نور سے چلا کر کہا: "تم کیا جتنے ہو بٹھا۔ مگر کیا کائنات سے ہوتا ہے۔ کروں سے۔ نیلی فون سے۔ ریلو گرام اور ریلو گرام سے ہوتا ہے۔ مگر کیا غلوں، گبنوں، روشنی کے شعروں اور مٹی کی پلیٹوں سے ہوتا ہے۔ یہ سب چیزیں آپ

کو ایک ہی بازو میں لے سکتی ہیں۔ مگر گھر اور بازو میں فرق ہے بھائی !

بھانسنے کہا - آہستہ ہوئے۔ میڈم کہیں سن لیں گی :-

”شس لے۔ میں اسے سنا تا چاہتا ہوں۔ ساری دنیا کو بتانا چاہتا ہوں۔ کہ میڈم کا کوئی گھر نہیں ہے۔ کیونکہ اس نے کبھی کوئی گھر نہیں بنایا۔ کیونکہ گھر بنانے کا حق اُس سے شروع میں ہی سے چھین دیا گیا تھا اب رو کیا کرے۔ میڈم۔ میڈم بڑی چالاک ہے۔ اس نے سوچا اگر وہ ایک گھر نہیں بنا سکتی تو ایک آفس تو بنا سکتی ہے۔ اُس نے سوچا۔ کیا ہوا۔ اگر اس کے پاس روپیہ نہیں ہے۔ اس کی پاس پیسے جیسے تخت۔ لیکن تاپاں اور درخشاں سکراہٹ تو ہے۔ پیسے کی کئی تو فراد کو بھی کاٹ سکتی ہے دماغ کا دل کیا چیز ہے۔ اس نے تو میڈم نے اس قسم کو ایک تہیاد کی طرح استعمال کر کے دھیرے دھیرے اُس کے بڑھتا شروع کیا۔ آں۔ مگر اس کا دعویٰ انکو۔ شروع شروع میں اُسے اکامیاں بھی ہوئیں اُس کے بڑھنا کوئی غلامی کا کھیل نہیں ہے۔ مگر میڈم نے سب کو کاٹ کے پینک دیا۔ اور آخر میں بیٹھ باکڑیا سے محبت کرنے میں کامیاب ہو گئی :-

”محبت کرانا کیا ہوتا ہے۔“ بقا کو فرادوں چپی محسوس ہوئی کیوں کہ اُسے اپنی رضیہ یاد آ رہی تھی۔

اکرم خود ہنسا۔ بولا :- ”ہنسو نہیں۔ محبت کرانے پر ہنسو نہیں۔ اس میں کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ آدمی مگر خود کسی سے محبت نہ کرے۔ بلکہ اپنی چالاکاکی سے اپنے سے محبت کرنے پر مجبور کرے تو اسے محبت کرانا نہیں تو اور کیا کہیں گے۔ بیٹھ باکڑیا کا خیال تھا کہ انہوں نے خود میڈم سے محبت کی ہے۔ حالانکہ یہ سنا جاتی تھی کہ کس جنم سے اس نے باکڑیا سے محبت کرائی تھی۔ اس پورے معاملے میں وہ بالکل ٹھنڈی رہی۔ اور ہرے آگ۔۔۔۔۔ اندر سے ہرقت۔۔۔۔۔ ایک روز بیٹھ باکڑیا نے گھسنے ٹیک ڈنٹے اور پیر نظر کھینی :-

”اور آخر تین سٹوڈنٹ۔ کالینا کا مکان۔ بہت بڑا باغ۔ باغ سے پرے جے شلچہ لکھنوں میں لے لی۔ رسیں سب میڈم کے جھٹے میں لٹی۔ اور وہ جہاں ہوں کی رہنے والی تھی اور شلوار اور قمیض پہنتی تھی اب موجد رنگ

پہننے لگی اور وقت بے وقت انگریزی بولنے پر اصرار کرنے لگی۔

”دیکھو بٹا۔ میڈم سے سنی سیکھو۔ میڈم خود اس قدر خوبصورت ہے کہ چاہے تواج میری بن سکتی ہے مگر میڈم کو میری بننے کا شوق نہیں ہے۔ اُسے مرث، وہیہ اکٹھا کرنے کا شوق ہے۔ اپنی چوٹی سی عمر ہی بیٹھ۔ لاکھوں روپیہ اکٹھا کر لیا ہے۔ روپے کے معاملے میں میڈم بہت محتاط ہے اور کیوں نہ ہو وہ میری طرح چند ہیں۔ جس نے دس لاکھ روپے بے کار ملک اور عوام کی خدمت کرنے والی تصویروں میں گھڑ دیا۔ کون جانتا ہے ملک اور قوم کی خدمت کرنے والی تصویروں کو دیکھنا، محنت ہے میری عقل پر میڈم بہت بھروسہ دار ہے۔ اور کیوں نہ ہو۔ زندگی نے خود مجھے مار کر اُسے بھجا دیا ہے۔ وہ وقت وہ کیسے بھول سکتی ہے۔ جب اُسے ایک بار اور دو بار نہیں بلکہ سہ بار اور چار بار روپوں کے عوض بھجا گیا۔ پھر وہ چیز جو اس کی شخصیت سے اس کی ذات سے اُس کے فن سے۔ اس کی عصمت سے اس کے باپ اور خاندان والوں کے پیار سے اُس کے پہلے اور آخری معاشقے سے زیادہ قیمتی ہو۔ وہ کیوں لئے حرز جاں نہ لے۔ وہ کیوں اس روپے کی ایک ایک پائی کو اپنے سینے سے نہ لگا کر رکھے۔ میڈم کی نفی دراصل ایک طرح اس کی مداخلت ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ وہ دن واپس آئیں جب کوئی اُسے ترازو میں تول لے۔ جیسے وہ پروڈیوسر اور فنانسر لوگ آج بے ترازو میں تول لے ہیں۔ ناکام بچروں کا ڈاکٹر کہہ رہا ہے کہ وہ نہیں چاہتی کہ اب پھر کوئی اس کی طوت اس منگاہ سے دیکھے جیسے قصاب کسی بھی موٹی تازی بکری کی کٹڑ دیکھ کے اندازہ لگاتا ہے کہ اس میں سے کتنا گوشت بچھے گا جیسے یہ لوگ میری طوت دیکھ کے اندازہ لگاتے ہیں کہ اب اس کی عقل کی تہی پر کتنا گوشت باقی رہ گیا ہے۔ اور کیا اب یہ کامیاب بکری اسکے کا نہیں اس لئے تواج بالکل لے جی جی کو چیک دے دیا۔ اس لئے تو میڈم اب خود اندازے لگاتی ہے۔ خود تولی ہے۔ اور پھر طری امتیاط سے چیک لکھتی ہے۔ جیسی تو لوگ کہتے ہیں کہ میڈم کی نگاہوں میں اس کے جسم میں میرے ہی کتنی کی کاٹھ ہے۔ اور کوئی اُسے دھکیلا نہیں دے سکتا۔ اور کوئی اس کے

جذبات سے نہیں کھیل سکتا۔ گراس میں بھی میڈم کا کوئی تصور نہیں۔ "اکرم ذرا جگ گیا۔ اوپر دیکھنے لگا ایک لمحے کے لئے اس کی آنکھیں خوابیدہ سی ہو گئیں۔ ایک لمحے کے لئے اس کے چہرے پر ایک عجیب نرئی سی آگئی۔ اور وہ دھیرے دھیرے کہنے لگا۔۔۔ "بھئی میڈم کے پاس بھی خواب تھے۔ خوابوں میں کتنے ملکہ بھلی تھے۔ ترم دجیا کی طرح مٹنے والے جذبات تھے۔ مگر زندگی نے آہستہ آہستہ پیٹ پیٹ کر اس کے سارے جذبات کا پانی نکال دیا۔ اب میڈم کی روح ایک کلائے ہوئے چڑے کا ٹکڑا ہے جس کے اندہ پانی کی ایک بوند بھی نہیں کہیں سے بگ، دواؤ، آنسوؤں کا ایک قطروہ نہ ٹپکے گا۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے۔ بھٹا۔ کہ ایک عورت۔ ایک خوب صورت عورت کی آنکھ کا پانی مرجائے!۔۔۔۔۔ مگر کس کے لئے ٹپک رہی ہے؟ ہمارے کچھ بچے دلوں کے لئے تو نہیں ہے؟"

میڈم نے بیکام انداز کے کہا "کیا بات ہو رہی ہے؟"

"آپ کے کردار پر اس بے چارے کو کچھ دے رہا تھا میڈم! اکرم نے دسکی کا آخری قطروہ اپنے حلق میں اُتار کے نکال دیا۔"

"اور سوجے؟" میڈم بغیر کسی قسم کے ہولی۔

"نہیں۔ اکرم نے فیصلہ کن لمحے میں کہا۔

میڈم نے بھٹا سے کہا "انہیں مگر چھوڑ آؤ میری جگہ لے جاؤ۔" اور آپ؟" بھٹا پارہے پر چھا۔

"میں ششاد کی نلکن میں چلی جاؤں گی۔"

اکرم نے کہا "یہ کہیں نہیں جائیں گی۔ رات بھر یہیں بیٹھ کر کرا دیں گی۔ جب تک اُن کے سینٹر نہیں آتے۔

.... ڈم فو.... ڈم فو.... بہت عمدہ نام ہے۔ میڈم.... جوشی جی کے کچر کا نام ہے۔ اب میں بھی

ایسی ہی کچر بنائوں گا؟

"حرام زادہ، حرام زادہ۔ کیسا نام رہے گا یہ میڈم....؟"

نیلیم نے بھٹا کر اشارہ کیا۔ بھٹا اکرم کو دونوں کندھوں سے پکڑ کے کہیں کے باہر لے گیا۔
 باہر جاتے جاتے اکرم اپنی آنکھوں پر گنتے گنتے کہنے لگا۔ باکڑیا۔ باکڑیا۔ باکڑیا۔ باکڑیا۔ جھاکڑیا۔ آنکڑ
 کما پڑیا۔ سالا کیسا نام ہے؟ دنیا کی کسی زبان میں اس کا قافیہ نہیں ملتا !

میڈم اس لئے باہر نہیں آئی تھی کہ وہ اکرم کا تجزیہ سننے کے لئے بے قرار تھی یا لےکرم سے کسی طرح کی جھڑپ تھی۔ دراصل اپنے کہیں کے اندر وہ جو معاملہ ان دو ہیروئنوں سے طے کر رہی تھی۔ اس میں ایک اڑچن آپڑی تھی۔ وہ دونوں ہیروئنیں اس کی اگلی پچھ میں کام کر رہی تھیں وہ جانتی تو دونوں کو الگ بلالکے معاملہ کر سکتی تھی۔ مگر چونکہ دونوں کا کام ایک ہی تصویر میں تھا۔ اکٹھا تھا۔ اور وہ دونوں سہیلیاں تھیں۔ اول درجے میں شمار ہوتی تھیں۔ اس لئے یہ ممکن نہ تھا کہ معاملے کی رقم ایک دوسرے سے چھپی رہیں۔ اگر وہ ایک کو زیادہ اور دوسرے کو کم پورا مافی کر لیتی۔ تو ایک نہ ایک دن یہ مجیدہ نکل جاتا۔ اور پھر کم رقم لینے والی ہیروئن پچھ کے بیچ ہی میں وہ فساد شروع کرتی.... نہیں.... نہیں.... میڈم نے کچھ سوچ کے ہی دونوں کو اکٹھے بلالکے دونوں سے ایک ہی وقت میں فیصلہ کرنے کا اقدام کیا تھا۔ اب نصیب یہ آچڑی تھی کہ دونوں ہیروئنیں پچاس پچاس ہزار سے کم لینے پر تیار نہ تھیں۔ اور یہ رقم میڈم کے بجٹ میں نہ آتی تھی۔ اس لئے میڈم اٹھ کے اپنی کہیں سے جوشی بی کے کہیں میں آگئی تھی۔

اکرم کے جانے کے بعد ہی میڈم کچھ دیر اس خالی کہیں میں کھڑی سوچتی رہی۔ پہلے تو اس کی بھوئیں گھٹنی

ہر ایک دوسرے سے قریب ہو گئے۔ پھر اُٹھ ہو گئے۔ مطلق صاف ہو گیا۔ میڈم مسکرائی اُس نے
گروں کے قریب اپنے ذرا کو ایک جھکا دیا۔ جوشی جی کے میز سے تاش اُٹھائی۔ اور اپنی کہیں میں ہٹ
گئی۔ میڈم نے شکار لایا تھا۔

میڈم نے غور جا کر کاش کے پتے میز پر پھینک رکھا۔ وہیں ایک دو ٹوٹا تاش کا دو بلے
شریکہ تھے کہ اگر میں جیت جاؤں تو تم دونوں کو میری بچہ میں ایک ہر دو دیر بعد پر کام کرنا پڑے گا۔
اور اگر تم دونوں میں سے کوئی جیت جائے۔ تو میں تم دونوں کو ایک ایک بچہ پر سامان چھپا کر
دوسری دونوں کی۔ ملے گا۔

”ملے گا؟ راج نے غصہ کے چلی لے کر کہا۔

”ملے گا؟ غصہ نے بھی کہہ دیا۔

راج نے اُٹھ کر جوشی جی کی بچہ پر ایک سونے سے کم میں دیکھ کر نہیں بناتے۔ بلکہ ایک
سروں میں پچاس میں تو اپنے نہیں لے گی۔ اور اگر نہ ملے۔ تو وہ بزرگ جاتی ہے۔ وہیں
دو شاٹ سے زیادہ نہیں چرکتے۔ اور میڈم نے سچا۔ میری تو تم جو کس خیال میں تھو
کا کہ پچاس دونوں میں ختم کر کے نہ کہ دونوں تو براہ میڈم نہیں۔ پچاس کے پچاس میں لے۔ میڈم نے
تاش سٹی ٹشاور لے کر کیا۔ میڈم نے تو میں ہی پتے ہر ایک کو پھینکے پتے اُٹھاتے وقت راج اُٹھا
نے تین کو چوم لیا۔ شتو جلد میں تینوں کو چومنا بھول گئی تھی اس نے اب دوبارے کہہ کے
مسکرائی اس کے تینوں میں غلام رنج اور مل گئی۔ راج کے تینوں میں وہاں شاور تھے۔ پتے شتو
نے جیسی سدا پتے پتے کھول کے سامنے رکھ دیے۔ پھر راج نے۔

ابھی تک میڈم نے ہا پتے پتے کھولے نہ تھے۔ راج نے دونوں ہاتھوں سے نکلی بکا کے کہا۔ ہار گئیں

میڈم۔ تم ہار گئیں۔ لاؤ کپاس ہزار کا کسٹریکٹ بناؤ۔ میڈم نے درمیں میز پر رکھے ہوئے پتوں کو باری باری سیدھا کیا۔

پہلا جو کر تھا!

دوسرا کیٹہ!!

تیسرا بھی کیٹہ!!!

”ہائے!“ ایک دم راج اور شمشاد دونوں کے منہ سے نکلا۔ حالانکہ ایک صبح بنارس تھی۔ دوسری شام امرکن۔ مگر ہائے دونوں میں تھی۔ ہائے کے بغیر کوئی عورت تختل نہیں ہوتی۔

میڈم نے کہا۔ ”چلو۔ ایک ہزار دوسپہ روز میں۔ ٹھیک ہے؟“

ابھی تک راج اور شمشاد اُداس تھیں۔ دونوں کچھ نہیں بولیں۔ میڈم اپنی جگہ سے اٹھی اپنے پرں کو کھول کر اس نے چابیوں کا گھٹا ہچکا لا۔ چابی لٹکا کر سیف کھولا۔ دو ہزار کے نوٹ بھگلے۔ اور دونوں کو ایک ایک ہزار دسے کے بولی۔

”اچھا ٹھیک ہے؟“

”ہاں ٹھیک ہے۔“ اب کی دونوں نے سر ہلکے کہا۔

اس کے بعد راج بولی شمشاد سے ”چل تاج چلے گی؟“

”چلوں گی؟“

”اور آپ میڈم؟“

”تم جاؤ۔“ میڈم نے کہا۔ میں میڈم کا انتظار کروں گی۔

میڈم کی آواز نہیں لگی سی ٹھکن تھی۔ لگی سی اُداسی۔ جیسے کسی نے ذرا سی راکھ کر دی تھی۔ اور اس کے نیچے ذرا سی چنگاری اور اس کی سُرخ زبان دیکھتی ہوئی، تڑپتی ہوئی دیکھ لی تھی۔

راج نے اپنا پنلا ہونٹ ذرا سانچے دکھایا۔ اور اپنی آنکھوں کو بڑے معصوم انداز میں میڈم سے شمشاد کی طرف گھما کر اپنی آنکھوں کو اس طرح غپایا جیسے وہ اپنے دام سے نہیں اپنی آنکھوں سے سوچ رہا ہو۔ اور یہ واقعی سچ تھا۔ وہ جب بات کرتی تھی تو اس کا چہرہ اس قدر بھولا اور معصوم معلوم ہوتا تھا۔ اور آنکھیاں اس طرح جلدی جلدی حرکت کرتی تھیں۔ جیسے وہ واقعی مرنے اپنی آنکھوں سے سوچنا جانتی ہو۔ اس وقت بھی اس نے یہی حرکت کی۔ آہستہ آہستہ بولی۔ ”میڈم تو . . . اپنے۔ . . شمشاد کا انتظار کریں گی۔ ہم کس کا انتظار کریں؟ چلو ہنسنا آج میں . . .“

راج نے شمشاد کا بازو اپنے بازو میں ڈال لیا۔ اور لیکن میں بیٹھ کر تاج میں چلی گئی۔

”کھانا کھاؤ گی؟ شمشاد نے پوچھا۔

”اوں ہوں؟“ راج نے جواب دیا۔

”شماج دیکھو گی؟“

”اوں ہوں؟“ راج نے جواب دیا۔

”پھر؟“ ————— ”شمشاد نے دھیرے سے رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔

”اوں ہوں؟“ راج نے اسی بلند لہجے میں کہا۔

”پھر؟“ شمشاد نے یہی ان ہو کے پوچھا۔

”پھر ہمارا سر؟“ راج شمشاد کے گلے میں باہیں ڈال کے بولی ”ہائے شمشاد۔ تو کس قدر خوب صورت

ہے۔ جی چاہتا ہے۔ تجھ سے شادی کروں؟“

”شادی کر کے کیا کرے گی؟“ شمشاد نے پوچھا۔

”اسی لئے تو کرتی نہیں؟“

”اتھا بول راجو۔ کیا ہے گی؟“ شمشاد نے پوچھا۔

”ٹما ٹو جوس“

”ٹما ٹو جوس؟“ خشاو نے حیرت سے پوچھا۔ ”تو یہاں ٹما ٹو جوس پینے آئی تھی؟“

”اور کیا؟“ راج نے ایک میرے کو آواز دی۔ اور اس سے ٹما ٹو جوس لانے کو کہا۔ اور جب ہوا دونوں ٹما ٹو جوس پی چکیں تو راج نے۔ دو روپے کے بل کے اور پر سو روپے کا نوٹ رکھ دیا۔ اور جب بیرو اٹھانے دوپٹے کے آیا تو راج نے بڑے بھورے لہجے سے کہا ”KEEP THE CHANGE“ ”بیرو چکر گیا۔ بولا ”حضور..... یہ اٹھانے دوپٹے؟“

”رکھو۔“ راج اُٹھتے ہوئے بولی۔ ”پل ہینا؟“

اور وہ شمشاد کو لے کر تاج سے باہر چلی گئی۔ بیرو حیرت سے راج کی لڑت دیکھتا رہ گیا۔ اسے میں ایک اور بیرو پہلے میرے کے قریب آگے کھڑا ہو گیا۔ ”کیا ہوا؟“ پہلے میرے نے زیر لب سنی ہی بھاگے کہا ”میاؤں میاؤں۔ فیش فیش!“

فکں میں بیو کر شمشاد سوچنے لگی۔ راج بھو پر رعب کا منتھی ہے۔ اس کے پاس تو بچہ کا کڑکٹا ہیں۔ اور میرے پاس آٹھ ہیں۔ میں اس کو دکھا دوں گی۔ میں اگلی دفعہ سارے کے تاج میں آؤں گی اور عزت سو ڈیڑھوں گی۔ اور بیرو کو دو سو روپے بخشش میں دے دوں گی۔ بیرو جب میرے پاس بلے کر آئے گا۔ میں اس پر سو روپے کے دوہرے نوٹ ڈال کے کہوں گی! KEEP THE CHANGE یہ راج کیا اپنے آپ کو مجھ سے بڑی میری دن بھتی ہے۔ اور نہ مکالمے تو ٹھیک سے بول نہیں سکتی فیصلہ دین کو بھگت دین کہہ رہی تھی اس روز شوٹنگ میں۔ اور یہاں تاج میں آگے دن کی بھتی ہے KEEP THE CHANGE شمشاد ماندری اندھے سے کہیں گئی۔

پھر شمشاد نے مسکرا کر اپنا سر راج کے کندھے پر رکھ دیا۔ اور بولی۔ ”ہائے تو کتنی میری کتنی اچھی سہیلی ہے راج۔ تیرے بالوں سے کتنی اچھی خوشبو آ رہی ہے جی چاہتا ہے تیرے کندھے سے لگی لگی

سو جاؤں؟

”سونا اپنے گھر جا کر نہیں تو وہ تیری دادی اماں پتلا لے گی۔ بولے گی۔ جلتے یہ راج میری شہزادیوں کے منڈے کے پاس لے گئی؟“

ششادہ بنی! اُسے منڈے کا قتل عمدہ معلوم ہوا جیسے مضبوط مضبوط باہیں اور دھماکا کو چھڑاتی ہوئی مٹھیں۔ وہی کیا یہ سچ ہے؟ تیری دادی اماں ہر ایک پر دوڑو سرے کہتی ہے۔ میری شہزادی۔ میری شہزادی۔ توجہ سے پیدا ہوئی ہے راج گدگد کی دلی ہے۔ کیا یہ سچ ہے بتا! راج نے پٹ کے شہزاد کو چیلنج کرتے ہوئے بولی۔ جواب میں شہزاد نے راج کے گدگد کی اور دونوں ہیلیاں فاختوں کی طرح ایک دوسرے سے پیار کرنے لگیں۔

امیر علی ڈراموں کے جسم میں ایک عجیب سی جھرجھری سی آئی۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی پر سے جیسے جیسے گزر رہے تھے۔ وہ ایک لمبا ترنگا تنومند چٹان تھا۔ اُسے عورتوں کا یہ پیار پسند نہیں آیا تھا اس نے بڑی شکل سے اپنے جذبات پر قابو پا کے کہا: ”بائی کہہ رہی ہیں؟“

”مگر“ ششادہ نے جواب دیا۔

ششادہ وارڈن روڈ پر رہتی تھی۔ مگر جب وارڈن روڈ کے گھر میں ششادہ نے دادی اماں کے کمرے میں روشنی دیکھی تو راج سے کہنے لگی ”دادی اماں جاگ رہی ہیں۔ ابھی نہیں جاؤں گی؟“

”پھر کہاں جے گی؟“

ششادہ نے امیر علی سے کہا: ”امیر علی لاڈلی بینک گھر وارڈن کی طرف گھمے؟“

ابھی حشر تک کوئی مکان اس کا نہیں تھا کہ کوئی انہیں اپنی دڈ بلا کے انہیں جس میں سٹوارٹ یا الین لاڈ کے ساتھ کام دے سکے۔ اس لئے بادل نا خواستہ ان دونوں نے اپنے اپنے محبوب کی تصویر اپنے ڈسک میں پرکھ لی تھیں یہ بات انہیں تھی کہ ہندوستان میں خوب صورت مردوں کی کمی تھی۔ مگر ہندوستان کی چوٹی اداکارہ اگر ہائی وڈ کے چوٹی کے اداکار سے محبت نہ کرنے تو کس سے کرے۔ ذرا اس سے کم سچہ کے محبت کرنا کچھ گھنیا سا معلوم ہوتا ہے۔

ادب تو ایلن لاڈ کی ایک عرصے سے شہر میں کوئی تصویر بھی نہیں آئی تاج تقریباً دو کر بولی۔ شمشاد نے پھر اک آد بھری۔ یہ آہ۔ جو صاف اور صریحاً کہہ رہی تھی۔ تمہارا الین لاڈ جلے بھاڑ میں مجھے تو اس وقت اپنا پیارا تھی یا دارا ہے۔
 ہرے نے اُس کے چوچا "حضور کیا پسں گی؟"
 راج بولی "اٹھ بہنا۔ یہاں نہیں کوئی بیٹے نہیں دے گا۔ پھر وہ میرے سے مخاطب ہو کے بولی۔
 "ہم اپنا غم پسں گے۔"

بیرہ چران رہ گیا۔ راج کا شمشاد کو لے کے بیڑیوں سے نیچے اتر گئی۔ اُترتے اُترتے اُسے خیال آیا۔ اس نے کتنا عمدہ فقرہ کہا تھا۔ وہ خود ہی اپنے خیال کی غفلت سے مرعوب ہو گئی کتنی بڑی بات ہم اپنا غم پسں گے۔ فلسفے میں ڈوبی ہوئی بات! ہائے میں نے کتنی اچھی بات کہہ دی۔ پھر اسی نے فیصلہ کیا۔ کل جب وہ سنت گمن گمن گھنیشور کے سیٹ پر شوٹنگ کرنے جلے گی۔ تو نشی بھروسہ جزا ناوی کا لڑنوس کو ضرور فقرہ بتائے گی مگر اس سے اصرار کرے گی کہ وہ یہ فقرہ ضرور اس کے کسی ڈائیلاگ میں ڈال دے۔ راج کا ادب اور شاعری کا بہت اعلیٰ ذوق رکھتی تھی۔ چنانچہ اس نے نشی بھاگیرام بھروسہ کے سامنے نادل اور ہنزاؤ گھنوی کے سارے دیوان پڑھ ڈالنے تھے اب جب کہ دوسری بیرونیس بڑی شکل سے مرعہ کھانے کا مینو پڑھ سکتی تھیں۔

روٹے ہوئے ششاد نے بڑے اُداس لہجے میں کہا: راج! نہاری بھی کوئی زندگی ہے یوں
 دیکھو تو سب کچھ ہے۔ غلیٹ، گاڑی، شہرت، دولت، مگر یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے جتنی کے بغیر
 سب سونا مسطر ہوتا ہے۔

”نکتہ یہ ہے تو اُراج آہستہ سے بولی: اسے میرا لاؤ.....“
 ششاد کچھ دیر خاموش رہی، کچھ دیر گاڑی خاموشی سے دارڈون روڈ کی طرف متنی رہی۔ پھر ایک نڈکی
 آہ بھر کے ششاد نے کہا۔

”راج! مجھے وہ مانی بلا شاعر۔ کیا نام ہے.... کم ذات کی غزل سنا دے“
 ”کم ذات نہیں ہزار“

”ہاں ہاں ہزار کی غزل ہی سنا دے۔ بہنا ابھی بہت اُداس ہے“

ششاد کو دارڈون روڈ پر چھوڑ کر راج اس کی ٹکن لے کر اپنے جگے کو چلی گئی جو باندھ میں
 تھا۔ پالی پل پر۔ پالی پل کی طرف ٹرتے ٹرتے میرٹلی ڈھلایو رنے سوچا۔ میں اسے پالی پل، کیوں
 لے جاؤں، اسے باندھ کے ساحل پر کیوں نہ لے جاؤں۔ اس وقت دہاں باندھ کے ساحل پر کوئی
 نہ ہوکا۔

پھر اس نے سوچا۔ اگر اُسے تین سال کی جیل ہوگئی۔ تو اس کی بیوی تربیدہ اور اس کا چار سال کا بچہ
 شہباز کیا کرے گا۔ میں ٹکن ہے۔ اس کے جیل کے دفوں میں کوئی اس کی بیوی کو باندھ کے ساحل
 پر لے جائے۔ غری میں کیا کچھ ٹکن نہیں ہے۔

”مگر اس وقت موقع اچھا ہے۔“ امیر علی عثمان نے امیر علی ڈھلایو ر سے کہا۔

”ہاں مگر اس موقع کو حاصل کر لینے کے بعد زندگی بھر کوئی بھے ڈرائیو نہیں رکھے گا۔“
ایمر علی ڈرائیور نے ایمر علی پٹھان سے کہا۔

”خو...“ پٹھان امرار کرنے لگا۔

”چپ رہو، ڈرائیور نے بڑی سختی سے کہا۔ اور پھر کچھ گاڑی کا سٹرخ پالی بل کی طرف موڑ دیا۔

راج کو پتہ نہیں چل سکا کہ ایمر علی نے اپنے دل میں کیا باتیں کیں۔ کیونکہ وہ اپنے دل کی باتوں میں مصروف تھی۔ لسنے میں اس کا جھگڑا گیا۔ جیوں ہی گاڑی پورے میں رُکی ایک ٹبلے پتے سوکھے گھاٹے آدمی نے آگے بڑھ کے گاڑی کا دروازہ جلدی سے کھول کے راج کی طرف مشتبہ سمجھا ہوں سے دیکھا۔ جیسے وہ نکالیں کہہ رہی ہوں؟ کہاں گئی تھیں؟

یہ راج کا خاوند مشطر تھا۔ راج اس وقت تک چپ رہی جب تک ایمر علی گاڑی کو جھگے سے باہر نکال کے نہیں لے گیا۔ اس کے بعد وہ اپنے خاوند کی طرف مڑی اور گرج کے بولی ”جہنم میں گئی تھی؟“
اُس کا خاوند گہرا کے چھپے بٹ گیا۔ ”میں نے تو کچھ نہیں کہا راج!“

راج اس کی بات کا جواب دے بغیر آگے بڑھ گئی۔ آگے برآمدے میں اُس کے چچا کھڑے تھے جو ڈیڑھ دو پاہر ہلکا سا سر پہ دوٹی۔ چہرے پر جھڑیاں۔ آنکھوں میں وہی مشہور اور عجیب ڈر سا....
راج نے ڈپٹ کے پوچھا۔ ”آپ ابھی تک سوئے نہیں؟“

”تھرا انتظار کر رہا تھا!“

راج نے بڑی سختی سے کہا۔ ”میں نے کب کہا ہے میرا انتظار کیجئے۔ میرا انتظار کسی نہ کیجئے گا۔ دس صف کہہ چکی ہوں۔ کوئی بھی نہیں ہوں۔ اپنا بُرا بھلا خوب سمجھتی ہوں۔ خبردار جو آئندہ سے کسی نے میرا انتظار کیا۔ راج اِدھر اُدھر دیکھ کر گرجی۔ مگر وہاں برآمدے میں چچا کے سوا کوئی نہ تھا خاوند چپکے سے کھن پیٹ کے گراج میں چلا گیا۔ کیونکہ وہ گاڑی چلاتا تھا۔ اور باہر دنیا میں اُسے صرف ڈرائیور ہی کہا جاتا

تھا۔ یہ بہت کم لوگ جانتے تھے کہ وہ راج کا خاوند تھا۔

راج چاکو دیں برآمدے میں ٹھہر چھوڑ کر اندر ہال میں چلی گئی۔ ہال میں اس کا بھائی، اجمینو بنگ پٹے
 مٹھیاں بیٹھنے بیٹھا تھا اس نے آتے ہی راج کو بائیں سے بچوایا ”کہاں گئی تھی سالی“
 راج نے اس کے منہ پر زور کا ایک طمانچہ جڑوایا۔

بھائی نے ایک گھونسا مارا۔ راج رونے لگی۔ مگر روتے روتے لڑائی بھی گئی۔ اس نے ناخنوں سے اپنے
 بھائی کا چہرہ جگ جگ سے ہولناک کر دیا۔ چلا چلا کر کہنے لگی۔ ”سور کا بھڑا“
 ”صدا کی بجی؟“ اجمینو غصے میں غرائے ”سالی روز رات کو میرے آتی ہے یہ مگر ہے کر ٹی کا کوٹھا ہے“
 ”مرا نام ہے یہی کا کھلتے ہو۔“ اُس پر سے اکڑتے ہوئے راج اس کے ایک طمانچہ مار کے بولی۔

اجمینو کو طیش آیا۔ اس نے راج کے اتنے زور سے ہاتھوں کو کپڑے گھسیٹا کہ راج صوفے
 سے نیچے فرش کے خالیچے پر گر پڑی۔ اور تپائی پر رکھا ہوا اگلا ان گزر کر ٹوٹ گیا۔

اتنے میں چچا دامود۔ اجمینو کی بیوی گوری اور چچی گیشی اور موسیٰ ٹھاری اور موسیٰ کی بیٹی رام پیادی اور اس کا
 خاوند اجیت سنگھ اور دس بارہ لڑکے لڑکیاں۔ جاتے کہاں کہاں بیٹھنے کے کوئے کوئلے سے بھل کر ہال یا
 جمع ہو گئے۔ اور ایک ہی وقت میں ایک دوسرے پر زور سے چپٹے چٹکھانے اور رونے پٹنے لگے۔

اُس پاس کے بھگلوں کی روشنیاں جو گل ہو چکی تھیں۔ باری باری سے پھر چمکنے لگیں۔ ساتھ
 والے بھٹے کے انجینیر کمال داس نے اپنی بیوی سے کہا ”ارے دی روز کا شتاب ہے۔ وہی راج دیر سے
 آئی ہے۔ تھوڑی دیر تک اُٹل خیال رہے گا۔ پھر سب سو جائیں گے۔۔۔۔۔ چلو اندر۔۔۔۔۔ کمال داس
 نے اپنی بیوی کی کمر پر ہاتھ رکھا ”ابھی ان کی شادی جوئے تین ماہ بھی نہ ہوئے تھے مگر۔۔۔۔۔“

بیوی تلو کے بولی ”نہیں میں تو ذرا یہ جھگڑا سنوں گی“

”روز خوشی ہو۔ کمال داس نے جہائی لے کر کہا“ اس میں کیا رکھا ہے جاہل بد تہذیب غلی غلط ہے۔۔۔۔۔“

”تم کیا جانو۔ ہر روز کوئی ذکر کوئی نئی بات ہوتی ہے۔ کمال داس کی بیوی بولی ”تم کیا جانو عورتوں کی باتیں۔ تم جلد کے سوراخوں میں ابھی آتی ہوں۔“

کمال داس کو خوب معلوم تھا کہ ابھی آتی ہوں کا مطلب ایک گھنٹے سے ہے۔ اس نے کسی نہ کسی طرح صبر کرتے ہوئے کہا : ”اچھا ایک پیار تو دے دو۔“

”نو“ کمال داس کی بیوی نے پیچھے سے دونوں ہونٹ جلدی سے اُس کے آگے کر دیئے۔ بڑی بے دلی سے۔۔۔

کمال داس کو بوسہ دیتے ہوئے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے وہ بوسہ نہیں لے رہا۔ ریلی زمین میں پھاڑا چلا رہا ہے۔ وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ اور اپنے کمرے میں رنجیدہ ہو کے چلا گیا۔ چلتے چلتے اُس نے اپنے آپ سے کہا۔ ہوں، سالی کا دل اس وقت جھگڑے میں ہے۔

کمال داس نے ٹیکہ ہی کہا تھا۔ کوئی گھنٹہ بھر میں جھگڑا رفع دفع ہوا۔ آہستہ آہستہ چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ اب صرف راج کے کمرے میں روشنی تھی۔۔

اب راج اور بیٹیا میں صلح ہو گئی تھی۔ راج اپنے بھائی کے چہرے پر جہاں جہاں ناخون کے نشان تھے کیم لگا رہی تھی اور سسکیاں لے لے کے کہہ رہی تھی ”بیٹیا تم بھنگ کیوں پیتے ہو؟“

”تو کیا کروں۔ راجو۔ تم دوسری کے پیسے جو نہیں دیتی ہو۔“

”کیسے دوں؟ تم خود ہی گھر کی حالت تو دیکھتے ہو۔ بیٹیا جی۔ جو رشتے دار ہے۔ جو بے کار گاؤں والا ہے جس موٹے سے کبھی بچپن کی ایک دن کی جان پہچان تھی۔ وہ سید حایا باں باندھے میں راج کے بنگلے پر ملا رہا ہے۔ لگ بھگ کوئی پچاس آدمیوں کا کھانا صبح و شام تیار ہوتا ہے۔“

اور یہ بات باطل صحیح تھی۔ مگر اس میں راج کا خود اپنا قصور تھا۔ جب اس کے اچھے دن آئے

اور اس کا شمار ہندوستان کی گہنی چنی اداکاروں میں ہونے لگا۔ اور سب سے پچاس پچاس ہزار کے کاغذ ملنے لگے۔ تو اس نے بھی اپنا خرچ بے تحاشا بڑھا لیا، محلایاں، مکان، غیٹ، کپڑے، کتے تو تھے ہی۔ اب اس نے ایک ایک کر کے اپنے سب رشتہ داروں کو اپنے پاس بلانا شروع کیا پہلے چھاپائے پھر اس کا خاندان۔ پھر پھر پچھائے۔ پھر ان کا خاندان۔ پھر بہت سے بے کار لوگ۔ مگر وہ پار کے رشتے دار بھی بنا بلائے چل پڑے۔ راج کو اپنے بھٹکے کے ساتھ ایک اور جگہ کرانے پر بے کراں سب لوگوں کو دھمکا پڑا۔ ان کے علاوہ اس کا اپنا خاوند تھا۔ جو پہلے کچھ نہیں کہتا تھا۔ مگر زندہ تو تھا۔ اور ہر روز لافیا کا انگلشمن لیتا تھا۔ پھر اس کے چچا تھے۔ جو اپنی بیوی کے علاوہ ایک رشتی رکھے ہوئے تھے اس کا خرچ پانی بھی راج کو دینا پڑتا تھا۔ ابھینو بھنگ پیتا تھا۔ اور شر کہتا تھا شر تو نہیں کہتا تھا۔ لیکن اُردو کے سائے دیوان اُس کے پاس تھے۔ اُن میں سے شعر چڑھا کر کے غلم کے رساوں کو بھیجتا تھا اور وہ لوگ اس نے چھاپتے تھے کہ وہ راج کا بھائی تھا۔ کبھی کبھی اس کے سہارے راج کا یا تو تو راج کا کوئی اعز دیوان رسالے والوں کو مل جاتا تھا کبھی کبھی کوئی چٹھی خزانے دار خیر۔ کیوں کہ جب راج اور بھینا کی زور کی لڑائی ہوتی۔ تو راج کئی کئی روز اپنے بھائی کو سہ نہیں لگاتی اور اسے پیسے نہیں دیتی تھی۔ ان دنوں ابھینو بے چارہ کیا کرے بھنگ کیسے پئے۔ اپنی بیوی کوں کا خرچ کیسے پورا کرے۔ چنانچہ وہ ان دنوں اپنی بہن کے معاشقوں کے حالات رسالے والوں کو ہونے پونے میں بیچ دیتا کئی بار ایسا ہی ہوا کہ راج سے لڑائی ہو گئی۔ مگر کوئی معاشقہ نہیں ملا اور بھنگ کی ٹوٹ ہو رہی ہے اس نے ابھینو کو ایسے موقعوں کے لئے نئے معاشقے بھی خود ہی گھڑنے پڑتے تھے۔ گروادہ ایک خلاق فن کار بھی تھا مگر اس وقت ابھینو اور راج کی صلہ ہو گئی تھی۔ وہ اُسے بھینا کہہ رہی تھی اور وہ اُسے راج کہہ رہا تھا۔ اور دونوں بہن بھائی ایک ہی صوفے پر بیٹھ کر ایک دوسرے سے گلے ل رہے تھے۔

راج نے جیسے پیار سے کہا "میں آج اپنے بھینا کو دھکیلاؤں گا۔"

یہ کہہ کر راج صوفے سے اٹھی اور اس نے امدادی کھول کر دیکھنے کی باتیں نکالی۔ تپائی پر دو مگلاس رکھے
 رفریجیٹر سے سوڈے کی بوتلیں لائی پھر وہ دونوں دیکھنے لگے۔

”دو پیگ پینے کے بعد ابھینو نے کہا : ”راجو تم سب کو کھانا دو۔ ان سب رشتے داروں کو :
 ”ہاں بیٹا تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں کل ہی ان سب کو چمکا کر دوں گی :
 ”صرف ہم اور تم رہیں گے :“

”ہاں بیٹا صرف ہم اور تم“

دو پیگ اور پینے کے بعد ابھینو نے کہا : ”راجو۔ تم مشنر کو بھی کھانا دو :
 ”میشنر تو میرا شوہر ہے :“ راج بولی۔

”تو کیا ہوا۔ ابھینو بڑے غصے میں بولا : ”سالا۔ بالکل تمہارے لائق نہیں ہے۔ سوکھا پٹرا۔ دھکا۔ تمہارے
 ماں باپ نے اس سے تمہاری شادی کر کے تم سے بڑا غم کیا ہے۔ میں تمہارا بھائی ہوں میں تم سے انصاف
 کروں گا۔ تم شانتا رام سے شادی کر لو :“

”مگر شانتا رام تو شادی شدہ ہے :“

”اچھا تو محبوب سے کر لو :“

”وہ بھی شادی شدہ ہے :“

”اچھا تو کاردار سے کر لو :“

”وہ بھی شادی شدہ ہے :“ راج بولی۔

یہاں آ کے ابھینو کا داغ ٹوک گیا۔ اور دو پیگ پینے کے بعد اس نے سب سوج کے کہا : ”اچھا تو مجھ
 سے شادی کر لو :“

”مگر تم تو مجھے بھائی ہو :“ راج بولی۔

”ہاں ٹیک ہے“ بتیانے سر ہلا کے کہا: ”اچھا تو پھر مجھے اردو کی دودھ“

پیشتر اس کے کہ راج اس کے گھاس میں اردو کی انڈیا لیتی۔ ابھینو نے آنکھیں بند کر لیں۔ اللہ صوفے پر اوندھا ہوا کرتا لے لینے لگا۔ راج نے اسے ٹانگے سے گھسیٹ کر فرش کے غائبے پر سلا دیا۔ پھر اس نے نذر سے گھنٹی بجائی۔ باہر پھر روشنی ہوئی۔ ایک لڑکھڑایا۔ راج نے ابھینو کی ہنسی اشارہ کیا۔ وہ قہقہے لے لے ہوئے ابھینو کو اپنے بازو میں اٹھا کے لے گیا۔ راج نے چٹنی چڑھادی اور جتنی گل کر کے مسہری پر لٹ گئی۔

راج نے کروٹ لے کے مسہری کے قریب تپائی پر رکھی ہوئی ایلن لٹو کی تصویر کی طرف دیکھا۔ جو ریٹیم کے فریم میں جڑی ہوئی اندھیرے میں بھی جگ جگ کر رہی تھی۔ ریٹیم راج کی طرح

”ڈارلنگ۔۔۔ راج لٹو کی طرف دیکھ کر دھیرے سے مسکرائی، اللہ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔“

رئیس گنج کا عشرت بہت خوب صورت تھا۔ اس کی خوب صورتی میں اس کی تخلیق میں اس کی افزائش میں۔ اُسے عشرت کی ذات میں پختہ کر لے جس عشرت کے لب باپ کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ اور انہوں نے عشرت کو ایک جیبہ پر وقار خوب صورت تعلیم یافتہ، متحرک فوجیوں بنانے میں بے دریغ دیا۔ فوج کیا۔ کوئی تاج محل بناتا ہے، کوئی عشرت بناتا ہے۔ خوب صورتی کی تخلیق کا بندہ ہر انسان کے دل میں ہوتا ہے۔

ہر باپ اپنے بیٹے کے آئینے میں اپنی صورت دیکھتا ہے۔ عشرت کے والدین کا رشتہ بیچ تھے۔ اس نے عشرت کو کم از کم اپنی کورٹ کا جج تو بنانا چاہئے تھا۔ اس نے وہ چاہتے تھے کہ عشرت بی، اے کے بعد لاکالچ میں داخل ہو جائے۔ اس کے بعد وہ اپنے اثر اور رسوخ سے آہستہ آہستہ ایک نئی — ایک طرز کو بھی نہیں آیا۔ اور عشرت کے والدین حسرت کو اپنے دل میں لے گئے۔ انسان آئینہ سار کیوں ہوتا ہے۔ وہ انسان مگر کیوں نہیں ہوتا۔ وہ اپنے بیٹے کی شبیہ میں ماضی کا عکس کیوں دیکھتا ہے مستقبل کی قدر کیوں نہیں دیکھتا ہے؟

عشرت کے باپ نے کالج کی سطح پر جو عکس دیکھتے تھے وہ ان خواہوں سے بہت مختلف تھے جو

عشرت کے دل و دماغ پر چھاپے تھے۔ ہر شخص کا دل۔ اس کا اپنا دل ایک ذاتی آئینہ ہوتا ہے جس میں کوئی دوسرا اپنی تصویر نہیں دیکھ سکتا۔ بہت سے باپ ہی نقلی کر جاتے ہیں اور پھر ساری زندگی لمبے بگھٹتے رہتے ہیں۔ عشرت کے باپ اور ان کے مرنے کے بعد اس کی ماں اگر عشرت کے دل کے آئینے میں بھانک سکتی تو دھمک سے رہ جاتی۔ کیونکہ اس آئینے میں ان خوابوں کی تصویر موجود نہ تھی جنہوں نے اپنی زندگی رنگ برنگی کیفیوں سے اُن کے خاندان کو بھرا رکھا تھا۔ بات بھی ٹھیک ہے۔ عشرت اکثر سوچتا تھا۔ میرا آئینہ کسی کے آئینے سے کیوں ملے۔ میں انسان ہوں۔ کالج کی سطح نہیں ہوں شریعہ شروع میں عشرت کے خواب مختلف تھے۔ اسے ورزش کا بہت شوق تھا۔ وہ بڑا ہو کر جتنا تک کا اُستاد بننا چاہتا تھا جب وہ اور بڑا ہوا تو فوج میں جنرل بننے کے خواب دیکھنے لگا جب وہ اور بڑا ہوا۔ اور جب اسے دُور دیدہ لگا ہوں شرمائی ہوئی نظروں اور عرق عرق مینوں اور کانٹتی ہوئی نیم۔ ہوش انگلیوں کے پیام ملنے لگے۔ تو وہ فلم میں ہیرو بننے کے خواب دیکھنے لگا۔ جشت!۔ وہ جتنا تک کا اُستاد کیوں بنے گا۔ ہادی نرسل بار پھر ورزش کرتے کرتے اس کا تو دم نکل ملے گا۔ اور فوج میں جنرل؟ پہلے تو وہ سپاہی میں بھرتی ہو گا اور لفٹ رائٹ کرتے پر یہ کرتے فٹبک کھاتے کھاتے جلتے کب جنرل بنے گا۔ کہ کسی دن کورٹ مارشل ہو کے پھر سپاہی رہ جائے گا۔ لیکن یہ فلم کا ہیرو بننا کس قدر اچھا اُو آسان کام معلوم ہوتا ہے جس طرح وہ چاہا گیا تھا جس طرح رئیس گنج میں اس کی خوب صورتی کے چرچے تھے۔ جس طرح اہمان بے بھم۔ نامستول لڑکیوں نے چپ چپ کر اس سے محبت کی تھی جس طرح کی اہمان۔ بے بھم۔ نامستول ہندوستانی فلمیں اس نے دیکھی تھیں۔ اس سے عشرت کو یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ قطعی طور پر فلم میں ہیرو بننے کے قابل ہے اور ہیرو کا کام کس قدر آسان ہوتا ہے۔ فلم میں شروع سے آخر تک محبت ہی محبت کئے جاتا۔ محبت کے گیت گاتا۔ محبت کے خط لکھتا۔ محبت کے اُستاد بنانا۔ محبت کی موت مرنا یا محبت کی شادی کا ناگرا نوسے ہی نوسے ہیں۔ ہر طرف سے اس کے

مطلبہ پر ہندوؤں کا اُستاد و افتخار جنرل مینی ساری ہوا ٹیڑیاں دگر دگر کر کے گزرا۔ عشرت کار شہم میں
لبوں ہم اس خیال کے آتے ہی کانپ گیا اور اس نے فلم میں بیرو بننے کا قطعی فیصلہ کر لیا۔

اس نے عشرت بنی لے پاس کرتے ہی کبھی بھاگ گیا۔ اور اپنی بیوہ ماں کو اکیلا چھوڑ گیا۔
رئیس گنجی کا شہر اس کے لئے بہت چھوٹا تھا۔ یہاں کی کامیابیاں بہت خیر نہیں۔ سکندر مقدونیہ میں کیسے
رہ سکتا تھا۔ اتنی بڑی دنیا فتح یابی کے لئے اُسے چاروں طرف سے بھاری تھی۔ اس نے سکندر رئیس گنجی
سے بھی آگیا۔

ہر سال ملک کے اطراف و اکنات سے ہزاروں لوگ یہی کام کی تلاش میں آتے ہیں اور
یہ کوئی غلط بات نہیں ہے۔ اور یہ کوئی ایسی بات بھی نہیں ہے۔ جسے رد کیا جاسکے۔ یہی ہندوستان کا سب
سے بڑا منشی شہر ہے اور کام کاج کے سلسلے میں ایک بڑا صنعتی شہر لیک بہت بڑا منطیس ہوتا ہے جو
بے روزگار لوگوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ ہر ملک ہر ملک میں اپنی طرف کھینچتا ہے۔ کیونکہ یہاں تجارت ہوگی
اور صنعت و محنت ہوگی۔ وہاں باہر سے لوگ کھینچے ہوئے آئیں گے اور گھر والے کو چھوڑ کر آئیں گے اور بیویوں کو
چھوڑ کر آئیں گے اور ماں باپ کی خواہشوں کو روند کر آئیں گے اور دوستوں اور محبوباؤں کے آسودگیوں میں
بیٹھے ہوئے آئیں گے جس طرح لوہے کے فرتے منطیس کی طرف کھینچتے ہوئے چلے آتے ہیں۔ یہاں منتظر
بھی آئیں گے اور ڈیوڈ بھی آئیں گے۔ اور کراہاں سٹو بھی آئیں گے۔ یہاں خدا بھی آئیں گی۔ سوشیو بھی
آئیں گی۔ انہیں بھی آسنے کی اور سادہ ساری بھی آئے گی۔ کوئی نالوں کے ساتھ آئیں گی تو کوئی ڈھائی سو
روپے لے کے آئیں گی۔ کوئی زیور چڑھائے آئے گی۔ تو کوئی کسی کی آنکھوں کی بیند چرائے آئے گی۔ مگر
آئے گی ضرور کیونکہ یہی ایک بہت بڑا منطیس ہے۔ جہاں دانستی رہتی ہے۔ مہلے چاری بیوہ
دانستی براپنے گاؤں میں بھوک مرنے تھی۔ پر یہاں کبھی میں ایک مل میں ساٹھ روپے پاتی ہے۔ یہاں
راتی ہوتا ہے۔ جو سنا ہے ایک فلم میں کام کرنے کے لئے ڈیڑھ لاکھ روپے لیتی ہے۔ پھر یہاں اپنے

کریال کا بیجا گرجش ہے۔ اسے دی گرجش بولنے تجھے میں مارا مارا پھرتا تھا۔ یہاں مٹا ہے اس کے پاس چھوٹکیاں ہیں۔ اور بچے کمار کو تو دیکھا ہوگا۔ یہاں کادسلہ چھنڈر بھی اس کے فلنے نہیں چھاپا آج وہ بچی کا سب سے بڑا فلی ادریب ہے۔ اور عشرت نے سوچا وہ تو راج کمار سے کہیں خوب صورت ہے۔ وجہ کدے کہیں تعلیم ہانت ہے۔ اس نے اس نے اپنے سوٹ کس میں تین اپنے پہنے ہوئے سوٹ کے پکڑیں، انگریزی جرابیں، جوتے، اندر تین سو روپے ساتھ میں لئے ہوئے۔ وہ جھاگ کر بچی آگیا اور اس کے سی سائیڈ ہوٹل میں ٹھہر گیا۔

سی سائیڈ ہوٹل کی غلام گردش میں پہلے ہوئے کھٹے نے عشرت کو دیکھ لیا۔ کھٹے راج محل اسٹوڈیو میں کیمرو مین تھا۔ اور بظاہر بہت عظیم۔ مرد بار اور تین مہتم کا انسان نظر آتا تھا، گول گول چہرہ، گول گول سینک، گول گول سکواٹ کچھ کچھ بھی ہے۔ کچھ کچھ بھی نہیں۔ پان کٹے میں دبائے ہوئے لیک نیلے رنگ کی چوڑی مہری والی چٹلون۔ اور چٹلون کے اوپر ڈھیللا ڈھالا براؤن رنگ کا بیش خرش پہنے ہوئے کھٹے ہوئے چلے آئے ہیں۔ کھٹے بظاہر سکتے ہوئے جیسے میں کام کرتا تھا۔ سوئی ہوئی رفتار سے چلتا تھا۔ سوئی ہوئی آدمی آٹھوں سے اس طرح دیکھتا تھا۔ جیسے وہ دنیا دہا فیا ہے غافل ہے۔

مگر وہ اس کی غفلت اک بظاہر سوئے ہوئے کنڈلی مارے ہوئے، دھوپ سیکے ہوئے سانپ کی غفلت تھی۔ آپ خدا اس کے قریب گئے اور اس نے ڈنگ مارا۔ کھٹے نے عشرت کو غلام گردش میں ٹپتے ہوئے تالیاں گرجی آسامی ہے فلم کے جگر میں ہے۔ اس لئے معاملہ پٹ جلتے گا۔ چنانچہ اس نے عشرت سے دوستی کرنی۔ اور اس سے وعدہ کر لیا کہ وہ اسے سیٹو بیتال برائی بائز یا کے راج محل اسٹوڈیو میں لے جائے گا۔ اصلے اپنے دوست جوشی ڈائریکٹر سے ملاوے گا۔ مگر تمہارے پاس کیا سٹیل ہیں؟ کھٹے نے کہا۔

”مثیل کیا جوتے ہیں“ عشرت نے گہر کے پوچھا۔

”تمہاری تصویریں ایک آپ کے ساتھ روشنی اور زائے کے دل چسپ استخراج انسان کی صورت کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں اور تم تو یوں بھی اچھے خاصے بیرونگزرتے ہو۔ پوری نظم اندیشی میں تمہاری ایسی شخصیت مجھے تو کسی دوسرے بیرو کی نظر نہیں آتی۔ مثیل کھڑانے میں پچاس روپے لگیں گے۔ میں خود کچنوں کا۔“

عشرت کچھ تصویریں اپنے ساتھ لایا تھا کھڑنے انہیں دیکھ کر سر ملاتے ہوئے کہا یہ دس گنج کے نامزد گراں گاہک بال کے فوٹو کہاں نہیں ملیں گے۔ جن میں تم چیتے کی کمال پرکری رکھ کے یوں لگائے بیٹھے ہو۔ جیسے تمہیں پانچ پانچ بوا سیر ہے۔“

عشرت ہنسا اور اس نے جیب سے پچاس روپے نکال کے کھڑے کو دئے۔ کھڑنے گزشتہ تین مہینے سے ہوٹل کا بل نہیں دیا تھا۔ اس لئے۔ اور کچھ کھڑنے عشرت کو خوشی ہی سے ملا دیا۔ اور اس طرح ایک جفتہ میں اس سے ڈیڑھ دو سو روپے اور کچھ لے۔ اس کا ایک سوٹ گری لکھو لایا دو قمیص، ہانگ لیں ایک جوتا پہن لیا۔ اور جب عشرت کے پاس کچھ ڈرہا۔ اور جب فیچر نے عشرت کا سامان ہوٹل سے باہر پھینک دیا۔ تو کھڑے صاحب عشرت کی طرف سے یوں داخل ہو گئے کہ اس طرف اودھ مندی آنکھوں سے عشرت کی طرف دیکھنے لگے۔ جیسے انہیں موتیابند کی شکایت ہو۔

جب عشرت ہوٹل سے باہر نکلا۔ تو اسے ایک جھکسا گلا زندگی میں پہلی بار اسے کوئی آدمی ایسا بھی ملا تھا جس نے اس کی خوب صورتی کی رقی بھر پوراد نہیں کی تھی۔ جس نے ایک شائق جیب کترے کی نگاہوں سے اسے چاروں طرف سے ٹٹول ٹٹول کر اسے اچھی طرح سے اٹا پٹا کے جہان پھنگ کے غالی کر دیا تھا۔۔۔۔۔

یہ ایک عشرت کو مسلم ہو کر نہ اس شہر میں باطل اکیلا ہے۔ اس کی جبین استینوں سے

باہر فلک رہی ہیں اور ساری دنیا اسے مشتہ نگاہوں سے دیکھ رہی ہے۔

وہ رات اس نے باجے سینٹرل ٹیشن کے سینکڑوں کلاس وٹنگ روم میں جاگنے گزاری۔ صبح ہوتے ہی اس نے راج محل سٹوڈیو کا رخ کیا کیونکہ جوشی ڈائریکٹر نے اس کا فلم ٹسٹ لینے کا وعدہ کیا تھا۔

اگر وہ اس امتحان میں کامیاب ہوا، تو.... وہ عشرت سوچتے نکلا کہ پھر وہ اپنا نام کیا رکھے گا۔ پھر اس کے ذہن میں ایک باغیچہ کی پرکھلے سے گزرتی یہ پرکھ وہ خود چلا با تھا۔ تلخ میں ہلکیا فائرس روشن تھے۔ اور وہ ایک شفت شفت کی ساری میں حمر قرانی ہوئی تھی کے ساتھ قس کر رہا تھا جوشی نے کہا: عشرت مسکراؤ =

عشرت مجھے بھوکا تھا۔ اس نے مسکراتے کی کوشش کی۔ وہ اسلام ہوتا ہے۔ جیسے کہ پتہ چلے کہ بڑے مسکراتے کی کوشش کر رہے ہو۔ اسے بھائی تھا اسے ملنے ایک خوب صورت لڑکی لکھی ہے۔ بناؤ کیسے مسکراؤ گے؟ جوشی نے پوچھا۔ عشرت نے ہر مسکراتے کی کوشش کی۔

”باپ دے؟“ جوشی بڑے انداز سے نئے میں چٹایا۔ پھر اس نے کہا۔
”اچھا ہنسو۔“

”ہی۔ ہی۔ ہی۔“ عشرت ہنسا۔

اُسے اپنی ہنسی بڑی کمزور معلوم ہوئی۔

”گدھا! جوشی پھر حیا۔“ اچھا پڑھ کر بھی دکھاؤ۔ میرا مطلب ہے۔ چہرہ اور اس، آنکھوں میں آنسو نہ لگانے ہوئے۔ چہرہ محبت کی حراں۔ صبیح کی زندہ تصویر =

عشرت نے پھر کوشش کی۔ اُسے خود معلوم ہو رہا تھا کہ اس کوشش میں اس کا چہرہ بہت بے باک

معلوم ہو رہا ہوگا۔

یہ ایک وہ کھبیانی ہنسی ہونے لگا۔

”اٹ اٹ اٹ اٹ“ نے غصے میں کہا ”آج اے رُس گئے سب روغنہ، کم بہت ایک لنگ کی دم سے تنہا نہیں آگیت آگٹ!“

گیٹ آگٹ۔ جو کہ عشرت بڑی بے دینی سے راج محل کی شہجہ نبرہ کے باہر پڑنے فرخ پڑے ہوئے پردوں، جھٹ کے پردوں، کھڑی کی کھچڑیوں مولانا گ کے چھلوں اور پلاٹر کے پڑنے قسمتہ تہوں کے درمیان میٹھا تھا۔ اس کے سامنے فٹ راج کا ٹوٹا ہوا بھتر تھا لاج فٹ کا ہاند گیش کی سوڈ پڑا تھا۔ اور تندی بیل کا بت ایک مراچی سے اپنا منہ لگائے ہوئے تھا عشرت نے سوچا اب وہ کیا کرے۔ سکندر واپس مقدونیہ چلا جائے۔ کہ خود کشی کرے۔ کہ ماں کو تار دے کے روپے چھلے کی کوشن کرے۔ کہ فاقہ مستی میں کوشن کرتا رہے عشرت زندگی میں آج تک بھوکا نہ رہا تھا۔ اس نے آج اس کا جی بدلے کو چاہ رہا تھا۔ یہ ایک اس کے کانوں میں آواز آئی۔

”ابا اڑیاں کیوں پیچھے ہو جی؟“

عشرت نے سر اٹھا کے دیکھا۔ سامنے مادا اڑی رتاما کا لباس پہنے عہدہ سیک آپ کئے ہوئے ایک جوان لڑکی اپنے ہونٹوں کو بڑی غوت سے بیکوڑتے ہوئے تھی سب کہہ رہی تھی۔ یہ رفیعہ تھی۔ ساری کب کے وہاں سے عشرت اٹھ کھڑا ہوا، اور چلنے لگا۔

”لو!“ رفیعہ بڑی حیرت سے ہوئی ”میں نے ذرا دم کیا تو اٹھ کے چلنے لگے۔ اگلے ایسے میں تمہارا کیے گزر ہوگا۔ نئے معلوم ہوتے ہو“ رفیعہ کھلکھلا کے ہنس پڑی۔

عشرت بھی ہنسا۔

وہ دونوں پلاسٹک کے تہوں پر بیٹھ گئے۔ رفیعہ نے اپنا نام بتایا۔ وہ آج چوتھائی

منو بھائی کی شوٹنگ میں آئی تھی۔ ڈانس کئے۔ اس کی ایک ماں ہے۔ ایک بہن تھی سو گئی پانچ بچے چھوڑ گئی۔ وہ ان پانچ بچوں کو پالتی ہے۔ بھنڈی بازار میں ایک چھوٹی کھولی میں رہتی ہے۔

”تم کہاں رہتے ہو کیا کام کاتے ہو۔ یہاں کیوں آئے ہو؟“

عشرت نے سب بتایا۔ بتاتے وقت اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”اباڑا مرد ہو کر روتے ہو“ رضیہ غصے سے بولی ”چلو میرے ساتھ گھر پر...“

عشرت اٹھا۔

”لو ابھی سے چلنے لگے؟ ارے ابھی نہیں شوٹنگ کے بعد چلیں گے۔ ساڑھے چھ بجے بیٹھوں ابھی جانی ہوں۔ شاٹ ہونے والا ہے۔“

رضیہ کی کھولی میں روشنی بہت کم تھی۔ کالونج بہت زیادہ تھی۔ رضیہ کی ماں کے خاکسری ماں چہرے پر انکھوں کے ان گنت نشان تھے۔ اس کی ٹھوڑی ایک پیٹروم کی طرح بڑی وقت آہستہ بہت حرکت کرتی رہتی تھی۔ اُس نے ایسی سٹی ہوئی نکلا ہوں سے عشرت کی طرف دیکھا۔ جیسے دنیا میں کوئی جہنمی نہیں ہے۔ اور کوئی دوست نہیں ہے۔ کوئی نیا نہیں ہے۔ کوئی پڑانا نہیں ہے۔ کسی کے آنے کی فحشی نہیں ہے۔ کسی کے جانے کا غم نہیں ہے۔ جتنے آنسو تھے وہ سب خشک ہو چکے۔ اور جتنے قسم تھے وہ سب مر چکے۔ بس ایک پنڈم ہے جو ایک ہی سقرہ رنٹا سے جھوٹا رہتا ہے۔ موت سے زندگی کی طرف اور زندگی سے موت کی طرف ایسی چھری، ٹکی ہوئی، جامہ و ساکت جسم تھی۔ اس بڑی عورت کی کمر عزت کو محسوس ہوا جیسے وہ کسی گھر میں نہیں۔ کسی برف خانے میں چلا آیا ہے۔ اس کے سارے جسم میں ایک جھرمجری سی آئی اور اسے ایک لمحہ کے لئے کانپنا چھوڑ گئی۔

رضیہ عشرت کو ہاتھ سے پکڑ کر کہنے لگی ”تو کیا چپ کھڑے ہو۔ شرابی ہوئی ہوئی (لٹک) لٹک) کی طرح اب بیٹھ جاؤ۔ یہیں زمین پر مشو جاؤ۔ ہم لوگ یہیں زمین پر بیٹھتے ہیں۔ یہیں زمین پر سوتے ہیں۔ کھولی

کے ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ روضہ کمال کی ٹیکر تار کروبان دھونے کے لئے چلی گئی۔ بڑی ماں نے ہنڈیا میں چاول ڈالے۔ عشرت کرسی پر بیٹھ گیا۔ زمین پر پیاز کے چھلکے پڑے ہوئے تھے۔ ایک چمکا اٹھا کہ - میں نے عشرت کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا - تم فہم میں کام کرتے ہو ۛ

”ہاں“ عشرت نے کہا۔

عشرت ذات سے بھوکا تھا۔ اسی لئے بار بار ابلی ہوئی بانڈی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بڑی ماں نے آنکوں کے قطرے کاٹ کے بانڈی میں ڈال دیئے۔ پہلے چاول ڈالے جا چکے تھے۔ جب تک کے بعد ہلدی ڈالی گئی۔ تو بانڈی میں بڑا مزے دار اُبال آیا۔ سوندھا سوندھا۔ پیلا پیلا۔ جھاگوں والا سون سون کرنا ہوا اُبال۔ عشرت کی آنکھیں اندر سے کھینچنے لگیں۔ اس کی نگاہیں بانڈی پر جم گئی تھیں۔ یکایک اُس نے دیکھا۔ اُن پانچ بچوں کی نگاہیں بھی اس بانڈی پر جمی تھیں۔ نگاہیں گرسنہ منہیں پانی گردن کا ملتون پیچھے سے اوپر اُڑ رہے تھے۔ جیسے جیسے جاتا ہوا مسلم ہوتا تھا۔ موت سے زندگی کی طرف۔ زندگی سے موت کی طرف۔

بانڈی کب اتاری گئی۔ کب چاول ہلستے گئے۔ کس طرح ہاتھ بچھے۔ کس طرح جبرے پلے اور ڈالے اُترے۔ عشرت کو اور دوسرے بچوں کو کئی نظم نہ تھا۔ بس ایک بھوک تھی جو ایک خون آشام پھکار ڈک کر صبح کے تاریک سایوں کی طرح ان کی روح پر اُن کے جوش و احساس پر پھیلی ہوئی تھی۔ اور جب چمکا ڈالنے اپنا خون پی لیا تو وہ سب نڈھال ہو کر دیں فرش پر جانوروں کی طرح سو گئے۔ اہ آلودوں اور پیاز کے چمکوں اور نمک میں نہنے ہوئے چاول کے چند دانوں کو اٹھا کر روضہ نے کمر کی کے باہر بھینکتے ہوئے دیکھا کہ باہر بازار میں دکانوں پر خوب صورت کتا بیٹھ رہی ہیں۔ اور ڈودروں پر انگوٹھ کے گتھے تلک رہے ہیں۔ کپڑے دانے کی دکان پر غوث پوش عورتیں ریشم کی ساواں خرید رہی ہیں۔ اور رستوران سے محلے دار شاہی کبابوں کی خوش بو اُٹھ رہی ہے اور روضہ نے سوچا کہ بازار

میں کتابیں پک رہی ہیں۔ لیکن اس کی بہن کے بچے اُن پڑھ رہیں۔ وہ اخبار پڑھتے ہیں پڑھ نہیں سکتے۔ اور
 ڈورہوں پر تلے ہوئے انکار کئے ہیں اور رشیم بہت ہنگامے۔ اور شای کبابوں کی خوشبو بہت قوی ہے
 ایک آم کے ساتھ اس نے آہستہ سے کھڑکی بند کر دی اور فرش پر پاؤں پھیل کے لیٹ گئی۔ فرش ٹنڈا تھا
 اور اس کے جسم کا ہر انگ دین بھر کی شوٹنگ کی مشقت سے ٹوٹ رہا تھا۔

رضیہ نے کہا ”میری بہن کا خاندان کبھی کبھی تمہاری طرح آیا تھا، بیرو بھنے کے لئے آخر غور کشتی کے مرگیا
 اس کے غم میں میری بہن تپ دق سے مر گئی۔ آج تم جب ٹھوڈیوں میں کوڑے کے ڈھیر پر بیٹھے تھے
 تو مجھے تمہارا ارادہ نیک معلوم نہیں ہوتا تھا۔“

عشرت نے اس پر اس ہو کے کہا: ”کیسی کیسی اُمیدیں نے کے آیا تھا۔“

”کوئی اُمید ایک دم پوری نہیں ہوتی۔ اس کے لئے بڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔ اگر تم محنت کے لئے تیار
 نہیں ہو تو واپس اپنی ماں کی گود میں لوٹ جاؤ۔“ رضیہ نے طنز کیا۔

”میں واپس نہیں جاؤں گا۔“ عشرت نے جواب دیا۔

”تو پھر کیا کرو گے؟“

”تمہاری طرح ایجنٹر بن کر کام کروں گا۔ تمہاری ایجنٹر انجمن کا ممبر بن جاؤں گا۔ کل بجے ایک کلاٹ
 مٹھلا اور، ممبری کا۔ سنا ہے اس کارڈ کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتا۔“

”اور بیرو نہ بھبھو گے؟“ رضیہ نے پوچھا۔

عشرت چپ ہو گیا اس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے اور کروٹ بدل کے سو گیا۔

دوسرے دن رضیہ عشرت کو لے کر رضیہ کے گھر گئی۔ جہان پورہ کی ایک گلی میں ایک ایرانی

دستوران کے اوپر واقع تھا۔ رضیہ کی ماں اپنا بیٹی کوٹ گھٹنوں سے اُپر کے سو رہی تھی رضیہ کا بانی جو ایک موٹر ورک شاپ میں مکینک کا کام سیکر رہا تھا۔ ایک کمر کی میں بیٹھا باہر دیکھ رہا تھا۔ رضیہ دانت مات کر رہی تھی۔

رضیہ نے عشرت کو رضیہ سے بلایا۔ رضیہ اُسے دیکھ کر مسکرائی۔ پھر ہنسی۔ پھر خوب نور سے ہنسی۔ حشرہ کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔

رضیہ نے رضیہ کو گھگھانے کے کہا "ہائے کس قدر سوٹ ہے۔ باصل گڈو سا معلوم ہوتا ہے۔ میں تو اگر اپنے دلدار کو نہ چاہتی۔ تو اُسے چاہنے لگتی۔ فنا ہو جاتی۔ بلکہ ..."

واقعی عشرت کی حوصلہ دہی میں کچھ ایسی ہی بات تھی۔ پہلی ہی نظر میں اکثر لڑکیاں اُس پر فریفتہ ہو جاتی تھیں۔ اس کی خوب صورتی میں مرد نہ وقار کے علاوہ ایک عجیب طرح کا بھولپن مصویت ہی تھی۔ بھی نہیں مگر معلوم ہوتی تھی۔ اور جب وہ اپنی موٹی موٹی پلکیں اٹھا کر ترہی محاکہوں سے کسی لڑکی کی طوٹ ایک عجیب بے ہوشی ادا سے دیکھتا تھا تو وہ لڑکی بقول رضیہ وہیں "فنا" ہو جاتی تھی اس وقت بھی عشرت نے کچھ ایسی ہی نگاہ سے رضیہ کی طوٹ دیکھا تھا۔ اس کی نگاہ عورت میں ماساکے ایسے شڈ جذبات پیدا کر دیتی تھی کہ اکثر لڑکیاں اُسے بیک وقت محبوبہ کے اور ماساکے جلمے جلمے جذبات سے چاہنے لگتیں اور اس قسم کی چاہت بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ رضیہ کو نہیں معلوم تھا، مگر رضیہ جانتی تھی اسلئے کہ یہ نگاہوں میں اس نے جان لیا تھا کہ عشرت کا اس کی قدر خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

"ای ا تو کہاں پنس لگی؟" اس نے رضیہ سے پوچھا۔

"کہیں بھی نہیں" رضیہ اس کے شلنے پر ہاتھ داس کے سرگوشی میں ہلکی "موٹی، اباڑ، مائی بی۔ بات نہیں سنئی۔ اپنی کہے جاتی ہے، سبے پارہ۔"

رضیہ نے عشرت کی طوٹ اشارہ کیا "شریف خاندان کا ہے۔ بے کاس ہے۔ گھر سے بھاگ کے بھی ہیں

میر دہنے کے لئے آیا تھا اب اس کا داغ ٹھکانے آ گیا ہے۔ غلام بخش راؤن میں تم سے میر بخود
شاگرد گوارا تنہا ہی بات سن لیتے ہیں۔

ہاں مگر راؤن میں پہلے ہی سے پانچ ہزار مرٹیاں رضیہ نے اعتراض کیا۔

”ایک اور سہی، اُردو تو اس کی ماویٰ زبان ہے۔ بہت ابھی باتیں کرتا ہے۔ درجہ اول کا کارڈ اسے
لے جانے کا۔ اپنی روٹی کا کھائے گا۔“

”اور کارڈ کی فیس پندرہ روپے؟“

رضیہ بولی ”پانچ سو روپے پاس ہیں۔ دس تو ڈال دے۔“

”خفا ہو گئی تو“ رضیہ مسکرا کے بولی ”ابھی مچی۔ اگر اس طرح سے تو اس پر خج کرے گی۔ تو بالکل مر جائے
گی۔ یہ تو مجھے کچا کھا جانے گا۔ اس کی خوب سوچتی پر نہ جا۔ رتو۔“

”بہت کہنی ...“ رضیہ صہجلا کے روٹی ”مجھے تو ہمیشہ ایسی ہی باتیں سونگتی ہیں۔ انسانیت
بھی کوئی چیز ہے۔“

”میں بھی تو انرا انسانیت کہہ رہی ہوں۔“

”تو بس ٹھیک ہے۔ انسانیت تک رہنا۔ کیسے محبت تک نہ پہنچ جاتا۔ درجہ انجام برا ہوگا۔ رضیہ
لے بھایا۔“

”اچھا اب پہلے گی بھی کہ باتیں بنائے گی؟“

”فرا تیار ہوں۔“ رضیہ لڑی۔

کوئی ڈیرہ دھکے میں رضیہ تیار ہوئی۔ اس کا سنہارا رنگ سبز سلاخی میں اور بھی ٹھکرایا تھا
ماؤں کے لچے جو سر کے اوپر سے سیدھے آئے تھے۔ اس کے شانوں پر کچا کر سنہرے جوڑوں میں تبدیل
ہو جاتے تھے۔ پ۔ انک کی چاب بہت گہری تھی۔ باقوت سے بھی گہری۔ سرخ۔ کچا کوہ کا سنی رنگ۔

اس میں جھگڑا تھا جس سے رضیہ کے لب بڑے زہریلے معلوم ہوتے تھے۔ رضیہ اپنے بھائی کی وجہ سے ۲۰ خطرناک جنگ دل کش بھی جاتی تھی۔

فلم ایکسٹرا یونین کے دفتر میں پہنچ کر جو داروین روڈ پر واقع تھا۔ رضیہ عشرت اور رضیہ کوٹے کو یہی یونین کے صدر کے دفتر میں گھس گئی۔

ایکسٹرا یونین کا صدر ملکر گجرات سٹو تھا۔ گجرات سٹو کا محرمی تھا۔ اہل کدور پہنچتا تھا۔ اور سماجی فلموں کا ہیرو بھی رہ چکا تھا۔ مگر کدور پہنچنے والے باغیانہ سیاسی خیالات رکھنے والے ہیرو کی قدر اس ماحول میں کہاں ہوتی۔ جو اپنے رنکر رکھاؤ میں۔ مزرعہ معاشرت میں، لباس میں، فرنیچر میں، پلٹتی ہیں، زندگی کے ہر شعبے میں ہلنی روٹی نقل کرتا تھا۔ تیو یہ ہوا کہ گجرات سٹو آہستہ آہستہ سماجی فلموں میں خیر مقبول ہوتا گیا۔ شراب سے، مذہبی ہاری سے، غیبت سے، مردوں سے یعنی ان تمام باتوں سے گجرات سٹو کو نفرت تھی جن سے فلم انڈسٹری کا ماحول متاثر تھا۔ مجبور ہو کر گجرات سٹو کو دھارمک فتنوں میں آنا پڑا۔

جہاں پیسے بہت کم ملتے تھے۔ یہاں بھی اپنی اتنا دلیع سے مجبور ہو کر وہ زیادہ دیر تک نہ ٹیک سکا۔ اہل دھیرے دھیرے بے کار ہوتا گیا۔ اب گذشتہ تین چار سال سے اسے کسی فلم میں ہیرو کا کام نہیں ملتا تھا اس سے پہلے تو نہیں۔ لیکن اپنی بے کاری کے دنوں میں اُسے ایکسٹرا لوگوں کی یونین بنانے کا

خیال آیا۔ جب وہ خود ملازمت سے مجبور ہو کر تقریباً ایکسٹرا ساہو کے رہ گیا۔ قوسے ان لوگوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ لوگ جو تعداد میں ہزاروں تھے۔ مگر منظم بلکہ قطعی طور پر نرماہی حالت میں تھے یہ لوگ سٹوڈیو پر سٹوڈیو گھومتے تھے۔ اور ایکسٹرا پلاٹر لوگوں کے گھروں پر پٹر لگاتے تھے کام کے لئے۔ نہ ان کا کوئی ریٹ بندھا ہوا تھا نہ ان کی کوئی عزت مقرر تھی۔ ایک ایکسٹرا پلاٹر گویا ایک طرح

ان کی جان و مال اور عزت کا حلیہ دار تھا۔ ایک فلم کہنی ایک ایکسٹرا سب پلاٹر کو فلم کے دوران میں ایکسٹرا لوگوں کو سپلائی کرنے کا حلیہ دے دیتی اور پھر پلاٹر اپنی مرضی سے اپنا ریٹ لگا کے ان لوگوں

کلام دیتا کہی سے پندرہ روپے فی ایکٹر لیتا۔ اور سات روپے ادھر باشتا کسی کو سات دیتا۔ کسی کو پانچ۔ کسی کو دو روپے پر ہی ٹرغا دیتا۔ اور ایکٹر احمد توں کی تو ادھی بڑی مالت تھی۔ انہیں کام کرنے کے علاوہ اپنی فرت بھی سپلائی کرنی پڑتی تھی۔ ایک ایکٹر اسپلائر نے درجنوں آکاشیں پال لی تھیں جیسے ڈوبے غلے میں مرغیاں پالی جالتی ہیں۔ کبھی ایک کی آکشتا غلطی سے یا غصے میں کڑا کڑائی ہوئی گئی دوسرے ایکٹر اسپلائر کے پاس چلی جاتی۔ تو راند میں روڈ پر دنگا شروع ہو جاتا۔ پھر یہاں اور چانر چلنے لگتے۔ جس میں ایک ایکٹر اسپلائر کا گروہ دوسرے اسپلائر کے گروہ پر شتم ہو کر حملہ کر دیتا۔ پولیس آجاتی۔ بڑی مشکل سے معاملہ رفع دفع ہوتا۔

دور میں روڈ کی بہادیاں ایکٹر انگوں سے تھی۔ اس سڑک پر چار شوڈ بڑے ایک چھوٹے چھوٹے گینوں والا قوی بوٹل تھا۔ ایک مسجد تھی ایک شراب خانہ تھا، مگر مسجد کے زیر سایہ تھا۔ کچھ پانی کی دکانیں تھیں کچھ لاندھریاں، دونوں کی دکانیں تھیں۔ باقی سب دستوران تھے اور پنجابی سندھ تھے۔ اور سب کے سب میلے کھیلے گندے غلیظ۔ ہر دکان دار ایکٹر انگوں کو اُدھار دیتا تھا اور یہاں بڑا دھندا اُدھار پر چلتا تھا۔ پانچ کے بیڑے سے شراب کی بوتل تک ہر چیز کو پانے سے ملتی تھی۔ اور اکثر اوقات جب کوئی ایکٹر ابھاگ جاتا۔ یا ایکٹر اسپلائر دیوالیہ ہو جاتا۔ تو دکان دار کے ہاتھ میں صرف کہیں ہی کوہی رہ جاتے۔ ان دکانوں کے اوپر کے کمرے میں مختلف فلم کمپنیوں کی عکاسیاں لگی ہوئی تھیں۔ وی گرٹ لوصیاد فلم کمپنی۔ سردار جگت سنگھ المودالیہ کی کمپنی تھی۔ جنہوں نے جنگ کے دوران میں بھارتی کوگی سپلائی کر کے ایک چھوٹے سے ٹھیکے میں چالیس ہزار لکے تھے۔ اور اب وہ چالیس ہزار سے ایک فلم کمپنی کھولے ہوئے تھے۔

”دوب چنٹرا“ فلم کے کوئی تیراوی ہی کھولے ہوئے تھے۔ جن کا باب مولے شے کی کے لئے ایک پھل چھوڑ گیا تھا۔ تیراوی ہی اس مکان کو جس ہزاروں ٹھکانے لگا کے بنی اُگے تھے۔ اب یہ

ہیں، ہزار بجی ٹھکانے لگ گیا تھا۔ لیکن اس دوران میں انہوں نے ایک فنی مقام، کنول سے آٹھائی پیلا
 کر لی تھی۔ کنول کے پاس دس ہزار نقد تھا۔ جسے اب وہ ٹھکانے لگانے کی سوچ رہے تھے۔ انہوں نے
 کمپنی کے لئے ایک نئی محنتی پر کھینے کو دیا تھا: "کنول چتر"۔ دائرین سڈو تختیاں بدلتی رہتی ہیں۔ اور جس
 تیزی سے فلم کمپنی کی تختیاں بدلتی ہیں۔ اس سے فدا کم تیزی پہنچے۔ یہ کاروں کی تختیاں بدلتی تھیں۔ مگر
 بدلتی ضرور تھیں۔ کیوں کہ پورے کا پورا بازار فلم انڈسٹری پر زندہ تھا۔ اس لئے اس کی کچی معاشرت
 اس کے صحیح سماجی نقطہ نگاہ۔ اور اس کے پورے سماج و مالی اور منسی اصول کی بحکاسی کرتا تھا۔ دائرین
 روڈ پر کھڑے ہو کر آپ آدھے گھنٹے میں دیکھ سکتے تھے کہ ہندوستانی فلم انڈسٹری کی کیا حالت ہے۔ حالانکہ اس
 نے شور و برندی۔ دائر اور لاہور پہلی سے لے کر لاڈلنگ میلوں تک پہنچے ہوئے تھے مگر دائرین روڈ کے اس
 آدھے فرونگ کے فاصلے میں آپ اس میلوں دور پہنچی ہوئی حقیقت کو ایک جگہ دیکھ سکتے تھے۔

بہت آہستہ۔۔۔ بہت ہی دھیرے دھیرے۔۔۔ بڑے مبرا اور استقلال سے وہ کئی
 ایک ناکامیوں کے بعد گجرات لے ایچسٹر لوگوں کی یونین بنائی تھی۔ شروع شروع میں اسے بہت سی
 ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا۔ ایچسٹر اسپلائر لوگوں کی طرف سے بڑی مخالفت ہوئی۔ کئی لوگوں نے اسے
 جان سے مار دینے کی دھمکی بھی دی۔ اس پر وہ ایک بار چاقو سے حملہ بھی کیا گیا۔ مگر گجرات بڑی خندہ
 پنہانی سے سب کچھ سہتا گیا۔ ٹھیک ہے، اپنے کام میں اسے مفاہمت کرنا پڑی۔ اپنے اصولوں سے
 بہت ہٹ کے یہ یونین بنانی پڑی۔ کیوں کہ یہ دو کرنی صحیح یونین نہ تھی۔ اس میں ایچسٹر اسپلائر لوگ
 بھی شریک تھے۔ اس طرح سے کہ گجرات لوگ یونین کے کارڈ پر فلم کمپنیوں میں جاتے تھے۔ گو ان کے
 ریٹ بھی بندہ گئے تھے۔ مگر اب بھی وہ ایچسٹر اسپلائر کی معرفت ہی جاتے تھے۔ اور شور و برندی اور فلم کمپنیوں
 والے اب بھی ایچسٹر لوگوں کا معاوضہ سپلائر ہی کو ادا کرتے تھے۔ ٹھیک ہے۔ سپلائر لوگوں کا کیشن اب
 بھی ان کے ریٹ کی طرح بندہ گیا تھا۔ مگر چونکہ رقم کمپنی سے سپلائر کو ادا ہوتی تھی۔ اس کا پلہ ہمیشہ

بھاری رہتا۔ وہ کبھی کہتا۔ رقم نہیں ملی۔ کبھی کہتا کم ملی ہے۔ کبھی کہتا اتنے لے جاؤ۔ اتنے گئے رہتے ہو تو لے جاؤ۔ نہیں تو یہ بھی گئے۔ اور عورتیں، جو نظر نہیں دے تو کچھ بہتر حالت میں تھیں اور جو ریفیک کی طرح بدمن کے کھڑے پر بھروسہ کرتی تھیں وہ دھٹکے کھاتی تھیں۔

اور سپلاؤنگ اور کپنی کے لوگ اور سٹوڈیو کے لوگ یعنی سب لوگ ان سے ناخوش رہتے تھے۔ اور کبھی ٹھک بھی ہے۔ بے عقل، بے دماغ، بے وقوف بھری جیسے لوگ عورت کہتے ہیں۔ آخر کس لئے ہے؟ گجرانج سنگھ کو ان تمام غامیوں کا پتہ تھا۔ مگر وہ کہتا۔ دیکھو، اتنا تو ہوا، اب ہوسے ہوئے اس سے آگے بھی کچھ جو جائے گا۔ ایک دن میں ترکیبی نہیں بن سکی۔ ایک دن میں تو رام نے بھی سیتا کو دن سے نہیں جیت لیا تھا۔ پھر — میں تو ایک معمولی آدمی ہوں ۛ

گجرانج نے رضیہ کو دفتر کے اندر آتے ہوئے دیکھ کر زور کا قہقہہ لگایا۔ اور اُسے کاغذ کا ایک پتہ دکھا کے کہنے لگا: ایک اور کپنی تیرے ہاتھ سے گئی ۛ

”کیا ہوا؟“ رضیہ بڑے مطمئن لہجے میں بولی۔

”یہ چند اہلکار پر واکشن والوں کی طرف سے نوٹس آیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ اُن کی کپنی میں ایکسٹرا لوگوں کو بھیجے وقت رضیہ کو کبھی بھرتی نہ کیا جائے ۛ

رضیہ سکرٹری نائب تک کوئی پندرہ کہناں اُسے اپنی ٹیک اسٹ پر رکھ چکی تھیں۔ گجرانج نے رضیہ کو بھلاتے ہوئے کہا: ”تو ایسا کیوں کرتی ہے رضیہ؟“

مگر رضیہ کیا بڑا کرتی تھی۔ وہ بھی کرتی تھی نا۔ کہ جب کبھی اُسے کسی فلم کپنی میں کام ملتا اور چونکہ وہ بہت خوب صورت تھی۔ اس لئے اُسے جلدی کام ملی جاتا۔ اور پھر ڈائریکٹر اُسے انتخاب کرتے جو اُلگ سے اپنے کمرے میں بلا کر اُسے ایک بہت عمدہ۔ بہت انچائمی میں ہیرڈن سے کچھ ہی کہہ دے کہ ریل دینے کا وعدہ کرتے۔ اگر! اور اب اس ”اگر“ کے نو دم ہی جواب ہو سکتے تھے۔ یعنی ایک تو جوتا

پھر وہ کمرنگ سٹک سے مخالف ہونے لگا۔ لڑنے پندرہ روپے۔ لڑاکا خوب صورت ہے۔ مگر کویت ہے۔ مگر وہ اس کی مادری زبان ہے۔ اول درجے کا کارڈ بنا دو۔ تمہیں زندگی بھر دعا دے گا۔

کارڈ لے کے عشرت باہر نکلا۔ تو رضیہ نے اس کا تعارف دو چارہ دوسرے ایکٹرباکیوں سے کرادیا۔ اور پھر شرکے رضیہ سے کہنے لگی: ”وہ تو بہار پر ڈکشن والوں نے بلایا ہے۔ انہیں ڈانس کی کچھ لڑکیاں چاہئیں۔ چلو“

رضیہ نے عشرت سے کہا: ”میں ملتی ہوں۔ اب تم خود گھر آ جاؤ گے؟“

”ہاں!“

رضیہ جب چلنے لگی۔ تو عشرت اس کے پیچھے دھڑا دھڑا گیا۔ رضیہ نے پوچھا: ”کیا بات ہے؟“ ”ایک عشرت خاموش کھڑا رہ گیا۔ رضیہ نے پھر پوچھا: ”کیوں برو کیا بات ہے؟“ ”خڑبڑی مشکل سے عشرت نے کہا: ”وہ میں کا کراہ ہے۔“

رضیہ نے عشرت کو ایک اٹھنی دی، تھنی دیتے ہوئے رضیہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ”بے چارہ!“

بعد میں میں میں جیٹہ کر فو بہار پر ڈکشن کی طرف جاتے ہوئے رضیہ نے رضیہ سے کہا: ”کم نعت پر زیادہ ترس نہ کیا کر۔ مر جائے گی۔“

”کیا کروں؟“ رضیہ بولی: ”مجھے لے جاوے پر بٹارم آتا ہے۔“

رات کو جب رضیہ ڈانس کی پرہیزگار کے بعد گھر لوٹی تو عشرت ابھی تک آیا نہ تھا۔ مالدار لیاہ رنج چکے تھے۔ رضیہ کچھ پریشان سی ہو گئی۔ کہاں گیا۔ بھی میں فو اراد ہے۔

لیا ہو۔ مگر یہاں پہنچی نہیں۔ پھر اس کے دل میں رضیہ کی باتیں گونسنے لگیں عجیب عجیب طرح۔

دوسرے اور شیعہ مل میں آنے لگے۔ رضیہ ٹھیک ہی کہتی ہے۔ ان مردوں کا کوئی بھروسہ نہیں۔ بارہ بج گئے۔ ایک بج گیا۔ دو بج گئے۔ رضیہ فرش پر بیٹھی اپنے کمرے میں انتظار کرتی رہی۔ ایک کونے میں اس نے عسرت کے لئے تھک اور چادر بچا دی تھی۔ فرش کو خوب بھاڑوں سے صاف کیا تھا۔ ٹبے میں اس کا کھانا بند کر کے رکھ دیا تھا۔ آٹا کو روشنی میں خیند نہیں آتی۔ اس لئے اس نے بقی کل کر دی تھی۔ مگر رضیہ کی آنکھوں میں خیند نہ تھی۔ بھلا خیند کیوں نہیں آتی۔ وہ کیوں ایک اجنبی کا انتظار کر رہی ہے۔ وہ کون ہوتا ہے اُس کا۔ وہ تو کچھ بھی نہیں جانتی اس کے متعلق۔ جلنے سے کیا ہوتا ہے۔ اسے اپنے متعلق اتنا کچھ معلوم تھا۔ ایک شریف مسلم گھر نے کی بیٹی۔ باپ چھوٹا سا جاگیر دار۔ مگر میں ایک موٹر۔ آپا کے ہاں لڑکا کوئی نہ تھا۔ پہلے ایک لڑکی ہوئی جو میاں دی گئی۔ پھر بہت مدت کے بعد رضیہ ہوئی۔ مگر آپا نے مجھے لڑکا ہی سمجھا۔ ہمیشہ لڑکوں کی طرح ہی رکھا۔ فقیص میں اور پا جائے میں اور ترکی ٹلیا میں۔ مجھ سے مردوں کی طرح باتیں کرائیں۔ پھر آپا مر گئے۔ وہ موٹر بھی چلی گئی۔ وہ مکان بھی چلا گیا پھر بڑی بہن کا شوہر مر گیا اور آپا رضیہ کو اور بڑی بہن کے پانچ بچوں کو لے کر حیدر گورڈہ کے ایک چھوٹے سے غلیظ مکان میں چلی آئیں جس کے آٹھن میں جام کا ایک پیڑ تھا۔ آپا نے ایک بہت ہی خوب صورت مرد سے رضیہ کی شادی کر دی۔ اسلام آنکھوں میں نہیں تھا۔ اب ایک بڑے جاگیر دار کا لڑکا تھا۔ اچھا ہے، شادی اپنے خاندان میں ہوئی۔ لڑکا اپنے خاندان کا ہے، گوا اور ہے۔ بڑپن ہے۔ اور بے کار ہے۔ مگر بے تو اپنے خاندان کا۔ خاندان کی عزت رہ گئی۔ آپا نے بڑا شکر ادا کیا اور کسی کسی دغا کی ہے۔ اللہ اس جوڑے کو خوش رکھے۔ چند دن تو یہ جوڑا غوش ہی سا۔ مگر پھر پولیس انکشن ہو گیا۔ اور اسلام کے پاس چونکہ کوئی کام نہ تھا۔ اور اس لئے وہ رضا کا دل میں بہتا رہ گیا تھا۔ اس لئے پولیس انکشن میں وہ شہرت باہر بھاگ گیا۔ تندو مٹی میں۔ مگر تندو مٹی میں بھی پولیس انکشن ہوا۔ چنانچہ اسلام مار گیا۔ مگر والوں کو اس کی لاش نہیں ملی، مگر موت کی خبر مل گئی۔ رضیہ

بہت بدلتی دھڑکتی۔ حالانکہ مرنے سے چند ماہ قبل اسلم نے اُسے ایک بہت ہی بڑی "خفیہ" بیماری عطا کی تھی۔ جو وہ کسی "باہر والی" سے لے کے آیا تھا۔ رضیہ تو کل شرکے کو لڑکھوئی ہوتی۔ مگر رہاں کو ہر وقت پتہ نہ چل جاتا۔ اور حیدر بگ کوڑے کے حکیم سلطان صاحب الزہرا و ہمدردی اس کا شافی علاج نہ کرتے۔

پھر کبھی اتنے علاج کے بعد بھی رضیہ کی رجحت جو پہلے گندی تھی، اب سادلی سی ہو گئی تھی اور اس کے چہرے پر اکثر دانے سے نکل آیا کرتے تھے..... پھر کبھی "۔۔۔ رضیہ اپنے خاوند کے مرنے پر روئی تھی۔ کچھ بھی ہوا اس کا خاوند جو تھا۔ اور لوگ کہتے تھے کہ اسے رونا چاہئے۔ حالانکہ اندر سے اسے اپنے خاوند سے سخت نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ مگر کیا ہو سکتا تھا۔ وہ روئی، اور پھر اسے فائے بھی کرنے پڑے۔ کیوں کہ وہ لوگ عزت دار تھے۔ اور پولیس انجیشن کے دنوں میں اور اس کے بعد بھی کئی دنوں تک گھر سے باہر نہ نکلے۔ آنگن میں جام کا بیڑ تھا۔ رضیہ کو یاد ہے۔ کئی بار سالن نہ ہونے سے اس نے فشک روئی کے ساتھ جام کے پھل کھائے تھے۔ پھر جام بھی ختم ہو گئے۔ اور گھر میں کچھ نہ رہا تو۔۔۔ ایک دن۔۔۔ بلکہ ایک شب رضیہ گھر سے نکل بھاگی۔ اور سید کی ایک طوائف کے پاس پہنچی۔ کیوں کہ وہ ایک شریف عورت دار گھر والے کی عورت تھی۔ اور اس نے اُسے کوئی کام نہیں کانا تھا۔ نہ وہ چاول کوٹ سکتی تھی۔ نہ برتن صاف کر سکتی تھی۔ اس نے وہ سیدی طوائف کے پاس گھٹی۔ اور پھر جب اُس نے کھاک کو دیکھا تو لوٹ آئی۔ جانے کیا ہوا۔ کیوں اس کی مدد نے اس کے جسم نے اس کی بستی کے ذرے ذرے لے اس کام سے ایسی بغاوت اختیار کر لی کہ رضیہ مجبور ہو کر روئی ہوئی وہاں سے واپس آ گئی۔ اُسے معلوم ہو گیا۔ کہ وہ یہ پیشہ اختیار نہیں کر سکتی۔ اور جب اس نے یہ دیکھا کہ وہ کتنی عورتوں کا یہ دھند بھی نہیں کر سکتی تو پھر وہ اپنی ماں کے صانع مشورہ کے خلاف پردے سے باہر آ گئی۔

باہر کی دنیا میں! اس نے سوچا۔ وہ مردوں کی دنیا میں عورتوں کے لئے جگہ بنائے گی۔ اس لئے کہ اسے زندہ رہنا ہے۔ اور چونکہ اب وہ طواغیت بھی نہیں بن سکتی تو اسے لامحالہ ایک نئی عورت کی طرح رہنا ہوگا۔ کوئی نہ کوئی کام کرنا ہوگا۔ مگر حیدر آباد میں رہ کر اپنی برادری کے اصولوں کو توڑ کر۔ وہ برادری جو اس کے لئے کچھ کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ وہ رہ کیسے سکتی تھی۔ کام کیسے کر سکتی تھی پھر گی ریڈیو پر اسے کچھ کام مل گیا۔ ایڈیڈیو پر اس کی واقفیت پولیس ایجنٹ کے دنوں میں ہوئی تھی جب اس نے اپنے خاوند کی تقلید میں ریڈیو پر ایک ڈرامے میں کام کیا تھا۔ اور حیدر آبادی زبان میں مردار پیشیل کے خلاف ایک فخر بھی لکھا تھا۔ قیمت ہے کہ اب ریڈیو والوں کو اس کا کچھ پتہ نہ تھا کیوں کہ بہت سے پُرانے لوگ چلے گئے تھے۔ اور نئے لوگ آ گئے تھے۔ اور یہ نئے لوگ کہتے تھے۔ غدا بیٹے خوشامد تھی کہ حقیقت کہ اس کی آواز بہت اچھی ہے۔ اس لئے اس نے چند ماہ ریڈیو پر کام کیا۔ اور جب یہاں بھی ایک صاحب نے اُس سے محبت ظاہر کی۔ جین کا شندھی محبت ظاہر کرنا تھا۔ اور جو محبت سے اپنا جی اس طرح بہلاتے تھے۔ جیسے لوگ فرصت کے اوقات میں باکی۔ فٹ بال۔ گیند یا چوسے اپنا جی بہلاتے ہیں تو رنیر کو اس محبت کے لحاظ سے ایک عجیب کراہیت سی پیدا ہوئی! اس کی رگوں میں بھی یہی محبت کا زہر باقی تھا۔ جو اس کے شوہر نامدار نے اُسے دیا تھا اپنی جلدی وہ کسی دوسری جگہ کیسے محبت کر سکتی تھی۔ ناچار رنیر کو حیدر آباد چھوڑ کر کبھی آنا پڑا۔ اور فلم کمپنیوں کا سہارا لینا پڑا۔

جاگتے جاگتے صبح ہو گئی۔ اس رات رنیر نے اپنی ساری زندگی بھر سے چڑھ ڈالی جسے وہ کئی بار بڑھ چکی تھی۔ وقتی طور پر اس کے دل میں جو لوزش پیدا ہوئی تھی اچھ کے کہنے میں جو ایک آنسو سا چھلایا تھا اندھیرے میں کہیں سے جو روشنی کی ایک کرن آئی تھی۔ اس کے بازوؤں میں جو ایک اُمید سی کسمائی تھی۔ بیک وقت وہ اس کے اعصاب میں ٹوٹ ٹوٹ سی گئی۔ وہ اپنے جسم کے بند بند میں اُسے لٹاتا ہوا دیکھ سکتی تھی۔ سن سکتی تھی، چمک سکتی تھی۔ ہائے کشادہ دالہ تھا۔ مگر زندگی تو ہوتی

ایسی ہی ہے۔ ہزاروں آدمیوں کی زندگی۔ لاکھوں کروڑوں آدمیوں کی زندگی۔ خوب صورت سہنا تو ایک انحرافی کی طرح جوتلے۔ اور سر سے پاؤں تک سارے اعضاء کو چھوڑتا ہوا چلا جاتا ہے مگر چلا جاتا ہے۔ اور پھر کبھی نہیں آتا۔ عشرت کی طرح۔
 رقیہ کا جسم گندے آنے کی طرح کچا کچا سا ہو رہا تھا۔
 یکایک دروازے پر دستک ہوئی۔
 آنان نے دروازہ کھولا۔

عشرت دروازے پر کھڑا تھا۔۔۔۔۔ مسکرانا ہوا۔ جھبکتا ہوا۔ اندر آیا۔ سیدھا رقیہ کے پاس۔ اس کے چہرے پر میک اپ کے نشان تھے۔
 عشرت نے کہا ”بھے رات کے لئے ایک میک اپ لگایا تھا بولنے کا پارٹ تھا بہتر لپے کا۔ پہلے نے پانچ روپے کھانے کے لئے ایڈوانس دئے۔۔۔۔۔“ عشرت ترک گیا۔ پھر اس نے اپنی مہرلا میں سے ٹٹول ٹٹول کر پانچ روپے کا ایک ٹمٹانا بوسیدہ سافوٹ نکالا۔ اور اسے رقیہ کے ہاتھ میں نظریں نیچے کر کے دے دیا۔

رقیہ کا دل کانپنے لگا۔ اس ہلکے سے کمزور ٹوٹ کی طرح۔ جو اس کی آنکھوں میں کانپ رہا تھا۔ اس کے رد میں روئیں میں خوشی کی لہریں دوڑ گئیں۔ اس کا جی چاہا۔ کہ وہ عشرت کا سر جھکے اپنے سینے پر رکھے۔ جواب اس طرح ایک گناہ گار کی طرح اس کے سامنے آتھیں۔ بچے کے کھڑا تھا۔ مگر اس نے اپنے آپ پر ضبط کر لیا۔ اور بڑے تحمل سے بولی ”تمہارے لئے کھانا رات بھر سے رکھا ہے“ اس کے بعد چوٹے کی طرف کھانا گرم کرنے کے لئے چلی گئی۔

جب اکرم کے دن اپنے تھے۔ وہ کار میں رہتا تھا۔ کماریں اس کے پاس چار کر رہے
 کا ایک عمدہ فلیٹ تھا۔ فلیٹ میں غلیچے تھے۔ عمدہ فرنیچر تھا۔ ریڈیو گراموفون، ریفریجریٹر، ٹیلی فون، چاندی کے
 برتن، کتابوں کی لائبریری۔ سبھی کچھ موجود تھا۔ اس کی بادیامی رنگ کی ڈائج اُسے اپنی جان سے بھی پیاری
 تھی۔ مگر جب اس کی تصویریں ناکام ہوئیں۔ اور جب پینٹریوں میں۔ ڈسٹری بیوٹروں اور فنانسروں نے
 اس کی سماجی مقصدیت کو روپے کے ترازو میں تولاد۔ اور اس میں بہت کم وزن پایا۔ تو انڈسٹری نے
 دھیرے دھیرے اُس سے ہاتھ کھینچ لیا۔ دھیرے دھیرے اس کی فلیٹ کی چیزیں جنہیں اُس نے شہائی
 شوق سے خریدا تھا۔ قرضے میں اٹھنے لگیں۔ ریڈیو گرام گیا۔ ریفریجریٹر گیا۔ چاندی کے برتن گئے۔ آخر
 میں ڈائج کھڑی بھی گئی۔ کتابیں اس نے آخر تک بچا کے رکھیں، مگر جب وہ فلیٹ کا کرایہ دس ماہ تک
 مسلسل نہ دے سکا تو ایک مکان نے جو غیر معمولی طور پر شریف تھا۔ اس کی کتابوں کی لائبریری اپنے
 قبضے میں کر لی، اور اسے فلیٹ سے نکال دیا۔ اور اس سے کہہ دیا کہ جب بھی وہ فلیٹ کا کرایہ
 ادا کر دے گا۔ اُسے اُس کی کتابوں کی لائبریری واپس مل جائے گی۔

اس بات کو آج دو سال ہوئے کو اُسے۔ اکرم ابھی تک اپنی کتابوں کی لائبریری نہ چھوڑ سکا

تھا۔ اپنی کتابوں کے چمن جانے کا اُسے انتہائی غم تھا۔ اب وہ گھارے پرل میں آگیا تھا۔ جہاں اس کی بڑی بہن رشیدہ جو یہودی تھی اور مسلم گرل اسکول بائی کلاس میں اسی روپے میں شجر تھی۔ اپنے تین بچوں کے ساتھ ایک کمرے میں رہتی تھی۔ جگہ بہت کم تھی۔ کیوں کہ اسی کمرے میں بچے سوتے تھے رات بھر اڑتے اور پڑتے تھے۔ اسی کمرے میں رشیدہ کھانا پکاتی تھی۔ اپنے بچوں کے کپڑے سیتی تھی۔ کپڑے دھوتی تھی۔ کمرے کے کونے میں ایک ٹی تھا جس کے گرد دوفٹ اپنی دیوار تھی جو پرے کے لئے لٹا ہوا تھا۔ ناچار رشیدہ نے پردہ ٹانگ کر کچھ تھوڑا سا انتظام کیا تھا۔ کمرے سے لگی ہوئی ایک بالکونی تھی۔ اگر وہی بالکونی میں سوتا تھا۔ یہیں پر اس نے اپنے کپڑوں کا ٹرنک اور چند کتابیں ایک ریک پر رکھ لی تھیں۔ بالکونی میں کھلی ہوا آتی تھی۔ اور سونے کے لئے بہت عمدہ جگہ تھی۔ اور اس کے سامنے کی بلڈنگ کی درجنوں ایسی بالکونیاں تھیں۔ جہاں زندگی۔ اس کی اپنی زندگی کی طرح دھڑے اور پرنگی یا سرت ایک بنیان پہنے ہوئے نظر آتی تھی۔ آدمی کپڑے پہن کر کچھ اور ہی بویا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے اُس کے احساسات اور خیالات اور جذبات نے بھی ایک غلامت پہن لیا ہو۔ لیکن بالکونی میں آدمی کپڑے اُتار کر خالی ایک بنیان اور تہہ پہنے یا ایک باڑی یا بچی کوٹ پہنے۔ گرمیوں میں پتھلا جھلٹے ہوئے یا برسات کے دنوں میں ٹاٹ کا بویا یا بندھے ہوئے کچھ اور ہی نظر آتا ہے۔ دوسرے انسانوں کے ساتھ قریب اس قدر بے شکم طور پر ساری کو اُسے حیرت ہوتی تھی کہ آج تک کسی صبح کو انسانی مساوات کا ثبوت دینے کے لئے بالکونی کی مثال دینے کا خیال کیوں نہیں آیا۔ جہنم کی بالکونی میں ایک فلسفی رہتا تھا۔ پانچ نمبر میں ایک بل مزدور رہتا تھا۔ چار نمبر میں وہ خود ایک فلم ڈائریکٹر رہتا تھا۔ تین نمبر میں ایک ٹریڈی رہتا تھا۔ دو نمبر میں ایک اخبارچیجے والا رہتا تھا۔ ایک نمبر میں ریلوے کا ایکسٹنٹیو رہتا تھا۔ لیکن جب یہ لوگ بالکونی میں تہہ یا دھوتی پہنے۔ بنیان یا بنیان کے بغیر کھڑے ہوئے تھے یا اپنے بچوں بچوں سے باتیں کرتے تھے یا دانت لہختے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ تو اس قدر ایک ہی صف میں

اُٹھائے ہوئے دکھائی دیتے تھے کہ امتیاز سن توڑا جانا تھا۔ پتہ نہیں سیاست دانوں نے جنگ کے بجائے مزاح سے فاسزم کو ختم کرنے کا طریقہ کیوں نہیں سوچا۔

بالکونی کے مناظر دیکھتے دیکھتے اکرم کا پنختہ عقیدہ ہو گیا تھا کہ اگر کسی طرح جٹل کو نچکا کر کے یا اُسے صرف ایک بیان اور ایک انگوٹ یا تہہ پہنا کے ایک بالکونی میں کھڑا کر کے لاکھوں آدمیوں کے سامنے نظر پر کرنے کے لئے کہا جاتا۔ تو فاسزم اسی دن ختم ہو جاتا۔ لوگ ہنسنے ہنسنے مہرے ہو جاتے۔ اور جب وہ اپنے سینے کے اُلجھے ہوئے بالوں پر اپنا ہاتھ رکھ کے اپنی بھر مار کو بوجھ کو ہلاتے ہوئے یہ کہتا جرسن آریائی نسل دنیا کے انسانوں کی بہترین نسل ہے۔ تو خود جرسن لوگ ٹائٹل اور گندے انڈے پینک پینک کے اس کا بُرا حال کر دیتے۔ مصیبت تو یہ ہے کہ اس قسم کی باتیں جیسے ٹرے بچے چوئے پیٹ فارمول پر بنیاد کی روشنیوں میں۔ درجنوں ٹائٹل فون کے سامنے تھے کلکے لگے فوجی وردوں سے ملبوس سینوں سے نکلتی ہیں۔ پھر میڈیکل جتے ہیں۔ مارچ ہوتے ہیں۔ ٹینک چلتے ہیں۔ لاکھوں آدمی قتل ہوتے ہیں۔ پھر کہیں جاکے ریفرنڈم دیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس کام کے لئے صرف ایک بالکونی کافی ہے خدا جانے انسانوں کو کب عقل آئے گی؟

مگر آج تو وہ خود یہ سب کچھ نہیں سوچ رہا تھا آج تو وہ خود بالکونی میں اونٹن دھانسنے کے جٹیا تھا اور رشیدہ اُسے دور سے آکے جگا گئی تھی۔ وہ اولیٰ آل کر کے پھر اونٹن دھا ہوا تھا۔ رشیدہ ایک ڈوبی پتی عورت تھی۔ رنگت بے حد زرد۔ لیکن آنکھیں بڑی بڑی اور سیاہ۔ اُن آنکھوں کو دیکھ کر ایک عجیب قسم کی عجیدہ فرحت کا احساس ہوتا ہے۔ ہونٹوں کے کنارے ہر وقت مسکراتے رہتے ہیں۔ مگر کوئی بے فکر مسکراہٹ نہ تھی یہ تو ایسی مسکراہٹ تھی جس نے دنیا کے سارے غم دیکھ کر اس پر رونے کے بجائے ہنسا سیکر دیا ہو۔ یا شکر کرنا سیکر دیا ہو۔ رشیدہ کا لہجہ بڑا ملائم تھا۔ اور غلیظ تھا لیکن اس لہجے کے اندر کتنے تیز کاٹے چھپے ہوئے ہیں۔ اس کا احساس بہت ہی ذہین لوگ

کر سکتے ہیں۔ اور کبھی کبھی وہ بھی آئے کہ کہہ کے رہ جاتے، کیوں کہ انہیں بعد میں پتہ چلتا کہ رشید چلے گئے۔
 ملائم اور نرم لہجے میں کسی تیزیات کہہ گئی۔

رشید نے پوچھا: ”دور تر جھگاچی ہوں آکے اُٹھو گے نہیں؟“
 ”نہیں!“ اکرم دین پاگلونی میں اندھا پاڑا پڑا ہوا۔

”جوشی جی کی پچر کا جھوٹ ہے اس لئے؟“

”کیا مطلب؟ کیا مطلب؟“ اکرم جلدی سے اُٹھ کر بولا ”مگر رشید نے کوئی جواب نہ دیا، اس وقت اپنی دلی ہوشیاری اور قیاس نگینی پر مانگ رہی تھی، اور اب نئے میل کوئی پر نہیں لانے کے لئے جاری تھی۔

رشید نے کچھ نہیں کہا۔ مگر یوں تو اس نے سب کچھ کہہ دیا تھا۔ وہ واقعی آج بستر سے اُٹھنا نہیں چاہتا تھا۔ جوشی جی کی پچر کا جھوٹ تھا۔ گو سیٹھ ہاتھ لگاتے اس کی پچر کا جھوٹ کرنے کا وعدہ کیا تھا مگر۔ وعدہ جلتے کب سے مٹتا آ رہا تھا۔

”اور جلتے کب تک ٹلے؟“ رشید نے پوچھ کر بول کر نہ ہلاتے ہوئے بولی ”کیا؟ کیا؟“ اکرم نے غور سے ہو کے کہا۔ رشید کبھی کبھی اس کے اُٹھے ہوئے خیالات کو یوں پڑھ لیتی تھی۔ جیسے وہ آدمی نہ ہو بلکہ کھلی ہوئی کتاب ہو۔

اکرم نے کہا ”تم چلے بناؤ۔ میں ضرور جاؤں گا“

رشید کبھی بھی چاہتی تھی۔ مگر نہیں چاہتی تھی کہ اسے یوں صاف صاف کہنا پڑے۔ اس نے جلدی سے چلے تیار کی۔ بستے میں اکرم بھی ہاتھ منہ دھو کر قیاس اندیشیوں پہن کر تیار ہو گیا۔ جب اُس نے چلنے لگی۔ تو رشید نے ایک اٹھنی اس کی پیٹلی پر رکھ دی۔

اٹھنی کو دیکھتے ہی اُسے یاد آیا کہ کتنے دنوں سے وہ رشید سے وعدہ کر رہا تھا کہ وہ پیٹلی سے

اپنے گھر کے لئے کچھ رقم مانگے گا۔ مگر وہ کیا کرے۔ اس کی پچھری شروع نہیں ہو رہی تھی۔ اور جب تک پچھری شروع نہ ہو جائے۔ وہ سیٹھ سے رقم مانگتے ہوئے ٹوٹتا تھا۔ شروع شروع کے تین چار ماہ تو اس نے تنخواہ مانگ لی تھی۔ لیکن اب گزشتہ پانچ ماہ سے اس نے سیٹھ سے ایک پائی طلب نہیں کی تھی۔ پہلے تو یہ خیال رہا کہ سیٹھ خور سے دیکھے گا۔ اور جب سیٹھ نے تنخواہ نہ دی تو اکرم نے سوچا اچھا ہے۔ سیٹھ میری پچھری کسی طرح شروع کر دے۔ پھر کتنی رقم مانگ لوں گا۔ اب پچھری شروع نہیں ہو رہی تھی۔ اور تنخواہ بھی نہیں ملتی تھی۔ ایسے کیسے کام چلے گا۔ رشیدہ کی نگاہ کہہ رہی تھی۔ تو کب تک بہن کے آسرے پر...؟
 ”نہیں نہیں“ اکرم بولا میں آج ہورت کے بعد ضرور سیٹھ سے بات کروں گا۔

رشیدہ کچھ نہ بولی۔ کئی بار اکرم نے ہتھ کیا تھا وہ سیٹھ سے بات کرے گا۔ مگر بات کو وہ اس طرح نہ نکالے ہوئے واپس آجائے گا کہ رشیدہ بھر کچھ نہ کہہ سکتی۔ کاشش! وہ کچھ کہہ سکتی۔ کاشش! اس نے زندگی کو اس طرح نہ سمجھا ہوتا۔

کسی فنریہ مسکراہٹ تھی رشیدہ آپا کی! جیسے کسی نے زندگی کے سارے دکھوں اور تکلیفوں مصیبتوں اور صعوبتوں کو کشید کر کے اُن کا عطر نکال لیا ہو۔ اور اُسے ایک دلکش قہقہہ کی صورت میں رشیدہ کے ہونٹوں پر پھیلا دیا ہو۔ ایسی بھی بھلائی مسکراہٹ ہوئی۔ اکرم بھی کبھی تو اس سے پریشان ہو جاتا۔ مجھے مسکراہٹ قطعی پسند نہیں۔ اس قدر سوچو بوجھ رکھنے والی۔ ہر بات فوراً سمجھ جالے والی جیسے تو تنہا کی مسکراہٹ پسند ہے۔ اُٹھ، فروغی، سلی۔ بے فکر مسکراہٹ، فضا میں اڑتی ہوئی تکی کی طرح خوش خوش رنگ۔ یہ مسکراہٹ۔ جو کچھ سوچتی ہی نہیں۔

رشیدہ نے کہا ”ہورت میں ضرور جاؤ۔ ششاد بھی وہاں ہو گی؟“

اکرم نے پھر چونک کر اپنی بہن کی طرف دیکھا۔ رشیدہ پلٹ کر اپنے ننھے بچے معصوم کو گھات اور ملنے لگی۔ معصوم کے دونوں پیچھے دونوں میں غریبہ سرائیت کر چکا تھا۔ وہ بڑی شخص سے کھانس رہا تھا اکرم سر جھکا کے

کرے سے باز رہ گیا۔

”وہ کیوں بدل نہیں سکتا؟ وہ کیوں ”لڑکا یا لڑکی؟“ دنیا گول مٹول ہے، ملت مسخرے ایک بڑی نہیں بنا سکتا۔ وہ کیوں پہلی ملاقات ہے۔ دوسری کرامات ہے، ایسے معرے نہیں سوچتا۔ وہ کیوں انسان کی بھلائی کے چھپے ٹھونے گوم رہا ہے۔ وہ کیوں اپنی بھلائی کی نہیں سنا وہ کیوں لڑکیوں کو لے کے جوہر نہیں جاتا۔ وہ کیوں اس قدر خشک، متین اور سفیدہ بنا رہتا ہے کہ لوگ اُسے سوکھا ہوا لکڑی کہنے لگے ہیں، دنیا میں کیا وہی ایک انڈ کچوئل رہ گیا ہے۔ ٹٹے ٹٹے گنچسوں والے اوندھے داغوں والے۔ انٹی کو پڑیوں والے انسان یہاں بستے ہیں۔ جن کی تجزیوں میں بھی لاکھوں دوسرے ہیں وہ کیوں سماج کی بھلائی کے لئے تصویریں نہیں بناتے، صرف تجلی چھوڑی بے چھپاتیں کر کے پھلنے والی عرسلی اور کوٹے مشکافے والی کلاوے کر اپنا گھر بھر رہے ہیں۔ اور ایک تم ہو میں اکرم کہ سارے جہاں کا وہ اپنے دل میں لئے فلتے کر رہے ہو۔ میاں کچھ عقل کے ناخن کو....

وہ ملتے میں ایک راہ گیر سے ٹکرا گیا۔ راہ گیر گھور کے اُسے دیکھنے لگا۔ اکرم نے جلدی سے کہا ”ساری“ ”ساری کا تپہ؟“ راہ گیر غصے سے چلایا۔ مگر اکرم آگے بڑھ گیا۔ بات یہ ہے کہ اس سماج میں روکے اُسے اس سماج کے اصول کے مطابق کام کرنا ہو گا۔ اس قسم کی باتوں کے لئے جس قسم کی سیاسی کی ضرورت ہے وہ اس انڈسٹری میں قطعی نہیں۔ پھر خالی تصنیف سے دور۔ کیا کوشش کیوں کر رہا ہے۔ یہ حماقت نہیں تو اور کیا ہے، جوشی جی کی طرف دیکھو دم فوشروں جو بنگی۔ ان ڈومرو کا مہور ست کر رہے ہیں۔ تین تین ہیروئنیں کو ساتھ لئے پھرتے ہیں۔ اور ایک جناب اکرم ہیں کہ قوم کے غم میں بگڑے جاسے ہیں۔... چکر۔... چکر۔... اکرم نے سوچا چکر کیا نام ہے؟ عمو بڑھیا۔ ایک دم ہٹ! اکرم خوشی سے اُجھل پڑا۔ اور اچھلتے ہی کبلی کے کعبے سے ٹکرایا۔ اس پاس کے راہ چلتے ہوئے لوگ اس پر بس ٹپے۔ وہ تو خیر رہے ہوئی۔ دلچیت ٹوڈو قریب آ گیا تھا۔ اکرم جلدی سے اپنی خت چھپائے ہوئے

باتحسے لائحے کو رکھتے ہوئے دلچسپ ٹوڑیوں کے گیسٹ میں داخل ہو گیا۔

اکرم کو سرخیا کر کے چلنے کی بہت بُری عادت تھی۔ چلتے ہوئے آگے بچھے کچھ نہیں دیکھتا تھا اس اپنی دُمن میں غرق چلا جا رہا ہے۔ اکرم نے سوچا اب اسے اپنی زندگی کا سارا دُعا رابل دینا پڑے گا۔ آج سے وہ سُرُخا کے چلے گا۔ بڑے بڑے کے باتیں کرے گا۔ منہ پر گھونسا مار کے گالیاں بک کے پروڈیوسروں کو مرعوب کیا کرے گا۔ یہ لوگ خرافات سے بننے والے نہیں ہیں۔ ان کے سامنے قواسے دوسرا جوشی بھی بننا پڑے گا۔

شیخ نمبر تین میں مہورت تھا۔ مہورت میں ابھی پندرہ منٹ باقی تھے۔ مگر شیخ غلم خاں کی طرف سے پروڈیوسروں، فنانشروں، ڈسٹری بیوٹروں، دلالوں، ایکسٹرا کام کرنے والوں اور بچنے بچنے والے روٹے روٹے دھن سے بھرا ہوا تھا۔ غلم ڈسٹری میں ہر روز کہیں نہ کہیں مہورت ہوتا رہتا تھا۔ اس لئے بہت سے بے کار لوگوں نے یہی مشغلہ اختیار کر رکھا تھا کہ صبح کا ناشتہ مہورت پر جا کے کریں گے۔ لڑو تو کھانے کو مل ہی جائیں گے۔ یہ لوگ مہورت پر پہنچتے کھلاتے ہیں۔ اور کوئی بھی مہورت ہو۔ کہیں بھی مہورت ہو۔ انہیں کارڈ ملے نہ ملے۔ وہاں ضرور پہنچ جاتے ہیں۔ بلکہ زیادہ تعداد انہیں مہورتوں کی جوتی ہے۔ مہورت کی مددنی انہیں کے دم سے ہے۔ ورنہ کام کے آدمی تو دس بارہ ہی ہوتے ہیں۔

مہورتوں کی ٹوریوں میں گزرتے ہوئے سیٹھ باکھڑا اکرم کی طرف آ رہا تھا۔ اکرم کو بچہ واکر ایک کونے میں لے گیا۔ اور جلدی جلدی سرگوشی کرتے ہوئے بولا

”تھمادی پچر کا بھی آج ہی مہورت ہوگا“

”کب؟“

”ابھی۔ اسی دم۔ ایک ڈسٹری بیوٹر ایڈوانس دینے پر راضی ہو گیا ہے۔ ابھی چیک مل رہا ہے۔ تصویر کا

ہم بناؤ“

”چکر“

”چکر کیا؟“ ہنچو آریا غش کھاتے ہوئے بولا ”کئی قوی تصویر ہے؟“

”قوی تصویر کی ایسی قی“ اکرم گھونسا اٹھتے ہوئے بولا۔ اُس نے آس پاس دیکھا۔ لیکن اُسے میز نظر نہ آئی جس پر گھونسا مار کے وہ چیخا اور ناثر پیدا کر سکتا۔ ایک لمحہ کے لئے اکرم کے داغ میں خیال آیا کہ کہیں نہ وہ یہ گھونسا سیٹھ کے چٹروں میں گھسا دے۔ مگر پھر اُسے تہذیب کے خلاف بھوکے اُس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ اور گھونسنے والا ہاتھ بادل خواستہ نیچے کر کے بولا ”اے سیٹھ وہ کامیڈی دول کا۔ وہ کامیڈی دول کا کہ سالہ چار ملی جیلین بھی دیکھے تو غش کھا کے گر پڑے۔۔۔“

سیٹھ نے فدا اور دل چسپی سے مسموم کی۔ وہ ایک نئی نظر سے اکرم کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر اُس نے آہستہ سے کہا ”مگر اکرم بجائی۔ یہ چکر نام کچھ۔۔۔۔۔؟“

اکرم جلدی سے بات کاٹ کے بولا ”تو جانے دو۔ اور نام لوں۔ ہمیں کی اپنے پاس کیا کی بے خبر غش؟“

کیسا نام رے گا؟

”غیر غش کیا؟“ سیٹھ میرانی سے بولا۔

”غیر غش عرف تحن ٹوش“

”غیر غش؟۔۔۔۔۔ مگر اس کا مطلب کیا ہے؟“

”تم مطلب چھوڑو سیٹھ۔ سوچو۔ نام بولنے سے منہ بھرتا ہے کہ نہیں؟“

”ہاں۔“ ہنچو دینے سر ہل کے کہا ”منہ تو بھرتا ہے۔“

”منہ بھرتا ہے۔ تو ایک دن بخوری بھی بھرے گی سیٹھ۔ جلدی سے اعلان کرو۔ غیر غش کا“

اعلان کیا ابھی کرتا ہوں۔ ڈوسری ہیڈ رٹ سے چیک لیتا ہوں۔“ ہنچو دینے سر ہل کے بولے بولا ”کیا

م بتا؟“

تقریباً غرض؟

”غیر غرض... کیا پیتھاسی! (PHANTASY) ہے“

”اسے پیتھاسی کی ماسی ہے۔ سیٹھ، تم جا کے ڈسٹری بیوٹر سے بات تو کرو۔ وہ کہانی دوں گا کہ دماغ گھوم جاتے گا۔“

سیٹھ نے خوش ہو کر اکرم کی طرف دیکھا۔ اس کے خصلے پر ہاتھ رکھ کے کہا: ایسی بات تم مجھ سے پہلے بولنا تو اب تک تیار! کچھ شروع ہونے کے ختم ہو گیا ہوتا۔ پھر ڈھانک کر ماندہ اناج بچے میں اکرم کی پیچھے تھپکا کے بولا: ”مہورت کے بعد پانچ سو کا چیک لے کے جانا مجھ سے“

”بہت اچھا سیٹھ؟“

جوشی جی، راج لا تشارو۔ اسیا چہرہ رینکا کے درمیان کھڑے ہنس نہیں کے باتیں کر رہے تھے۔ اُن کا ہاتھ بار بار رینکا کی پتلی کمر کی طرف چلا جاتا تھا۔ سلور سکرین، موسیقی ہنوز کے کیرہ مین فوٹو لے رہے تھے۔ اکرم نے سوچا: باآؤب، با ملاحظہ ہو مشیار۔ اب میری باری آئی ہے! بیٹا جوشی۔ میں اپنی فلم میں پچاس لاکھوں کا ڈانس رکھوں گا۔ ڈیڑھ لاکھ کا ایک ہی سیٹ بنواؤں گا۔ دیکھے جاؤ... ایسا نیا چہرہ۔ ایسا نیا چہرہ لادوں گا کہ دیکھتے ہی عشق عشق کر اٹھو گے۔ اور جب اکرم کو نئے چہرے کا خیال آیا تو اس کے ذہن میں ولایت علی کا چہرہ گھوم رہا تھا۔

جب ولایت گج کو اکرم نے پہلی بار دیکھا۔ وہ گلانی رنگ کے ہر اشوٹ سلک کی قمیض اور سفید سانن کی شلوار پہنے اور سیاہ سلک کے برقعے کا نقاب اٹھائے گرانٹ روڈ ٹیشن پر گاڑی کا منتظار کر رہی تھی۔ دوپٹی نکڑ میں بجانپ گیا کہ یہ پنجابی لڑکی ہے اور بمبئی میں نئی آئی ہے۔ ورنہ اس کے رخساروں پر یصیب کی سی جگہ نہ ہوتی۔ اور وہ اپنے برقعے کو یوں لئے دئے نہ پھرتی۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان لڑکا بھی جس کا رنگ بے حد گورا تھا نقش بھیگتے تھے۔ لیکن بے حد نامزدوں۔ بمبویں کمان کی طرح۔ آنکھیں باوام کی سی۔ ہونٹ چمکے ناک تلوار کی دھار کی طرح۔ تمام نقوش اپنی جگہ انفرادی حیثیت سے خوب صورت تھے لیکن اس کے چہرے پر لکے ہوئے عیب غیر مناسب ترتیب کا اظہار کر رہے تھے۔ ولایت گج کے ساتھ کھڑی ہو کے وہ اپنا برصورتی کو نمایاں اور ولایت گج کے حسن کو مد چند کر رہی تھی۔ جب تک گاڑی نہیں آئی ۵۰ ان دونوں کے قریب کھڑا ہوا ان کے جسمانی تضاد کا اندازہ لیتا رہا۔ یکایک کسی بات پر ولایت گج ہنس پڑی۔ اور اُس کے بے حد سفید اور متناسب و انت ویر تک اکرم کے ذہن میں چمکتے رہے۔ اور اس کی عالم شوائی تو از دیر تک اس کے دل کے گوشوں میں گونجتی رہی۔ پھر گاڑی آگئی اور وہ دونوں لڑکیاں تلسے توب میں چلی گئیں۔ اور اکرم پلٹ کر کتابوں کے مثال پر چلا آیا۔ کیوں کہ اب اُسی گاڑی میں ایک

الگ ڈبے میں بیٹھ کر جانے سے اُسے بڑی کوفت ہوتی۔

غیر غرض کے بہت کے کچھ دنوں بعد اکرم نے ولایت بیگم کو اسی گلابی پیراشوٹ جسکے قبضے میں وہ بیٹھ کر سوار ہوئی اور اس میں دلچسپی سے بیٹھ کر باہر کھڑے دیکھا۔ اکرم گاڑی میں تھا۔ اس نے سڑک سے ہلے بھر کے لئے دیکھ سکا۔ پھر وہ سڑکوں میں چلا گیا۔ اور دفتر میں آئے ہی اُس نے اپنے ہاں کے ایک سٹرا پہلائی کرنے والے دارا کو بلایا اور اُس سے کہا کہ دلچسپی سٹوڈیو کے باہر اس دس قطع کی لڑکی کھڑی ہے اور بیشتر اس کے کردہ کہیں اور جانے اور یا اگر وہ راج محل سٹوڈیو میں چلی گئی ہو تو تم اسے کسی طرح گھر کے پہنچاؤ کے لئے اپنے ہاں لے آؤ۔ دارا اس معاملے میں جراتور تھا۔ اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں اس کے چہرے پر جھپک کے داغ تھے۔ اس کا سر آگے سے چھوٹا اور پیچھے سے بڑا تھا۔ اور اپنے چھوٹے قد کی وجہ سے وہ قند سے دیکھنے میں بالکل نئی چوہا نظر آتا تھا۔ مگر لڑکیاں پہلانے میں بے حد مشاق تھا۔ وہ چند منٹوں میں ہی ولایت بیگم کو اکرم کے پاس لے آیا۔

ولایت بیگم کے ساتھ وہی گورے رنگ کی بد صورت لڑکی تھی۔ اور زمانہ الطوار والا ایک لڑکا جو شکل و صورت سے ولایت بیگم کا بھائی معلوم ہوتا تھا۔ ایک بار جب بھاری بھر کم، تن آسان عورت تھی۔ جن کی گھریلو کج دادرسکراہٹ میں خستہ طرز کے کئی پہلو تھے۔ یہ عورت ولایت بیگم کی ماں تھی۔ جوانی میں ولایت بیگم سے کہیں زیادہ حسین ہوگی۔ ایک ادیب نے لکھا کہ وہی عورت جو بڑی بڑی مونچھیں رکھتے ہوئے تھا۔ اور نکلا اور عجیبی پسینے ہوئے تھا۔ اس نے اپنے دائیں ہاتھ کی پٹیلی پر ہم اللہ کھدار کھا تھا۔ اُس کا نام جلال الدین تھا۔ لڑکے کا نام شفیع اور ادیب نے لکھا کہ عورت کو وہ سب لوگ بے بے کہتے تھے۔ گورے رنگ کی بد صورت عورت کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ شفیع اسے "جان کہتا تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ شفیع کی بیوی ہے۔ لیکن شفیع سے کہیں بہتر مردانہ اوصاف رکھتی تھی۔

بات چیت جان لے کر شفیع کی بولی "سلام اے" پھر ذکر ولایت سے کہنے لگی "خاکہ کیراں

انہیں سلام کرو“ ولایت بگم نے اپنی کھلائی ہوئی آنکھوں سے اکرم کو ایک بار دیکھا۔ پھر شمس کو منہ پھیر دیا لیکن اکرم اب بھی اس کا رخ دیکھ سکتا تھا۔ وہ تیز ٹیکھا سر سی ونبالہ، وہ پلکوں کی گھٹی صفت اور اس کے نیچے وہ سنہری سنہری دھت۔ رخصتوں کی جہاں کوئی غار نہ تھا، موت شبنی شفاف چمک تھی۔ اس کی جھکی نگاہیں جھکی پیروں پر پڑیں، اور پھر ولایت نے جلدی سے اپنے خوب صورت ٹخنے چھپائے۔

جان بولی ”آپ نے ہم کو بلایا ہے؟“

”جی“

”پھر میں کام کرنے کے لئے“

”جی“

”رول کیا ہوگا؟“

”ایک چھوٹا سا رول ہے۔ مگر بہت اچھا ہے“ اکرم نے جواب دیا۔

تو چلو چلیں ”جان کر سی“ اٹھتے ہوئے بولی ”ہماری ولایت بگم تو صرف بیرون کا رول کے گئے“

”پہلے کہیں کام کیا ہے“ اکرم نے پوچھا

جان بولی ”لاہور میں لنگی بیابان مرہمہ دکن کا کام کیا تھا بعد میں ڈائریکٹر سے جھگڑا ہو گیا وہ مولا اس سے تعلق چاہتا تھا۔“

ولایت بگم نے سیاہ برتنے کی اوٹ کا سہارا لیا۔

جان بولی ”چلو چلیں“

کوئی نہیں بلا۔

اکرم نے کہا ”بیٹھے، بیٹھے“ جان بیٹھ گئی، شلیف ایک خرخ رول مال کرا چنا منہ پوچھنے لگا۔

بے اکرم کی طرف دیکھ کر مسکرائی، اکرم نے کہا ”رول چھوٹا سا ہے۔ مگر بہت اچھا ہے پس یہی

کہ میں گے گرد آسکر ہوں۔ بیرون کے ساتھ کھڑا کروں گا۔ پیٹشی کے حکمے کا آدمی میرا دوست ہے وہ پیٹشی کروں گا ولایت عجم کی کہ دوسری بکچر میں بیرون بننے کے لئے لوگ خود خواہ کرتے پھر یہ، یہ دوسری بکچر بھی میں خود ڈاکٹر کث کر رہا ہوں ۝

اکرم نے بے بے کی طرف دیکھا۔ اس کی پختہ سوچو بوجھ رکھنے والے قسم میں وہی ختم نظر تھا مگر بڑے ضرر مٹا مہربان ملے تھا بیے۔ ان اپنے ننھے سے کبے میں تیرے سامنے کر قوت جانتی ہوں، جان نے پوچھا ”تخوہ کیلے گی؟“
اکرم نے کہا ”ڈھائی سو روپے ماہوار۔“

جان، پھر اٹھ کھڑی ہوئی ”تو ملو چلیں۔ ڈھائی سو روپے۔ وہ اندھری کے ٹوڈیو والے ہیں۔ ساٹھے چار سو بتاتے تھے اور پھر وہ لوگ مجھے کئی کام دیتے تھے۔ پار سو روپے دے رہے تھے۔ مفت میں ہیں یہاں بلا کے خراب کیا۔“

شیخ بولا ”گئی بہار“ میں اُسے پانسول رہے تھے۔ سو روپے مجھے جیب خرچ ملتا تھا۔ سیگرٹوں کے لئے ۝

بے بے ہوئی ”بیرون بھی نہ ہوگی۔ اور تخوہ بھی ٹھیک سے نہ ملی تو مٹا باؤ کام کیسے چلے گا؟“
بے بے نے لفظ کام پر ذرا زیادہ زور دیا۔ اس لئے اکرم کے لئے جواب دینا ضروری ہو گیا۔ اس نے کہا ”کام تو دنیا میں کسی نہ کسی ڈھنگ سے چلتا ہی ہے۔ اور چلے گا بھی۔ تو اس سے زیادہ نہ ملے گی۔ سٹوڈنٹ نہیں مائیں گے۔ اور یہ تو میں اپنی طرف سے کہہ رہا ہوں۔ جس میں ہے سٹوڈنٹ کو یہ سب نیک نہ ہو۔“

جان بولی ”یہ کسٹراک کا کسٹریٹ، ہم کو پسند نہیں ۝
چلو ہمیں ”شیخ بولا۔“

”چلو“ بے بے نے کہا۔

”ہاں ٹھیک ہے“ جلال الدین نے دھیمے سُرس میں کہا۔

دلایت گج دیا بیٹی کی مٹھی میں۔

بے بے نے کہا ”اٹھ دلیتی لے!“

دلایت اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ لوگ باہر چلے گئے۔ سڑک پر آگے نکل گئے۔ اکرم پھر دارا کو

بجھنے والا تھا۔ کہ دلایت بچا یک پٹی۔ اس کے ساتھ کے لوگ اسے بلاتے رہ گئے۔ لیکن وہ نہایت

تیزی سے چلی آرہی تھی۔ وہ سٹوڈیو کے اندر داخل ہوئی۔ اکرم کے کمرے میں آگئی۔ اس کی میز کے سامنے

آکے بولی ”میں کام کروں گی“

اس کا چہرہ غصے سے تنہا رہا تھا۔

اکرم میز پر جا رہا تھا۔ بجلاتے بجلاتے رک گیا۔ بولا ”بیٹا اچھا۔ میں ابھی انٹرنیٹ تیار کر دے

دیتا ہوں۔ دستخط کر کے جاؤ“

وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ بھوک ابھی منٹ ڈاٹپ کرتے تھے۔ وہ بولی ”مجھے کچھ روپے ابھی چاہئیں سرائے والے

کے پیسے دینے ہیں“

”تم سرائے میں ٹھہری ہو“

”اور کہاں ٹھہرتی۔ اپنے پاس زیادہ پیسے نہیں تھے۔ اور آج وہ بھی ختم ہو گئے۔ سرائے والا پریشان

کر رہا تھا۔ آج مجھے کہیں نہ کہیں ابھی منٹ کرنا ہی تھا“ اس نے بڑے افسردہ تھکے تھکے قہقہے لہجے میں

کہا۔ اس کے لہجے میں بڑھاپے کی تسکین تھی۔ اور بچپن کی مصیبت۔ اس کی عمر شکل سے چند رو برس ہوگی

ابھی منٹ ڈاٹپ ہو گیا۔ سیٹھ کے دستخط بھی ہوئے اور دلایت بیگنے کی جھٹ سے دستخط

کر دئے۔ اور اکرم نے ایک سو روپے کا نوٹ اس کی ٹھنڈی برقاب انھلیوں میں تھما دیا۔ تسخیر میں

کے گھر کے لوگ بھی چلے آئے۔ ولایت نے لاہر واپسی سے نوٹ بے بے کے ہاتھ میں دے دیا۔ بے نے اپنے دھننے کے آئینے میں مضبوطی سے باندھ دیا۔ شیخ نے سگریٹ کا کش زور سے اندر کھینچا۔ اور جہاں نے گھور کے غصے بھری نگاہوں سے اکرم کی طرف دیکھا۔ اور میرے لئے تو کام نہیں ہے۔
”نہیں۔“

”اچھا تو میں جاؤں؟“ ولایت نے اکرم سے پوچھا۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ اکرم نے کہا: ”شہر جاؤ میں ایک ہوٹل کا بندوبست کئے دیتا ہوں۔ آپ لوگوں کا سرائے میں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔“
بے نے آئینہ پھیلانے اکرم کو دعائیں دینے لگی۔ اور سرائے والے کو گھایاں۔

اکرم نے قطیعوں پر بات کر کے کہا۔ بوری بندر ہوٹل میں سٹائٹس نمبر کردہ آپ کے لئے طے کر دیا ہے آپ لوگ سرائے سے وہاں چلے جائیے۔ چلتے چلتے جان لے کہا۔ ”سلام لے!“

شام کو جب اکرم اپنے کام سے فارغ ہو سکے بوری بندر ہوٹل پہنچا تو ولایت عجم ایک گہری ہنر ساڑی میں ملبوس اس کی رو دیکھ رہی تھی۔ بے نے اس کے ہاں بڑی خوب صورتی سے بجائے تھے۔ اکرم سٹوڈیو کی ایک گاڑی ساتھ لایا تھا۔ ولایت عجم کو پچھے بغیر اس کے ساتھ ہوٹل کے ریزیڈنٹ سے نیچے اتر آئی۔ پیچھے پیچھے خفیہ تھا۔

بے نے سنے کے اوپر سے بلند آواز میں کھٹا شیخ کو ساتھ لے جاؤ۔ یہ باہر بیٹھا رہے گا۔
اکرم گاڑی بوہو کے ایک خوب صورت ہوٹل کے کشادہ فائن میں لے گیا۔ رستے بھر اس نے ولایت سے کوئی بات نہیں کی۔ اور ولایت نے بھی اس سے کوئی بات نہیں کی۔ اس نے دیکھا کہ اکرم بار بار دوندیدہ نگاہوں سے اس کے چہرے کے سمجھوڑ کو دیکھ لیتا ہے۔ اور اس کی کمر کے کھیلے تم کر۔ بھر بھی وہ سکراتی نہیں سنجیدہ روہو کے باہر نکلتی رہی۔ جہاں لوگ چلے جا رہے تھے، جہاں نوجوان بیویاں اپنے غامدوں سے نہیں نہیں کے باتیں کرتی ہوئی گزرتی جا رہی تھیں۔ ماؤں نے اپنے

پیارے پیارے بچے گود میں اٹھاتے ہوئے تھے۔ جہاں کھوکھیلیوں میں مکھن نے لاسان و لاش برہم کر کے
 نئے جلد ہے تھے۔ ایک جگہ نیامکان بن رہا تھا۔ موڈ پر پولیس کا سپاہی اطمینان سے آمدورفت کا بندوبست
 کر رہا تھا۔ ہوٹل میں، پاروں طرف سمندر کے کنارے کنارے غشی ناکاٹج بنے ہوئے تھے۔ وہ لوگ
 ایک کالچ میں چلے گئے۔

شیخ اڑی میں بیٹھا رہا۔ اور سرخ رومال میں گریں لگاتا اور کھولتا رہا۔ اکرم نے جلتے وقت پانچ کا ٹوٹ
 اور سگریٹ کا ڈبہ اس کے ہاتھ میں تھا دیا۔ شیخ نے سترت سے اچھن کر اکرم کے گھٹنے چھوئے۔ "تو سنی
 بادشاہ ہے۔ ایک پارٹ فیکڑوں کو بھی دے دے۔ ولایت کو میں لاہور سے لایا ہوں کس کو پارٹ
 مل جائے گا۔ تو فیکڑوں کو بھی مل جائے گا۔ کیوں؟ سنی بادشاہ"

اکرم نے کہا "عزیز سگریٹ پیو، اور سمندر پر چلو۔ کل بات کریں گے۔"
 شیخ نے اکرم کی طرف ہاتھ اٹھانے کے کہا: "جیو چھیا!"

اندک کالچ میں پہنچ کر اکرم نے دیکھا۔ پتنگ پر ولایت پریم لٹی۔ نیم وا اکھوں سے چپت کر تک
 رہا ہے۔ اس نے ساڑھی اتار کے الگ رکھ دی ہے۔ ایک کرسی پر اور چپت کے چٹکے کے بلکے ہلکے
 جھونکھڑ میں اس کا سبز سائن کا بیٹی کوٹ لٹ رہا ہے۔

اکرم نے کہا "یہ کیا یہ ہو گئی ہے۔ ساڑھی پہنوا اور دوسرے صوفے پر آؤ۔"

وہ بولی "بعض لوگ پہلے پتنگ پر رکتے ہیں۔ بعد میں صوفے پر جلتے ہیں۔ خیر یہ تم کہو! اس نے ساڑھی
 پھر پہن لی، اور اکرم کے قریب صوفے پر آ کے بیٹھ گئی۔ اس نے میز پر پڑے ڈبے سے ایک سگریٹ نکال لیا
 اور دھواں میں خراب انڈرل لی "تمہارے لئے سو ڈاڑھوں؟"

اکرم نے کہا "ہاں"

دہری "میں سو ڈاڑھیں پتی ہوں، اس نے سگریٹ کا ایک کش لگایا۔ اور پھر اپنا بیگ سو ڈاڑھ لے لیا۔

ایک ہی سانس میں چڑھا گئی۔ بٹی "کتنا آج ذائقہ ہے۔ مگر گھرا لے مجھے کبھی شراب اور سگریٹ نہیں پیئے دیتے چپ کرتی ہوں۔"

"وہ یوں؟"

"پتہ نہیں۔ ایک بار میں نے آپ کے سامنے سگریٹ پی تھی۔ آپ نے مجھے بہت مارا۔ ایک بار میں شراب کے نشے میں مہوش گھرائی تو پہلے توہمتے میں شفع نے مجھے مارا۔ پھر کمر پر ہلا کر آپ نے مار دیا۔"

"بے بے مجھے بڑا یاد کرتی ہیں۔ چوری چھپے ہم دونوں سگریٹ پی لیتی ہیں۔ مگر شراب کو وہ بھی منع کرتی ہیں۔"

"عجب چیز ہے۔ مگر کتنا آج ذائقہ ہے اس کا؟" اس نے دوسرا پیگ اٹھ لی لیا۔ "یہ کڑوا کڑوا ذائقہ ہے بہت اچھا لگتا ہے۔ اس سے بھی اگر کڑوی مشراب مل جائے تو مجھے بے حد پسند آئے"

اکرم نے کہا "شیف تھیں پینا ہے۔ اور تم اسے کچھ نہیں کہتی ہو؟"

وہ بولی "مجھے اس کا پشیمانہ لگتا ہے۔ جیسے یہ سگریٹ اس وقت مجھے اچھا لگ رہا ہے۔ وہ کرے کو ہمارے دل و دیکھ کے بولی "کتنا اچھا کر رہا ہے۔ خوب صورت پینگ۔ رنگین دیواریں۔ یہ پنکھا۔ یہ دم دم مچنی دھنکی والے قہقہے۔ یہ سنہری شراب۔ یہ سفید سگریٹ۔ یہ چمکتے ہوئے تلور کے گلاس (جان سے میرا خول تو بیت بُرا ہے۔ اور وہ سرائے نکلتی ہی تھی۔ جہاں ہم آکے چند روز ٹھہرے تھے۔ اور لاہور میں میرا گھر کتنا بُرا تھا۔ یوں تو اچھا تھا۔ مگر اس کے مقابلے میں۔۔۔ اس نے چُپ ہو کر سر ہلایا۔"

"لوہور میں تنہا رہا مگر کہاں ہے؟"

"شکار بار بار کے قریب ہے۔ باغبان پورے میں کچا گھر ہے۔ مگر بڑا سا چمڑا آگن ہے۔ بھین میں ہمارے ہاں بھینس لگی تھی۔ بے بے اس کا دودھ اور کنٹن مجھے دیا کرتی تھی۔ چوری چھپے ایک دھند کیا ہوا؟ اور وہ اتنا کہہ کے ٹیکلہ کے ہنس پٹی اور اس کے سفید اور مناسب راتوں کی لڑی لکڑی کی طرف گھر

گئی۔ ایک دفعہ کیا ہوا۔ بے بے نے میرے لئے کھن ڈھیر سا رکھ دیا اور مصری کی ڈلی الگ رکھ دی۔ اور گھٹی میں تھے ہوئے نرم نرم چار پرانے کچی رکھوئے، اور ایک گلاس دودھ کا، اتنا گاڑھا دودھ ہوتا تھا کہ کیا بتاؤں تمہیں۔ خیر جی جب میں سکول سے واپس آئی :
 ”تو تم سکول میں پڑھتی تھیں ؟“

”ہاں میں اُن دنوں تیسری جماعت میں پڑھتی تھی۔ اُس وقت میری عمر کوئی آٹھ سال کی ہو گئی۔ خیر جی جب میں گھر آئی۔ اور بے بے قویہ سب سلمان چھکے میں ڈال کے چلی گئی تھیں۔ اپنے کسی ہم سائے کے یہاں میں نے گھرتے ہی ابستہ زمین پر چٹا ادا پاک کر چھپکا نیچے آتا رہا۔ اور جلدی جلدی سے کھانے لگی اتنے میں شعین کہیں سے آگیا میں نے اپنا کھانا اچھا تا چاہا۔ مگر اس نے دیکھ لیا۔ بولا : ”بے بے تمہاری طرف داری کرتی ہیں۔ تمہیں اچھا اچھا کھانے کو دیتی ہیں۔ اور اتنا زیادہ کھاتی ہیں۔ اور میں کوئی نہیں چھتا ہے۔ دیا کیوں ہوتا ہے۔ دوسروں کے گھر میں لڑکے دیکھتا ہوں۔ اُن کی خاطر سب سے زیادہ ہوتی ہے یہاں ہیں کوئی پوچھتا نہیں ہے۔ بس بڑی کو کھلانے جاؤ میں دستک میری اُس کی لڑائی ہوتی رہی۔ نہ جین جھپٹ کے میرا کھن بھی کھا گیا۔ اور پرانے بھی۔ اور وہ سارا غلاس بھی پنی گیا۔ اور میں نمودار سے رونے لگی۔ اتنے میں بے بے باہر سے آگئیں۔ اور انہوں نے شفیع کو خوب دھڑا دھڑکوں، ڈانچوں، لاقوں سے چٹا۔ رات کو جب وہ سوا قومی رات نچنے میں بیٹھ کر کے سویا۔ ہم اکٹھے سوئے تھے۔ میں آہستہ آہستہ اس کے جسم کو دباتی رہی۔ اس رات میں رات بھر اپنے بھائی کا ہم دباتی رہی۔ اور پھر آفراس کے جسم کے اوپر سر رکھ کر سو گئی۔ صبح ہم دونوں کو اس طرح سوئے دیکھ کے بے بے بہت ہنسیں : ”اور اتنا کہہ کے ولایت پھر کھن کھانے کے خن پڑی۔ پھر بچا یک افسردہ ہو کے بولی ”اُس وقت میری عمر آٹھ سال کی تھی اب پندرہ سال کی ہوں۔ مگر ایسے سلام بولتا ہے جیسے آٹھ سو سال گزر گئے :“

اس نے تیسرا پیگ انڈیل دیا۔ اگر م نے استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا وہ بولی ”آج مجھے

کہو نہ کہو۔ جی بھر کے پیئے دو۔ مدت کے بعد پنی رہی ہوں :-

اس نے تیسرا بیگ بھی جلدی سے ختم کر دیا۔ اکرم ابھی پہلے ہی میں تھا۔ جب وہ آگے چلنے لگی تو اکرم نے کہا "مرہ بانگی" وہ بولی "نہیں اس سے کیا ہوتا ہے۔ میں تو لورہ کی قوتل پنی جاؤں۔ اہ لکھے کچھ نہ ہو :-"

اکرم نے حیرت سے دیکھ کر کہا "کب سے پنی رہی ہو؟" وہ بولی "میں جب گیارہ سال کی تھی، جب میں بے سنی بار شراب پنی تھی۔ اُن دنوں ہم لوگ ننھے ننھے کراچی آئے تھے :-"

"تو کیا تم کراچی کی رہے ہو ابی ہو؟"

"نہیں ہم تو لاہور کے ہیں۔ باغبان پورے کے۔ وہاں ہماری زمین ہے مکان ہیں۔ آبا کھیتی باڑی کرتے

تھے۔ اور ہم لوگ بڑے بڑے میں رہتے تھے۔ پھر آیا مقروض ہو گئے۔ اور ہمارے ہونے گھر سے سب

اُٹھا گیا۔ یہاں دنوں کی بات ہے۔ جب میں پیدا ہوئی نہ ہوئی تھی۔ بے بے ستاتی ہیں۔ کہ جب گھر میں کچھ

نہ رہا اور فوت فاقوں پر آگئی۔ تو بے بے نے پیشہ کر لیا۔ بے بے بڑی حسین تھی۔ سارے خاندان میں

بھی اُن کے برابر کوئی حسین عورت نہ تھی۔ جلال آبا ان کو برقعہ پہنا کر باہر لے جانے لگے۔ ایک دفعہ

کسی بڑوں میں بے بے اور آبا کھڑے تھے۔ بے بے توجہ لگیں۔ لیکن آبا کو تین ماہ کی قید ہوئی۔ جب

وہ تیسرے ماہ رہا جو کے آئے۔ تو بے بے کے لاہور چھوڑ دیا۔ اور کراچی چلی آئیں۔ وہیں پر شفیق اور

میں پیدا ہوئے۔ ہم لوگ جلال آبا کی اولاد نہیں ہیں۔ ویسے وہ ہمارے آبا ہیں۔ مگر ہم ان کی اولاد نہیں

ہیں :- اکرم نے کہا "ہاں میں بھی خود کر رہا تھا۔ کہ تم دونوں بہن بھائی کی صورت اُن سے بالکل نہیں

ملتی ہے :-"

دایت نے سرگوشی سے اکرم سے کہا۔ حالانکہ اس وقت اُن کے کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ جملے سے اُن کے

"ہم دونوں شفیق اور میں چچا بچی بخش کی اولاد ہیں :-"

"چچا بچی بخش؟"

”ہاں چچائی بخش کا کرتی ہیں یہ دل کا چپ تھا، اور سینکڑوں کی آمدنی تھی وہ کچن ہی سے ہماری بے بے کو چاہتے تھے۔ مگر بے کی شادی ہاں باپ نے جلال آبا کے ساتھ کر دی۔ اور جلال آبا تو بڑے کامل اور محنتور ہیں جنہیں کام کرنا تو آتا نہیں۔ دن بھر حق پیتے رہتے ہیں۔ اسی کابی میں زمین بھی ہاتھ سے گئی۔ پھر سر پر چڑا بانڈھ کے اور لٹی لٹی ٹوئیں رکھ کے اپنی بیوی سے پیشہ کرنے لگے۔ میرا چاہتا ہے منہاں وہاں جلال آبا کا۔ مگر ڈر لگتا ہے۔“

”کابے کو ڈر لگتا ہے؟“

وہ بولی ”جب سے وہ قید سے رہا ہوئے ہیں۔ ان کا ڈھنگ بھی بدل گیا ہے۔ اب وہ ہمیشہ اپنے پاس ایک چاقو رکھتے ہیں۔ لہذا سا چاقو مگر میں ڈرا فدا سی بات پر چاقو نکال لیتے ہیں۔ ایک دفعہ تو شیخ کو جہاں سے مار دینے والے تھے کب بے نے بچا لیا۔ پھر کئی شیخ کی یاہوں پر کئی زخم آگئے۔ دو مہینے خیم پٹی ہوتی رہی۔ مُستی ہوں پہلے جلال آبا ایسے نہ تھے۔ جب اپنے ہاں زمین تھی۔ مکان تھے پر اب تو ————— خیر جی جالے وہاں باتوں کو۔ تو تم دوسرا پیگ پیو۔ تم اتنے چپ چاپ جو رہتے ہو جگے اچھے لگتے ہو۔“ ولایت بچکے لے کہا۔

اکرم باصل فریفتہ ہو کے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ ہر لمحہ حسین تر ہوتی جا رہی تھی۔ خراب کے ہر گھونٹ کے ساتھ میل گوں روشنی میں پلنگ پر تنی ہوئی پھر والی کسی پُراسرار چار کا کین معلوم ہوتی تھی پلنگ کے اوپر چکھا تھا۔ جس کی تہ سے پھر والی لکی شفاف سطح پر لکی لکی مویں پیدا ہو رہی تھیں۔ اکرم نے ولایت بچک کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ اور اس سے کہا ”یہ پلنگ کتنا خوب صورت ہے۔ باصل کسی جہان کے کین کی طرح معلوم ہوتا ہے۔“

وہ اس کا بوسے کے بولی ”میں نے اس سے بھی خوب صورت پلنگ دیکھے ہیں۔ ڈوٹی کشر کے ہاں پلنگ کے پایوں پر چاندی کے پتے جڑے ہوئے تھے۔“

اکرم نے چنک کر کہا ”ڈپٹی کمشنر کو جانتی ہو؟“

وہ بولی ”ہاں۔ اس کے پاس امیر ڈراموں تھا۔“

”امیر کون ہے؟“

”امیر میرا خاوند ہے۔“

”تمہارا خاوند ہے؟“

”ہاں۔“ ولایت بیگم کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائیں۔ اس کی آواز لڑنے لگی۔ کانپتے ہوئے

لہجے میں بولی ”وہ خبیث مجھے کبھی نہیں بھولا۔ جب کبھی مشراب پیتی ہوں وہ کم بخت سامنے

آکر کھڑا ہوتا ہے۔ یوں آنکھوں کے سامنے جیسے تم اس وقت میرے سامنے ہو۔ تم مسلمان ہونا۔“

”ہاں۔“

”گیارہویں والے پیر کو ملتے ہو؟“

”ماتا ہوں۔“

”میں گیارہویں والے کی قسم کھا کے کہتی ہوں مجھے اگر کسی سے اس دنیا میں محبت ہوئی ہے۔ تو وہ

صرف امیر سے، باقی سب جھوٹے ہیں۔ اور ان سے میں بھی جھوٹی ہوں۔“

اکرم نے بڑے جانا زما شق کی طرح اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا ”پرچہ اب تمہیں کچھ عرصے

نہیں ہوتا۔“

”کچھ نہیں۔ رقی بھر نہیں۔ میری جڑی سرنگی ہے۔ کچھ محسوس نہیں ہوتا۔“

”حیرت ہے؟“ اکرم نے اپنے گلاس میں شراب کا آخری قطرہ پیتے ہوئے کہا۔

وہ بولی ”حیرت تو ہے، مگر امیر پر اب بھی میرا اتنا ایمان ہے کہ وہ اس وقت بھی میرے سامنے

آجائے تو میں تمہیں تو کیا ساری دنیا کو چھوڑ چھاڑ کے چلی جاؤں۔“

گھروالے اس رشتے کے خلاف تھے =

”وہ کیوں؟“

”بے بے مجھ سے ہٹ کر اپنا چاہتی تھیں۔ مگر میں امیر سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے کہ مجھ سے محبت تھی۔ اور پھر اس نے مجھ پر خچ پانی تھی۔ اُسے دیکھ کر میرا دل یوں جھونے لگا جس طرح خشکی کو دیکھ کر بہنی چوڑیاں بھول جاتی ہے۔“

اکرم نے کہا ”سچی محبت میں ایسا ہی ہوتا ہے =

وہ بولی ”تم مسلمان ہونا“

”ہاں“

”اچھا رھو میں دالے پر یقین کرتے ہونا“

”کرتا ہوں“

”اس گیارھویں دالے پاک پیر فیئر کی قسم کھا کے کہتی ہوں۔ میں گھروالوں کی مرضی کے خلاف گھروالوں سے چُھپ کر گھروالوں کی مار پیٹ سہہ کر بھی۔ امیر سے ملتی رہی۔ پہلے میں گیارہ برس کی تھی۔ پھر میں بارہ برس پورے کر کے تیرھویں میں آگئی۔ تب میں آنکھوں میں پڑھتی تھی۔ اور امیر سے برابر ملتی تھی =

”وہ کیسے؟“

دلایت بولی ”دل ملنا چاہیے۔ تو کون روک سکتا ہے۔ دل تو کب سے لے ہوئے تھے۔ پھر میں ایک روز۔ امیر کے ساتھ لائل پور۔ تم نے دیکھا ہے کہ نہیں۔ تم کہاں کے رہنے والے ہو“

اکرم نے کہا ”میں یوپی کا رہنے والا ہوں =

وہ بولی ”خیر لائل پور ڈراپتھا شہر ہے۔ سڑکیں چوکر۔ سیدی ایک دوسری کو کاٹتی ہوئی اور شہر باہر گول ایک جگہ سے سیر کے لئے بکھو۔ گھوم کر پھر وہیں آجاؤ گے۔ لائل پور میں کوئی بچہ بھی کھو جائے تو

گم نہیں ہو سکتا۔

”خیر تم دونوں بچوں کا کیا ہوا؟“

”میں بچتے وقت کچھ زبردے کے آئی تھی کچھ روپے بھی امیر کے پاس تھے۔ پہلے تو امیر نے روپے خرچ کئے۔ ہم لوگ دن رات ہنگ پر پڑے رہتے۔ اور ایک دوسرے کو جوتے رہتے۔ اور جب چوتے چھتے تھک جاتے، تو اٹھ کر سیر کرنے پلے جاتے۔ مجھے امیر نے دسٹے سوٹ سلوا دئے۔ اور خود بھی بوسکی کی قمیص سلوائیں۔ اور کاجوں میں سونے کے بٹن لگائے، اور ربڑی تہر اور پمپ شوہن کر جب وہ لوہے میں اپنے گھر سے بھٹتے تو سارے بازار کی نگاہیں ہم دونوں پر ہوتی۔ بڑے اچھے دن تھے وہ۔ ایسے اچھے دن اب نہیں آئیں گے۔“

”کیوں؟“

”اب میری چڑی مر چکی ہے۔“ دلایت نے ایک سانس میں گلاس ختم کرتے ہوئے اور دوسرا اٹھاپتے ہوئے کہا۔ ”اور بھر پینے تم ہو گئے۔ پھر امیر نے مجھے پینا شروع کر دیا۔ پھر سیاہنڈی، توبے، چولے میں لگ گئی۔ اور امیر میرا زبردین بیج کر شراب پینے لگا۔ پہلے وہ شراب نہیں پیتا تھا، مگر اب وہ بیوی والا تھا، اور بے کار تھا۔ اسے سائیکلوں کی مرمت کا کام آتا تھا۔ اور وہ فٹ بال بڑا اچھا کھیلتا تھا، مگر سائیکل مرمت کرنے والے خود سب کام کرتے تھے، انہیں اس کی ضرورت نہ تھی۔ فٹ بال تو ایک کھیل تھا۔ اب وہ بے چارہ کرے تو کیا کرے۔ جب زبرد کی ختم ہو گئے اور ہم لوگ دونوں اور زبرد فاتحے سے رہے تو امیر مجھے برقعہ اور حاکے ڈپٹی کشنر کی کوٹھی پر لے گیا۔ اس کا بڑا امیر کا دوست بن گیا تھا، اور ڈپٹی کشنر کے ڈرائیور نے اسے ڈپٹی کشنر کی موٹر پر جملے کے موٹر مپلانا بھی تھوڑا تھوڑا سکھا دیا تھا اور ڈپٹی کشنر کا بڑا اور ڈپٹی کشنر کا ڈرائیور دونوں کہتے تھے، کہ اگر امیر مان جائے تو اس کی ساری مشکلیں حل ہو سکتی ہیں۔ میں بہت روٹی دھوٹی، چلائی، بن کئے۔ اسے کھنے دئے۔ اسے ٹکی لگی

فٹش گھایاں دیں۔ اس کی ماں بہن کو اتنی طرح مٹا۔ مگر جب دو رات اور دو دن قلعے کرنے گزر گئے اور منہ میں اُنکے ایک کیل بھی نہ گئی تو امیر بچے برقعہ اور حاکم کے ڈپٹی کشنر کی کوٹھی پرے گیا اور وہاں پر میں نے وہ پٹنگ دیکھا جس کے پاؤں پر چاندی کے تہرے چڑھے ہوئے تھے :-

”بھمکریا ہوا“ اکرم نے پوچھا۔

”بھمکریا ہوتا“ امیر موڑکا کلینر ہی گیا۔ میرے لئے بڑے اچھے اچھے کپڑے ہی کے آگئے۔ اور زیور بھی۔ اور مگر کاچو لھا دیراں ہو گیا۔ اور آگ بج گئی اور میرے دل ہر وقت بجنا بھجا سا رہنے لگا۔ پھر میرے ماں باپ ایک رنڈ بچے لینے کے لئے آگئے۔ ان کے ساتھ پولیس بھی تھی :-

”پولیس کیوں تھی :-

”میں نا باغ جو تھی نا۔ لاہور کی پولیس آئی تھی۔ انہوں نے میرے اور میرے امیر کے تنگیزی لگا دی، اہہ یہیں پانچھ کے بچے۔ لائل پور کے ڈپٹی کشنر نے بچے پکڑا پکڑا۔ مگر وارنٹ لاہور کے جج نے لکھا ہے کہ وہ دانت میں کے رہ گیا۔ چلنے چلتے میں نے سب ایکٹ کر کے جو بچے گرفتار کر لئے یا تھانہ گالیاں دیں وہ گالیاں دیں کہ بے چارہ اپنا سامنے لے کے رہ گیا۔ جس کے کہنے لگا اتنی خوب صورت لڑکی کے منہ سے اتنی بُری گالیاں میں نے آج تک نہیں سُنیں۔ مجھے پانچ بہت بُری بُری گالیاں یاد ہیں، ایک دن تیس سناؤں گی :-

”کب سناؤ گی :-

”جس دن تم سے لڑائی ہو گی جس دن تم مجھے شادی کے لئے کہو گے۔ کیا تمہاری شادی ہو چکی ہے :-

”نہیں تو۔ مگر کیا تم شادی کے غلات ہو :-

”ہاں یہ سارے مرد بڑے حرام زادے ہوتے ہیں۔ میرا میں چلے تو اُن کی کمال کھیچ کر انہیں پھانسی

پر لٹکا دوں :-

اکرم نے کہا: تم نے تو ابھی گالیاں دینا شروع کر دیں۔ ابھی تو میں نے تم سے شادی نہیں کی ہے۔
وہ بولی: تم مجھ سے کیا کھانکے شادی کرو گے؟

اکرم نے میز پر گونہ مار کے کہا: میں تم سے ضرور شادی کروں گا۔ میں تمہاری زندگی سداوار دوں گا۔ تم میری نیک طبیعت بیوی بنو گی۔ میں تمہارا فراں بردار خاوند۔ اور ہمارے گھر کے آگے میں ہمارے پیارے پیارے بچے نکلیں گے۔ اور....

اور وہ آہستہ سے بولی: اور پھر تم مجھے کسی ڈپٹی کنسٹرکٹور کے پاس لے جاؤ گے؟

وہ زور زور سے ہنسنے لگی۔ اکرم بھی زور زور سے ہنسنے لگا۔ پھر وہ چپ ہو گئی۔ پھر اکرم بھی چپ ہو گیا۔ پھر اکرم محو اوپنٹی کر کے اس پنک کی طرف دیکھنے لگا۔ جو سرور کے عالم میں اور بھی حسین دکھائی دے رہا تھا۔ اکرم نے ولایت کی کمریں ہاتھ ڈال کے کہا: یہ پنک کتنا حسین ہے؟
وہ بولی: میں نے اس سے بھی خوب صورت پنک دیکھے ہیں۔ چلو میری نواب میران شام کے پنک میں سوئے کے پائے لگے ہوئے ہیں اور اس کی گلابی رنگ کی تھروانی میں سوتی اور جواہر لگے ہوئے ہیں اور اس کے ارد گرد چاروں طرف قد آدم آئینے ہیں۔ اور آپارنگی عورتوں کی تصویریں ہیں۔ اور جب میں اس کے کمرے میں داخل ہوتی تو پہلی بار اپنے آپ کو چاروں طرف آئینوں میں دیکھ کر گھبرا گئی۔ اور شرمائی لیکن نواب نے چائے بڑے اچھے آدمی ہیں۔ ان کی عمر پچاس کے اوپر ہو گی۔ بال کچڑی ہیں۔ ہونٹ لڑخندہ دکھائے ہوئے ہیں۔ اور سوتے وقت طاقت کی دوا کھاتے ہیں۔ ان کے پاس بے شمار دولت ہے بے شمار زمین ہے۔ بے شمار جائیداد ہے۔ سننے میں نواب میران شاد کی دولت کا کوئی حساب نہیں خود چھوڑنے لافٹ ان کے گھر کا اکھانے آتا ہے۔ اتنا بڑا آدمی محمد پر عاشق ہو گیا؟

”کیسے ہوا۔ کیا میں نے تمہیں دیکھا تھا کہیں پہلے؟“ اکرم نے پوچھا

”نہیں کہیں پہلے تو نہیں دیکھا تھا۔ بے کر تو مجھے میرے آباؤی وہاں گئے تھے۔ لافٹ پور سے جب میں

اور امیر گرفتار ہو کے آئے تو امیر مجھے درود کے سلام کرتا ہوا۔ اور میں اُسے درود کے وہائی دیتی تھی۔
 اللہ دنیا ہمارا تاشہ رکھتی تھی۔ پھر جو سب الپکٹر تھا وہ شفیع کا بڑا دوست بن گیا۔ اور شفیع اس کے
 ساتھ حالات میں مجھے ملنے آتا تھا۔ اور میں اس کے سامنے سب الپکٹر کو اور شفیع کو اللہ اپنے اہل باپ
 کو بے لفظ ساتی تھی۔ بے چارہ الپکٹر چپکے چپکے سب کو مُشاہد میں لے آسے کہا، میں امیر سے ملنا
 چاہتی ہوں۔ اس نے کہا میں تمہیں امیر سے ملا دوں گا۔ مگر اس کا تمہیں سوا وضو دینا ہوگا۔ میں نے
 دیا۔ کیوں کہ میں امیر سے مانا چاہتی تھی۔ اور جب ہم ملے۔ تو خوب دیک دوسرے سے گلے مل کر روئے
 اور میں نے امیر سے وعدہ کیا کہ اگر میرے ماں باپ نے اس کے خلاف مقدمہ چلایا تو میں صاف کہوں
 گی کہ میں اپنی مرضی سے امیر کے ساتھ گئی تھی۔ چنانچہ جب مقدمہ چلا تو میں نے صاف صاف ایسا ہی کہہ دیا
 اس پر جو بیٹھنے امیر کو نہانت پر رہا کر دیا اللہ مجھے اپنے ماں باپ کے حوالے کر دیا۔ اور میں دن میں مگر
 آئی ہوں اور ابھی میں سے بھی نہ بچتی تھی کہ دوسرے روز آتا مجھے برقعہ اوڑھنے کے فواب میراں شاہ کے
 گھرے گئے۔ میں بہت روئی دھوئی۔ مگر بے بے کہا، مگر میں کہہ نہیں ہے۔ تیرے جلنے کے بعد ہم
 لوگوں نے دس دس دن فلسفے کئے ہیں۔ تو کچھ تو گھڑا۔ یاں کر۔ ہم بڑھے ہیں۔ شفیع نا لاق ہے۔ اس سے
 کچھ نہیں ہوتا۔ تو بھی اگر گھر بار نہیں ہنسلے گی تو روئی بھی نصیب نہ ہو سکے گی۔ اتنا کہہ کے بے رونے
 لگیں۔ اور میں بھی اُن کے ساتھ رونے لگی اور پھر آنسو پونچھ کر فواب میراں شاہ کے محل میں بھی گئی۔ وہ دیکھ
 تک چپ رہی۔ پھر رنگ رنگ کے کہنے لگی: فواب کے منہ سے بڑی بد بو آتی تھی۔ جیسے اُس نے مرفے
 کھائے ہوں۔ اور اب تو مجھے ہر روز کے منہ سے ایسی ہی بد بو آتی ہے گلی سڑی لاشوں کی بو؟
 اکرم نے کہا: میں بد بو فود کر دوں گا۔ میں تم سے بیاہ کروں گا۔ تم میری زندگی میں چاند کی کرن۔ ہمنور
 کی نور۔ پھر وہی کی جہاں میں کے آؤ گی اللہ کوئی تمہیں چھو نہ سکے گا۔ اور ایک چھڑا سا آٹھن ہوگا جس میں
 تم اللہ میں اللہ ہمارے بیچے آ

اُس کی آنکھیں پکڑنے لگیں اور وہ اکرم سے پٹ گئی۔ وہی پہنچتے ہوئے کئی بار اس زرب کوٹن پٹی میں۔ پھر کئی ہر بار یہ چھ سطر ہوتا ہے۔ تنہا کہہ کے پاس کیاں لے لے کے رونے لگی۔ اس کے دل کی آگ بجھ گئی تھی۔ اور اس کی چڑی مر گئی تھی۔ اور اس کے پنوں کے پھل مڑ جائے تھے۔ اور زندگی کے سارے غم اوریشیائی موت کے سارے آسوشرب کے قلوب میں تحلیل ہو چکے تھے۔ اکرم نے پنگ کی طرف دیکھا۔ اور اب اُسے وہ پنگ بیت بُرا نظر آیا۔ بُرا اور سیدہ پنگ تھا۔ پاش بگ بگ سے اکڑا ہوا تھا۔ پھر دانی کی کی کی دھنکی دے رہی تھی۔ اور دل گوں قوتوں کے اور گرد دکھتیاں بھینٹا رہی تھیں۔

ولایت دوتے دوتے دتیں موفے پر سو گئی اکرم جوت سے اس کے چہرے کی تلون دیکھنے لگا۔ خند میں اس کے اعلیٰ ضد و حال اُبھر آئے تھے۔ اس کا نہ تھکا سا اگلا تھا۔ سوتے ہوئے پتھکی طرح دھماکوں پر تانہ سبب کی سی چمک تھی۔ اور یکس گھس سے نہ حال ہو کے گر پڑی۔ تھیں۔ اور اس کی انجلی، ہوئی آستین سے اس کی منہ کی کلائی کی گندہ گرونی نظر آرہی تھی۔ اور اس میں ایک چوٹا سا گلا پڑا تھا۔ ایک پتھکی کی کلائی کی طرح اور اس کی وہ انجلی ہوئی بھڑکے بچپا سے کھڑا سر میں غم نمایاں ہو گیا تھا۔ اور ایک پاؤں موفے پر اور دوسرا موفے سے نیچے کلک رہا۔ تھا۔ اور گوں ٹخنے کے پاس ایک گڑا تھا۔ ایک پتھکی کی طرح۔ اور اس پتھکی کی طرف رخ سے پندرہ برس کی ہوگی۔ اور پھر جیسے یہ پتی ناب ہو گئی۔ اور ولایت کے ضد و حال میں بے بے کا خنہ خطر اور اس کی ناک کی تلاش میں حال بالکی خنوت اُبھرتی نظر آئی۔ اور جڑے کی سانت میں شیفین کا شہدا میں ایک ہی چہرے میں دھماکات جیسے ہو گئے تھے۔ سو رہے تھے۔ گڈنڈہ ہو کر ایک دھڑکے سے غراحت کر رہے تھے۔ سوتے دقت بھی جیسے دھن کے چہرے پر جنگ ہو رہی ہو۔ سوچتے سوچتے اکرم بھی اٹھ گئے۔ اور پھر اچانک چونک کر باطل بیدار ہو گیا۔ اکرم نے ولایت کو ایک

ٹھوکا دے کر کہا: اٹھو آج کی رات سونے کے لئے نہیں ہے۔ جاگنے کے لئے ہے۔ اور ان متا
 چنگوں کی کہانی سنانے کے لئے ہے جنہیں تم نے اپنی چھوٹی سی زندگی میں دیکھ لیا ہے۔ اچھا تو بلا سونے
 چاندی اور جواہرات کے علاوہ کیا تم نے کبھی کسی لوہے کے چنگ کو بھی دیکھا ہے ؟
 وہ آنگلیں ملتے ملتے ہوتی ؟ اس حوالہ میں : ” اور پھر سو گئی اور جکے جکے خراٹے لینے لگی “ اس میں نے
 بہت فانی تھی۔ اکرم نے بول خانی کر کے اس میں دیا سوائی سلٹک کے پھینک دی اور توں میں ایک بنگلہ
 شعلہ پیدا ہوا اور شعلے سے ایک بجلی سی گونج پیدا ہوئی۔ اور پھر اکرم نے توں کے منہ پر اپنی ہتھیں رکھ
 دی۔ اور نیلگوں شعلہ بجھ گیا۔ اور گونج غائب ہو گئی۔ اور اکرم نے سوچا۔ ولایت بھی شراب کی غالی بوتل ہے
 اس کے اندر نیلگوں شعلہ بھی ہے۔ دھمکے کی گونج بھی ہے۔ مگر یہ شعلہ اور گونج شیشے کی چار دیواری اور
 ظالم تھیلی کے باہر نہیں جاسکتے۔ کیوں نہیں جاسکتے۔ بھلا کیوں نہیں جاسکتے۔ یہ کیا کہ یہ سوال اکرم کے
 غلی کے گوشوں میں چکرانے لگا جس طرح رات کی سیاہی میں تاریک کمرے میں کوئی بھولی۔ کھلی چکاڑ
 بالکبا بچکر لگاتی ہے۔ اس طرح یہ سوال اس کے ذہن کے نبض خانے میں پکڑ لگنے لگا۔ آخر سوپ سوچ کر کہیں
 نے فیصلہ کیا۔ باہر جا کر شفیق کی رائے طلب کی جائے۔ چنانچہ اکرم لڑکھڑاتے قدموں سے باہر نکل کر شفیق
 کے پاس گیا۔

شفیق ہوش کے تہے کھلے آگلیں میں موڑ میں میٹھا سکرٹ ہی رہا تھا۔

اکرم نے شفیق سے پوچھا: کیوں شفیق۔ یہ شعلہ کیوں بجتا ہے۔ یہ گونج کیوں دہرائی ہے۔ شفیق میرے لئے
 شفیق تو بھلا ہے کہ بولا: ” زبانی بادشاہ تیری شرب دے صدقے۔ ایک کونٹا فقیروں کو بھی
 چھلکا دے “

گلاڑی میں بیٹھ کر اکرم نے شفیع سے کہا: "اندر جاؤ۔ ولایت بیگم کو باہرے آؤ:"

"کیوں؟"

"مجھے غم معلوم نہیں۔ کیوں۔ ہم واپس چلیں گے:"

واپسی میں اکرم گلاڑی چلا رہا تھا۔ پیچھے کی سیٹ پر شفیع اور ولایت بیگم تھے۔ ولایت بیگم بار بار اُٹھ کے فے کرتی۔ بار بار اکرم کو اپنی گلاڑی موکنی پڑتی۔ اک عجیب بے گلی، بے مہنی سی اُس کے دل و دماغ میں بڑھتی ہی جا رہی تھی، وہ الفاظ، اسٹیمپا، اجنام کی کھلی خوب صورتی پر تعلق کیوں نہیں ہو سکتا؟ جوشی جی نی طرح، اُسے کیا ضرورت ہے کہ وہ برقع کو کرید اور پھیل کے دیکھے کہ اس کے اندر کیلے۔ ہر کاہش اُسے بے قرار کیوں رکھتی ہے؟ وہ چیزوں اور رشتوں کو جیسی وہ ہیں کیوں منظور نہیں کرتا۔ بھڑکی کتنا خوش رہ سکتا ہے۔ ہر عزت کو آرام سے ایک قبرستان کی طرح سو سکتا ہے۔ اکرم نے سوچا۔ آخر وہ کیا چاہتا ہے۔ زندگی سے۔ اپنے کام سے۔ لوگوں سے۔ ہمدرد کے ماحول سے۔ وہ کیا چاہتا ہے اُن سے۔ کیوں وہ انہیں منظور نہیں کرتا۔ جیسا جوشی جی نے منظور کر لیا ہے۔ راج تانے منظور کر لیا ہے۔ اور باغرائے منظور کر لیا ہے۔ کیوں نہیں اکیوں نہیں وہ بھی منظور کر لیتا۔

ولایت بیگم شفیع کو اُن کے بٹول میں چھوڑ کے۔ جب اکرم واپس پرل پہنچا تو رات کے دو بج رہے تھے۔ رشیدہ ابھی تک جاگ رہی تھی۔ اس نے میز صوف پر اکرم کے لاٹکڑی لٹے ہوئے قدموں کی چاپ مٹی۔ اور چپ چاپ جدواہ کھول دیا۔ اکرم اندر آ کے ایک ٹرنک پر بیٹھ گیا۔ اور اپنے اُلبے ہوئے گنگرہائے بالوں میں انگلیاں پیرنے لگا۔ دیرے دیرے

رشیدہ کچھ بولی نہیں۔ چُپ چاپ اُس کے پاس کھڑی تھی، بیک ایک اکرم نے کہا۔

"میں غم خوش نہیں بناؤں گا:"

کیوں —؟ رشیدہ نے چونک کر پوچھا۔

”بس! میں منظر نہیں کر سکتا = اکرم کبھی مجھے میں ایک نئی سخی تھی۔

”کیا منظر نہیں کر سکتے؟“

”وہ سب کچھ جو وہ کہتے ہیں اور کرتے ہیں؟“

”وہ تو کون ہیں؟“

”وہ بہت ہیں۔ سیکڑوں ہیں۔ ہزاروں ہیں۔ اور انہوں نے فلم انڈسٹری کو اپنی سخی میں لے رکھا ہے۔“

”پر تم ان کا مقابلہ کیسے کر گئے؟“

”کیوں کر وہ سیکڑوں ہیں۔ ہزاروں ہیں۔ مگر لاکھوں نہیں ہیں۔“

”اور وہ لاکھوں تمہارے ساتھ ہیں؟“

”میرے ساتھ تو نہیں ہیں۔ لیکن میں ان کے ساتھ ہوں۔ کیا؟“

”میرے خیال میں تمہیں ٹھنڈے پانی کی ضرورت ہے۔“ رشید نے اکرم کو گروں سے بچڑا دیا۔

”کاسٹل کے نیچے رکھ دیا۔ اور اوپر سے تل چھوڑ دیا۔“

اکرم باخڑا کی کمزوری تھا۔ اس لئے جب اکرم نے باخڑا سے کہا کہ وہ اس کی بچہ نظر عرش

کی کدایت کامی نہیں سرانجام دے گا۔ تو باخڑا نے اسے بہت بھایا۔ بہت اونچی نیچ لگائی نظر عرش

کی بُری حالت۔ فاقوں کی تصویریں۔ بستل کا لالچ۔ اگر وہ۔ تصویر کا سیاب کر سکا تو آگے اپنی مرضی

کی تین چار تصویریں بنائے گا۔

”تم جانتے ہو؟“ باخڑا بولا۔ ”میرے ہاں تو ڈائریکٹر ہی بھی کچھ جانتا ہے۔ ایک طرح سے وہی کچھ کا

پہلو پر سر جڑا ہے۔ یہ یہ بھی اسی کے کہنے سے خراب ہوتا ہے۔ بس ایک دفتر میں کہانی پسند کروں،

اور وہ کامیابوں کا انتخاب ہو جائے۔ آگے میں کبھی دخل نہیں دیتا۔ میں تمہیں ابھی تمہاری مرضی کی تصویر دیتا

”گڑیا کروں۔ زمانہ خراب ہے۔ لوگ اچھا سبکیٹ (موضوع) چاہتے ہیں۔“

”اچھا سبکیٹ — کون سا ہوتا ہے؟“ اکرم نے پوچھا۔

”جو پلے؟“ باخولہ نے بڑے اطمینان سے کہا۔

”اچھا اداکار کون سا ہوتا ہے؟“

”جو پلے۔“

”اچھا سنگیت کون سا ہوتا ہے؟“

”جو پلے۔“

”بیرائی بڑود کر اور نا سنگیت کون کون اچھا آرٹسٹ ہے؟“

”نا سنگیت کون۔“

”حلق محمود اور بڑے غلام علی خاں میں سے کون اچھا ہے؟“

”حلق محمود۔“

”بال گنگا دھرتی کے بہت اور میڈی لاما میں سے کون اچھا ہے۔۔۔۔۔“

”کیا اسمان بات کرتے ہو؟“ باخولہ نے ذرا غصے سے کہا۔

اکرم بولا: ”میں تم کو بتاتا ہوں۔ میڈی لاما اچھی ہے۔ کیوں کروڑ چلتی ہے۔ اور بال گنگا دھرتی کا بہت

چروائی پر کھڑا رہتا ہے۔ تم بالکل ٹھیک کہتے ہو، اس دن تلک کی بری تھی، اور اتفاق سے اُسی دن

میڈی لاما بھی کے ہوائی اڈے سے گزری تھی۔ اس دن بھی کے ہوئی اڈے پر ہزاروں آدمی جیسے تھے

اور چروائی پر فصل سے چندہ میں آدمی ہوں گے۔ کیونکہ میڈی لاما چلتی ہے۔ بلکہ اُرتی ہے۔ اور تلک

اپنی جگہ کھڑا ہے۔ اس لئے میں غیر خوش نہیں بناسکا۔“

”کیوں؟“

”کیوں کہ تم ٹھیک کہتے ہو۔ تم جلتے ہو۔ اور میں بیٹھا ہوں۔ ایک دن نہوٹی بھی اسی طرح بیٹھا تھا۔ اور پھر ایک سب اس کی جھولی میں گرا اور زمین کی کشش ثقل دریاقت ہو گئی۔ ایک دن تہا را سینا نہ تھا ایک دن آپ کی تصویریں حرکت نہ کرتی تھیں۔ وہ ہلٹی نہ چلتی تھیں۔ وہ بیٹھی تھی۔ اس بیٹھے اور چلنے کے بیچ میں ایک ربع صدی کے سائنسدانوں اور محنتی آدمیوں کی ان تھک کاوشوں، ناکامیوں اور محو میں کی داستان ہے۔ ان لوگوں کا شکر ادا کرو سیٹھ جن کی وجہ سے آج یہ سینا پلتا ہے۔ اور تم لاکھوں کلماتے ہو۔“

”میں سوچ نہیں ہوں۔ جنس میں ہوں۔“ بانکرا یلے اسے یاد دلایا۔

اکرم نے کہا۔ ”سیٹھ ہر چیز جو کچھ چلتی ہے۔ کبھی نہیں چلتی تھی؟“

”اس دن میں اسے خرید لوں گا۔“ سیٹھ بولا۔

”تو جب تک مجھے خون نہ کھنکے دو۔“ اکرم نے اپنی منگنی بھیج کر کہا۔

”تم خون کیوں تم کو۔ تم کیلٹی ایک میں آرام سے کیوں نہ گھومو۔“ بانکرا یلے مسکرا کر کہا۔

”اپنا اپنا وصل ہے سیٹھ۔“ اکرم نے کہا۔ کسی نہ کسی کو تو یہ کام کرنا ہے۔ مگر میں تم سے یہ بات کیوں کر رہا ہوں۔“

اکرم اٹھ گیا، اور سیٹھ کی کہیں کا مددازہ کھول کے میڈم کے کہیں میں داخل ہو گیا۔ میڈم کے کہیں کا مددازہ کھول کے جوشی کے کہیں میں داخل ہو گیا۔ جوشی کے کہیں کا مددازہ کھول کے باہر ہال میں پلا گیا۔ ہال سے باہر نو بہارت پرودش کے دفتر کے باہر چلا گیا۔

سیڈم اور جوشی دونوں اُس کے چلے جانے کے بعد بانکرا یلے کے کمرے میں آئے۔ میڈم

نے پوچھا۔ ”نہیں ماما۔“

”نہیں۔“

”تو پھر تم۔ یہ کچھ بھی خوشی جی کو دے دو۔“
 ”مگر ان کے پاس پہلے ہی سے دو کچھریں موجود ہیں۔“
 ”کوئی بات نہیں سیٹو۔ میں اسے بھی غسل کروں گا۔“ خوشی جی نے کہا۔
 ”تجربہ؟“

خوشی جی انہیں خوشی سے پچھنے لگیں۔ اُسے اکرم خدا بھی پسند نہ تھا۔ سالاس طرح میری طرف دیکھتا تھا۔ جیسے میں کوئی موری کا کیڑا ہوں۔ آج حساب برابر ہو گیا۔

بابر اکرم دادہر میں روٹے گز رہا تھا۔ ظلم ایکسٹرا دیوین کے دفتر کے باہر بہت سے عیطل
 بھائیوں کے ہاتھ اسے سلام نہ نہ کھٹکے تھے۔ اکرم ہاتھ دلاتا ہوا آگے کے ایرانی رستوران میں
 چلا گیا۔ رگ آج بکے سلام کہتے ہیں۔ کیوں کہ ان کا خیال ہے کہ میں خیر خواہوں کا ڈاکٹر بن چکا ہوں۔ کل
 ان کا رویہ مختلف ہو گا۔ چلنے کی پیالی منگوانے کے اکرم سوچنے لگا۔ مگر کل تم کیا کرو گے۔ اکرم آج تم
 بڑے بہادر تھے۔ بڑے جبری۔ نہایت صاف گوشت تم نے خداؤں اور پیغمبروں کی طرح بات کی
 لیکن کل تم کیا کرو گے اکرم؟

چلنے بڑی کڑی تھی۔ اکرم کا دم رستوران کی کلوچی اور دھوئیں سے گھسنے لگا۔ وہ جلدی سے چائے
 پانی کے شواہی پارک کی طرف پیدل چل کر آیا۔ آج وہ سمندر سے باتیں کرے گا۔ یہ لوگ اُسے بھر
 نہیں سکتے۔

بہت دیر تک وہ شواہی پارک کے ساحل پر گھومتا رہا۔ اس کی بھری تھی ہوائی تھیں اور
 ہونٹ بچنے ہوئے اور اُس سے معلوم ہوتا تھا کہ ابھی اس کے دل کی بحث ختم نہیں ہوئی۔ پھر کیا

اکرم ساحل کی ریت پر چڑھ گیا وہ ٹھیکوں کی ریت بحرِ بحر کے گرانے لگا اور سوچنے لگا۔

زندگی بے بار نہیں آتی ہے۔ موت ایک بدلتی ہے۔ اہد وقت سمندر کے کنارے ساحل پر چلی ہوئی
اس بے کار ریت کی طرح ہے۔ تم۔ اکرم۔ اس میں سے ایک ہڈی کتنی مٹیاں بھر سکتے ہو
ایک۔ اور اکرم نے ریت سے ایک ٹھنڈی بھر لی۔ یاد۔ اہد اکرم نے ریت سے دوسری
ٹھنڈی بھی بھر لی۔ بس ایک ٹھنڈی یاد ٹھنڈی وقت۔ پچاس برس یا سو برس۔ مگر اس سے زیادہ نہیں۔۔۔۔
پھر۔۔۔ سوچو تم اس ریت کو کھا نہیں سکتے زیادہ سے زیادہ تم اس ریت کو دھروں کی آنکھوں میں
جھونک سکتے ہو۔ سینو یا کڑا لی طرح۔ اہد بہت سے لوگ اپنی زندگی میں یہی کرتے ہیں اور وہ لوگ
عالم جوتے ہیں۔ پھر کوہِ لوگ جوتے ہیں جو اسی ریت کو دھروں کی آنکھوں میں ڈالنے کے بجائے اپنی
آنکھوں میں ڈال لیتے ہیں۔ وہ لوگ جوتے اہد آخرت پسند جوتے ہیں۔ پھر لوگ اس ریت سے نعل بناتے
لگتے ہیں۔ اہد وہ لوگ احمق ہیں۔ پھر لوگ ہدایت اختیار سے ریت کے ایک ایک ذرے گئے گئے
وہاں۔ اہد وہ اس دنیا کے کچھ نہیں ہیں۔ پھر لوگ اس ریت کو اپنے سر پر اٹھا کر ڈال لیتے ہیں اور جتنے
لگتے ہیں۔ اہد وہ لوگ اس دنیا کے بچے ہیں یا اہد اس دنیا کی ساری خوب سہتی اہد مصروفیت انہیں
کے دم سے قائم ہے کچھ بھی جو جائے۔ اکرم نے سوچا۔ میں تجھ ہی بنوں گا۔
اور وہ ساحل کی ریت سے اٹھ کر گھر کی طرف چل کر آیا۔

رفیعہ بہت اُداس تھی۔ اس ماہ اسے کام بہت کم ملا تھا۔ وہ بھی دو چار بار رضیہ کی
 سفارش سے۔ اور دو ایک بار فوری مہرجت کے تحت ٹائر کیڑوں نے اسے سیٹ پر بلوایا تھا۔ منتظر
 سنا تھا۔ وجہ وہی پڑتی تھی۔ اور وہ جانتی تھی۔ مگر اپنی عادت سے مجبور تھی۔ اپنی ہنس کے ایک بچے کی
 بٹنی بکری سے بیٹے اس کے منہ سے بے اختیار اک آہ نکل گئی۔ کیوں کہ وہ بڑی بڑی اُمیدیں لے کر بیوی
 آئی تھی۔ کیا برا اگر اس کا رنگ سلاوا تھا۔ میک اپ کے بعد ظم میں سلاوا پس تو رکائی نہیں دیتا۔
 پھر اس کے چہرے کے نقوش اتنے بُرے تو نہ تھے۔ رضیہ نے وہ دیکر جو وہ اس وقت سی رہی تھی یہ
 خیال آتے ہی میں نریش پر چھوڑ دی۔ اسی آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اور خود سے اپنا چہرہ دیکھنے لگی
 وہ دل میں کہتی بار جب بھی اُسے موقع ملتا تھا ایسا ہی کرتی تھی۔ وہ اسلوم ہوتا تھا جیسے اس کے دل کے
 اندر کوئی مشہد ہے۔ بیسے وہ بار بار ملانے کی کوشش کیا کرتی ہے۔ اس وقت بھی اس نے ایسا
 ہی کیا۔ بُرے غمزے اپنے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔ دل ہی دل میں تجزیہ کرتے ہوئے اس نے اپنے چہرے
 ہلکے کان آٹھیں، ابرو، ہونٹ، دانت، وصال، ٹھوڑی اپنے چہرے کے ایک ایک عضو کو اپنے
 دہن کے پچ کاش سے کھول کر کسی شیش کے پرزوں کی طرح آئینے کی سٹا پر رکھ لیا۔ اور انہیں بُرے

ہتیاہ سے ٹکٹ پٹ کر ٹرل ٹرل کر رہ گئی کہ کہاں نقص ہے۔

عورت جب اپنا چہرہ دیکھتی ہے۔ تو سب بھول جاتی ہے۔ وہ دقت بھول جاتی ہے۔ ماحول بھول جاتی ہے۔ اور بھول جاتی ہے۔ کہ وہ کہاں کھڑی ہے۔ اس سے پہلے وہ کیا کر رہی تھی۔ اس کے بعد بے کیا کرنا ہے۔ مہر اپنا چہرہ اپنے دل کے اندر چھپا کر رکھتا ہے۔ لیکن عورت اپنے چہرے کو آئینہ۔ رخسار اور جوتھوں کی سطح پر باہر لے آتی ہے۔ اپنا چہرہ دیکھتے ہوئے رعبہ کو یہ احساس نہ ہوا کہ کب اس کی کھولی کا دروازہ کھلا۔ کون اندر داخل ہوا۔ اور وہ بے پاؤں آہستہ آہستہ آگے آتے ہوئے اس کے پیچھے کھڑا ہوا اس سے کہنا لگا کہ وہ اپنا چہرہ دیکھنے میں مصروف تھی۔

پھر کسی نے نہیں کر کہا۔ کیوں آگئے میں اپنی صورت۔ بھئی ہو۔ تم تو ذرا بھی خوب صورت نہیں ہو۔
اک جلی سی خیرت کی چٹخ مار کے پیچھے کوٹھری۔ یہ عشرت تھا۔ اور ایک سبز دھاریوں والی ٹی شرٹ اور نئی چٹون پہنے ہوئے۔ جو تھوڑے چمکائے ہوئے۔ اس کی لڑت دیکھ دیکھ کر شکر ا رہا تھا۔ بھل میں اُس نے ایک بٹنل ڈبا رکھا تھا۔

”یہ کیا ہے؟“ رعبہ نے پوچھا۔ اور اس کا دل دھڑکنے لگا۔

عشرت نے مسکرا کر بٹنل کھوا۔ اس میں سے پانچ سو فی ٹیکریں نکالیں۔ یہ رعبہ کی ہمیں کے بچوں کے لئے تھیں۔ پھر اس نے ایک قمیص اور چوڑی دار پانچ کھانے کا کپڑا نکالا۔ یہ رعبہ کی اماں کے لئے تھے۔ پھر اس نے بٹنل کا خالی کاغذ اٹھا کے کوڑکی سے باہر پھینک دیا۔ رعبہ خوش بھی ہوئی لیکن کچھ اُداس بھی۔ عشرت اس کے لئے کچھ نہیں لایا تھا۔ اور یہ تو تیس روپے عشرت نے اُسے دس دس کے تین نوٹ دیتے ہوئے کہا۔

”یہ کابجے کے لئے؟“ رعبہ کے دل میں ایک جلی سی امید کی کرن آہستہ سے جاگ۔

عشرت نے کہا ”تمہارے گھر میں رہتا ہوں۔ بولی کھانا ہوں۔ سوتا ہوں۔ تم کوئی سی سورت کی چارانی

ہو کہ تک خیرات بانٹے جاؤ گی ؟

رضیہ کو اس بد بولوں کی سخت ضرورت تھی۔ اس نے روپے لے لئے۔ ایک بار بھی اٹھا کر نہیں کیا۔ لیکن اس کا دل اندر سے جیسے میوہ گیا ہو۔ عشرت ایک ماوسے یہاں رہ رہا تھا۔ ان کے تعلقات بے تحاشت دوستوں کے سے تھے۔ وہ اسے بہت پسند کرتا تھا۔ لیکن اس کی عزت بھی کرتا تھا۔ اس کی قربت بھی ایک دُور ہی تھی۔ اور اس کے نزدیک آنے میں بھی ایک فاصلہ تھا۔ ایک خوش گواری جھکے ہوئی کسی قرضہ کو بیت اپنی معلوم ہوتی۔ کبھی کبھی کھل جاتی۔ کبھی بار باتوں اور بحثوں کے دوران میں رضیہ نے عموماً کیا۔ جیسے عشرت اسے عجیب سی محاکا ہوں سے دیکھ رہا ہے۔ جیسے اس کا دھیان اس کی باتوں میں نہیں ہے۔ اس کی محاکا رضیہ کے جسم پر چھپاتی ہوئی جا رہی ہے۔ رضیہ کو اپنے چہرے پر شبہ تھا۔ اپنے جسم پر شبہ نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ ایک بہت ٹہنی دل کش موتی۔ انہوں میں والے مناسب جسم کی مالک ہے۔ جو چلتے چلتے اکثر لوگوں کو لپٹ کر اس کی طرف دیکھنے کے لئے مجبور کر دیتا تھا مگر کیا ایک بار بھی تو ایک ماہ میں عشرت نے کوئی چھوٹی حرکت نہیں کی۔ اور وہ بگاہ قزاقی مصوم ایسی چھپتی ہوئی تھی کہ اس کا کچھ بھی مطلب نہ ملتی تھی۔ اچھا بھی بُرا بھی۔ شاید عشرت مجھے پسند نہیں کرتا ہے۔ مگر وہ چاہتی کیوں تھی کہ عشرت اسے پسند کرے۔ بلکہ کیوں چاہتی تھی۔ اسے تو ان باتوں سے شدید نفرت تھی۔ پھر وہ کیوں چاہتی تھی کہ عشرت ہر کوئی نہیں۔ لیکن عشرت ضرور چاہے۔ ایک بار ان محاکا ہوں سے اس کی طرف دیکھ لے۔ نہیں۔ نہیں۔ وہ کہاں دیکھا چاہتی ہے۔ منت بھیجی۔ اُجاڑا۔ اسی مردوں پر۔ بڑے سختے ہوئے ہوتے ہیں۔ عشرت نے کہا : اب تم یہ آئیے چھوڑو۔ اند جلدی سے ساڑھی بدل کے میرے ساتھ باہر چلی جاؤ۔

”کہاں ؟“

”کہیں بھی نہیں گے۔“ عشرت نے بڑی فراخ دلی سے اس طرح بانٹ دیا کہ کہا جیسے آج سنا دی

زمین اور آسمان اس کا ہو۔

”بھی ساڑی ٹیک ہے“ رضیہ نے ذرا شکوک لہجے میں اپنی ساڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اوں ہوں! نہیں چلے گی مادام“

عشرت کمر کی پر جگہ کے کھڑا ہو کے باہر دیکھنے لگا۔ رضیہ ساڑی بدلنے لگی۔

عشرت نے کمر کی سے ٹپے بغیر کہا: ”اب گوم کے دیکھ لوں“

”نہیں! نہیں“ رضیہ ایک کونے میں سے ہلائی: ”ابھی نہیں۔ میں ساڑی تبدیل کر رہی ہوں“

”اؤ کے! عشرت ہنسنے لگا۔

بائی کھلے شینڈ پر عشرت نے زور سے مٹی بکائی اور ایک خالی ٹیکسی پکڑ لگا کے بڑے زلفے

سے ان کے قریب آ کے فٹ پاتھ کے قریب کھڑی ہو گئی۔ رضیہ نے حیرت سے کہا: ”ٹیکسی میں؟“

عشرت نے ٹیکسی کا دروازہ اس کے لئے کھول کر اور بڑے احترام سے جھک کر کہا: ”مکے! عالم کے لئے“

رضیہ ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ اس کے قریب عشرت آ کے بیٹھ گیا۔ ٹیکسی کا دروازہ زور سے بند ہو گیا۔

”کہاں چلیں گے؟“ عشرت نے پوچھا۔

”تم۔ تم کو“ رضیہ کو اپنی آواز بڑی اجنبی معلوم ہوئی۔ عشرت نے چند لمحوں کے لئے سوچا۔ پھر اس نے

شکوک کے عجیبی ڈراما سے کہا: ”سینٹر کو لا پے چلو“

ٹیکسی ڈراما نے مسکرا کے اپنی ٹوپی ڈھیر کی، اور ٹیکسی کی رفتار کا ایک تیز کر دی۔ اور رضیہ ایک دھچکے

سے عشرت کی گود میں جا پڑی اور عشرت کے ترے ہوئے منتوں میں کسی پراسرار خوشبو کی تھک تیر گئی۔

رضیہ نے جلدی سے اپنے آپ کو عشرت سے الگ کیا۔ اور اپنی سیٹ پر احتیاط سے بیٹھ گئی۔ مگر وہ چاہ

لوں کا لمس بہت دیر تک کسی سار کے دم پہٹے سروں کی طرح اس کے دل و دماغ میں لڑتا رہا۔
 کولہے میں سوزین ایڈریڈ شوکی دکان پر عشرت نے جھکی کور کا اور رضیہ کو لے کر پلا گیا۔
 ہی ایک باگی چھری ایچوانڈین لڑکی سے کہنے لگا: "وہ شوکیں ہیں جو بزرگی کی اونچی اڑنی کی
 سینڈل ہے۔ وہ لے آؤ۔"

وہ لے آئی۔

عشرت نے رضیہ سے کہا: "ٹرائی کرو۔"
 سینڈل فدا بڑی تھی۔

سوزین بولی: "میں آپ کے ساتھ کا سینڈل لاتی ہوں۔"
 رضیہ نے وہ سینڈل پہن لی۔

"اب چلو" عشرت نے رضیہ سے کہا۔

رضیہ اپنی بزرگائی کو سمجھاتے ہوئے دکان کے اندر بچے ہوئے ٹاپے پر چلنے لگی جتنے
 چلتے خود خود اس کی کرکاخم داغ ہو گیا۔ سینہ ابھرا۔ چال میں ایک ٹگنت ادا دایا ہوئی عشرت
 نے تالی بجا کے کہا: "فرسٹ کلاس!"

سوزین بولی: "اسے باندھ دوں؟"

عشرت نے کہا: "اسے نہیں، اسے نہیں۔" عشرت نے رضیہ کے گبے ہوئے پُرنے چپلوں کی طرف
 اشارہ کیا۔

سوزین نے مسکرا کر انہیں ایک قہقہے میں مکہ دیا۔ عشرت نے وہ قہقہہ اُٹھالیا۔ پل ادا کر دیا اور رضیہ
 کے ساتھ آ کے باہر بھیجی۔ جیسی دالے سے کہنے لگا: "سیٹھ انڈیا گیٹ چلو۔"

انڈیا گیٹ پکا کر عشرت اور رضیہ دونوں ٹیکسی سے اترے۔ عشرت کی ٹیکسی میں پُرانی چپلوں کا

اُدب تھا۔ سمندر کے کنارے کنارے ایک اونچی دیوار تھی۔ عشرت نے بازو گھما کے زور سے وہ ڈبہ سمندر میں پھینک دیا۔ رُفیعہ چلائی رہ گئی۔

”کیا کرتے ہو کیا کرتے ہو۔ میری چیل؟“

عشرت نے کہا: ”مام۔ یہ پرانے پنڈر تھیں اچھے نہیں معلوم ہوتے۔ اب خدا اس اونچی ایڑی والے بزرگ کے سینڈل میں اپنی سبز ساڑی کو جھلاتے ہوئے چلو۔ دیکھو تمہاری خوب صورتی کا ہر غم کیسے جھلکتا ہے تمہارے جسم کا ہر انچ اس ساڑی کے باوجود کیسے چمک چمک کر باہر آ رہا ہے۔ مام تم عورت نہیں ہو غصہ دینی کی اٹلی سنس ہو!“

رُفیعہ کی آنکھیں یکایک سترت سے پکپکنے لگیں۔ حیرت۔ سترت اک نامعلوم سی حیرت تھی۔ بولی ”یہ آج تمہیں کیا ہوا ہے؟“

عشرت نے کہا: ”کوئی نہیں آج ہوا جی ہے۔ گل ہر کے پھول جھولتے ہیں۔ سمندر قہقہے لگاتا ہے بلووب کہاں چلوی؟“

رُفیعہ نے کہا: ”میں تو کتنی مٹھی پاٹ کھاؤں گی۔“

ہو پانی پر انہوں نے کتنی مٹھی پاٹ کھائی۔ وہاں سے کولا بے واپس جا کے انہوں نے سالز برگ میں آئس کریم کھائی۔ سالز برگ سے وہ لبرٹی کے سامنے گئے۔ جہاں رُفیعہ اور عشرت نے سگتے کے پھلوں کا رس پیا۔ یہاں لگی لگی بارش شروع ہو گئی۔ رس والے کے سینڈل کے نیچے کھڑے کھڑے عشرت لبرٹی کی بوتلوں میں رُفینوں کی جھلکیاں رُفیعہ کے چہرے پر گزرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ارغوانی۔ شہابی۔ گلابی۔ نیلم۔ یاقوت۔ فیروزہ۔ پھراج کتنے ہی خوب صورت جواہرات کے رنگ رُفیعہ کے چہرے پر سے گزرتے جا رہے تھے۔ اور وہ اس وقت کتنی خوش تھی۔ اپنے آپ میں کہتی ہوئی سانس تیز تر لیتی رہی۔ بچوں کی طرح خوش معصوم اور پُر اعتماد....

دھیرے دھیرے بارشیں جو رہی تھی۔

بارش روشتیاں، دھند، لوگوں کی گفتگو میں دوسری دنیا سے آئی ہوئی رقص کا ہم تنہا سبب، جوں جوں کسی پرانی، جہنی پر اسرار خوشبو میں، کا ہوا ہشت نے اپنی آنکھیں بند کر کے اس کا گھٹ پٹا پیدا آہستہ آہستہ ایسے دھندلے صفائے حواس کے ایک ایک قطرے سے حظ اٹھا رہا تھا۔

یہ ایک بارش تیز ہو گئی۔ اور دونوں ٹکسی میں جا پہنچے ٹکسی چلنے لگی بارش کے تیز چڑھنے سے زوردار گونج سے کانچ کی کڑکڑیوں سے ٹھکر کر پھٹنے لگے۔ باہر طعناں بڑھ رہا تھا۔ لیکن اندر کتنی خاموشی تھی۔ کتنا سکون تھا۔ وہ اور رضیہ کل پھر غریبی ہو گئی۔ اُور اسی، وہ جانکاہ محنت، لہو کا کیل، احساس کا دھوکا اور وہ غریب جو یہ سماج محنت کو ہمیشہ پس ہے، مگر آج، یہ اس وقت کا تو کس قدر قطرہ کشیدگی ہوئی خوب صورتی اور مسرت کا ہے۔

رضیہ نے سوچا۔ ہائے یہ کتنی صدیوں کے بعد آتا ہے۔ ہائے میں کیسے اس کا دامن بھر کے اس کے پاؤں سے پٹ پٹاؤں۔ تاکہ یہ ٹو کہیں بھاگ نہ جائے۔ میرے لمبے، میرے اپنے لمبے میرے اپنے پیارے لمبے آ میرے سینے سے لگ جا۔ میں تجھے اپنی چھاتی سے لٹکے لوری سنائیں گی اور تو میری گود میں۔ میرے سارے اوصاف سنوں، میرے سارے سیرے خوابوں کو دیکھنا ہوا۔ سو جائے گا۔ میرے فتنے لمبے.... سو جا.... سو جا.... !

معلوم نہیں وقت سو گیا، کر رضیہ کے احساس سو گئے، اس کے سارے شہر سو گئے، وہ جھلکی ہوئی راہیں اور عتیں، وہ خوف اور ڈر اور بے گناہی کے سوچوں سے ملنے سمٹ کر سو گئے اور اس نے ایک ایسی تازہ بھری، ایسی اطمینان کی، اٹکا اور بھروسے، مسرت اور خوشی سے لبریز آہ، جو اپنی اس جلد کے اندر سارے جہاں کی طرف ناگ فرمیں چیلے ہوئے تھی، کوئی اور اس طرح سے آہ نہیں بھر سکتا عورت بھی کبھی نہیں، ایک بار زندگی میں یا دو بار یا تین بار، لیکن بار بار نہیں، یہ آہ جو آہ نہیں ہوتی زندگی

کی گہری گھبراہٹ ہوتی ہے۔

رفیہ کب تکی سے اُتری تو ایسے لڑکھارہی تھی جیسے اس نے خوشی کی شراب پی ہو عشرت نے جسکی چھوڑ دی۔ اب وہ میرن ڈائیو کے آخری سرے پر کھڑے تھے۔ اور بند کے اُس کنارے کی طوت جا رہے تھے جو سمندر کے بیچ میں چلا جا گیا ہے۔ اب باش رنگ لکھی تھی اور چاند کی طوت دُسمند چھا گئی تھی۔ اور وہ دونوں خاموشی سے چھروں کے پتے پر بیٹھ کر سمندر کی بے قرار لہروں کو چھروں سے ٹکرا کر واپس جاتے ہوئے دیکھنے لگے۔

بڑی دیر تک خاموشی رہی۔ رفیہ اوپر سے خاموش تھی۔ لیکن اس کا دل ایک عیب تلپ اور بے قراری سے بھر گیا۔ بے قراری جو بولتی نہیں ہے۔ لیکن دل میں ایک خنجر کی طرح چھپی رہتی ہے۔ عشرت رفیہ کو ایک پرانی منزل بتانے لگا۔

فرز اس کمرچی رفیہ خاموش رہی۔ سمندر کی لہروں کی طوت سمجھتی رہی۔
 لکھو سے کے بعد رفیہ نے کہا۔

”عشرت!“

عشرت رفیہ کی طوت دیکھنے لگا۔

رفیہ نے کہا: مجھے بھوک لگی ہے۔

عشرت نے کہا: یہاں جنوں کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔

”چنے ہی ملے آؤ۔“

لکھی لکھی سردی میں گرم لکھنے۔ نمبر نمبر بٹنے ہوئے جنوں کی خستہ روی۔ وہ ہونٹوں کے اندر سے کڑک کڑک کی دھیمی دھیمی آواز۔

رفیہ کافی جنوں کے لئے چھا اٹھا عشرت چنے لینے چلا گیا اور دیر تک عشرت کو دھند میں غائب ہونے

ہوئے کھنٹی رہی۔ اے خدا! یہ منظر کس قدر حسین ہے۔ وہ تو اس لمحے تاج کبھی نہ تھی وہ تو اس لائق نہ تھی کہ کبھی ایسی خوب صورتی کے نازک نقوش چھو سکتی۔ یہ گہری پراسرار دھند جو دنیا کی بد صورتیوں کو اک ہر ایک اس کی طرح ڈھک دیتی ہے۔ اور خوب صورتیوں کو ابھار دیتی ہے۔ برہنہ ہوتی چیزوں کو اپنے ہاوس میں آرام سے سلا دیتی ہے۔ اور ساکت چیزوں کو پہنے کی قوت عطا کرتی ہے۔ رخصی نے گھوم کر اندر دیکھا بدھ عشرت غائب ہوا تھا۔ میرین ڈائری کی بندھنیں سلج سے اوپر اٹھ گئی تھیں۔ اور دھند میں پٹے ہوئے جہانوں کی طرح اپنے روشن کالج کی کھڑکیاں کھولے ہوئے تیر رہی تھیں۔ اور ان بلا لگوں سے پرے ایسی تھیں کہ آخری گر جانا منزل کسی بار بانی جہان کے لاجبے مستول کی طرح دھند میں ڈھنپتی ہوئی سلو ہوتی تھی۔ اور بیک ذریعے غمی سے مگر چھوٹے چھوٹے ڈھنگوں کی طرح اپنے فکر سے اکڑ کر دھند میں بچے جا رہے تھے!

پھر رخصی نے دھند میں آتے ہوئے عشرت کا چہرہ دیکھا۔ اور وہ لمحہ اور وہ چہرہ ہمیشہ ہیشہ کے لئے اس کی روح پر ترسم ہو گیا۔ وہ چہرہ کبھی بھول نہیں سکتی۔ دھند میں لپٹا ہوا۔ خاموش خوب صورت۔ آنکے جڑتا ہوا چہرہ۔ وہ چہرہ جیسے اُس کی طرف مٹتا ہوا آ رہا تھا یا اُس سے بھی پہلے کسی پہلی ہوئی لامتناہی دنیا کی طرف تک رہا تھا۔ کیسا خاموش مٹتا ہوا۔ اپنے آپ میں کھڑا ہوا۔ گھد کسی دنیا کی گھڑا مٹتا ہوا۔ وہ چہرہ آ رہا تھا۔ اور یکایک رخصی کا دل خوف سے لرز گیا۔ ایک لمحے کے لئے اس کے دل میں خیال آیا کہ یہ چہرہ کہیں دھند میں غائب ہو جائے گا۔ اس کی آنکھوں کے اوپر سے تیرا ہوا۔ ان بلا لگوں، دھند لگوں، روشنیوں پر تیرتا ہوا دھند کے اجنبی پراسرار سیاہ و سفید راستوں پر چلا جائے گا۔ جو زندگی اھ موت کے بلا سے ہیں۔

مگر نہیں وہ چہرہ قریب آ گیا۔ قریب آ گیا۔ بالکل اس کے قریب آ کے جھک گیا اور اس وقت رخصی کے سامنے اس کی آنکھوں میں بھٹ گئے تھے اور نہ وہ کچھ سن سکتی تھی، نہ دیکھ سکتی

تھی، نہ محسوس کر سکتی تھی۔ سرف بہ ایک چہرہ تھا۔ ایک وہ تھی اور کچھ نہ تھا۔ تاریک سمندر تھا۔ تاریک زمین تھی۔ تاریک وحشت تھی۔ اور وہ چہرہ تھا۔ روشنی کے کنار کی طرح طوفان میں بلند اور مضبوط اور جامد۔ رضیہ نے بے قرار ہر عشرت کی بانہہ پکڑ لی۔ عشرت نے جنوں کی پٹریاں سے دیتے ہوئے کہا ”بڑی بھوک ہو!“

بھوک تو وہ ہے۔ مگر عشرت کیا تم میری اس بھوک کو کھو سکتے ہو۔

عشرت نے سمندر کی لہروں میں چنے کا ایک دانہ پھینکتے ہوئے کہا ”رضیہ آج میں بہت خوش ہوں۔ آج مجھے خوشی جی کی کچھ سی ایک چھوٹا سا دل ملا ہے۔ بہت چھوٹا سا ہے۔ اگر دل ہے۔ اور یہ وہی خوشی جی ہیں جنہوں نے مجھے فلم ٹسٹ میں خیل کر دیا تھا۔ آج انہوں نے مجھے ایک سو روپے ایڈوانس میں دئے۔ اب ہم۔۔۔ اب ہماری حالت وہ نہیں رہے گی؟ یہ ہم۔۔۔ ہائے لوگ کن ہیں۔ رضیہ کا دل کانپنے لگا۔ وہ کچھ پوچھنا چاہتی تھی۔ مگر چپ رہی۔

عشرت ہونے ہوئے کہنے لگا۔ جیسے اپنے آپ سے کہہ رہا ہو ”اس ماہ میں نے تین سو کئے ہیں۔ اگلے ماہ چار پانچ سو کما لوں گا۔ پھر ہم یہاں بمبئی بازار کی اس گندری کھولی میں تھوڑی دھیرے کے، کوئی عمدہ چھوٹا سا ٹیکسٹ ایس کے۔ ایک کروڑ تیار ہو گا۔ ایک میرا۔ ایک آماں اور تیروں کے لئے۔ ایک سو روپے ہر ماہ اپنی آئی کو بھیجا کروں گا۔ پھر ہم....“

پھر وہی ہم۔۔۔ رضیہ نے گویا اندر سے اپنے کان بند کرتے جھوٹے اپنے آپ سے کہا۔ ہیں ہم کو مت سنو۔ اس ہم کے قربت جاؤ۔ جس ہم کو اندر مت لئے دو۔ دیکھو تم کیسے کانپ رہی ہو۔ یہ ہم کوئی نہیں ہے۔ یہ کہیں نہیں ہے۔ یہ ہم تو بالکل اجنبی ہے۔ یہ ہم جراثیم کی ہوائوں میں آیا ہے اور محبت کی جیسی آواز ہم کے آیا ہے۔ اس ہم سے نکلی بھوک۔ رضیہ اپنی روح کی ساری کھڑکیاں روشن دان بند کر لو۔ اور اس ہم کو کبھی بھی مت آئے دو۔

مجموع ہر روز یہاں میرے لئے آئیں گے۔ اور کیسے خوش خوش گوارا کریں گے ہم۔ عشرت نے
 رفیعہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ سنو رفیعہ تم اور ہم۔۔۔ پھر وہی ہم؟ یکایک رفیعہ نے کان ہی نہیں
 آنکھیں بھی بند کر لیں۔ اور اپنی صبح کا سارا انداز اس ہم کو تھمنے میں لگا دیا۔ پھر اُسے معلوم بھی نہ ہوا،
 کہ وہ کیا شے رہی ہے۔ عشرت کیا کہہ رہی ہے۔ اُسے صرف اتنا معلوم ہوا کہ آنکھیں بند نہ کرنے کے بلکہ جلد سنو
 باطل ہے اختیار ہو کہ اس کی آنکھوں سے بہہ رہے ہیں۔ وہ سبک رہی ہے۔ اور ماری ہے۔ اور
 ہم اس کی ساری کوششوں کے باوجود روشنی کی ایک ٹکیر کی طرح سارے بندہ بانوں اور کمر پہن
 اور دشتہ والوں سے گزرتا ہوا اس کی صبح کے کولے کولے کو متور کر رہا ہے!
 رفیعہ بے قرار ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

دور کہیں کسی بلڈنگ میں کالچ کی کوئی روشنی کھڑکی کھلی اور موسیقی دھند کے بیابان پر بجتی ہوئی
 اس کتاب سے آگئی، جہاں عشرت اور رفیعہ کھڑے تھے۔ ایک دوسرے کی طرف خاموشی سے دیکھتے ہوئے
 دھڑکے عشرت نے رفیعہ کو کھینچ کر اُسے اپنے بازوؤں میں لے کر اپنے گلے سے لگا لیا۔ رفیعہ کا سارا
 جسم کانپا۔ اور پھر کانپ کر یک بارگی عشرت کی باہوں میں گھس گیا۔

اس خاموشی کے باہر غریب تھی اور بے کاری۔ اور زندگی کے سارے تلخ مسائل۔ رفیعہ نے سوچا لیکن
 اندہ اس خاموشی کے اندر چند لوگوں کی ممانعت ہے۔ اور موسیقی کا شکوہ اس کی غفلت اور سلطنت غیب کی
 کاہلوں میں کا کوئی کتابہ نہ تھا۔ چند لوگوں کے بعد وہ اس خاموشی سے باہر ملے گی۔ پھر اسی گھنٹی جس
 نے انسانی اور ناپاسی کا مقابلہ کرے گی۔ مگر ان چند لوگوں کے لئے۔ تو وہ اس لازوال موسیقی سے
 اپنی صبح کو قوت اور طاقت سے سمجھ کر سکتی ہے!

موسیقی بالمشائیہات کے پھولوں کی طرح ہکتی ہوئی۔ موسیقی پُر مسرود و محض کی لہریں ہر ڈھلتی
 ہوئی۔ موسیقی کسی دیوانی گشتی کے مغرور بادبان کی طرح اپنا سینہ پھیلانے دھند میں بہتی جا رہی تھی۔

دعند بہتی گئی۔ بہتی گئی۔ یاکہ : فیہ۔ نے محسوس کیا۔ وہ اور عشرت دلوں اکیلے کھڑے ہیں۔ محبت
 کے ایک جزیرے میں۔ اور چاروں طرف وقت بہہ رہا ہے !!!

روحانی سٹوڈیو انڈیری میں جوشی جی کے سیٹ پر بڑے نعل کی بحث چل رہی تھی بحث کہنے والے تھے۔ جوشی اور اکرم اور سٹوڈیو کے سیٹ پر تھے۔ جوشی جی کے سیٹ پر تھے، کیمرو میں، راج لا اور شتاؤ۔ چند لپٹنے والی لڑکیاں جہاں میں وہ بیٹھی تھیں شامل تھیں۔ سیٹ بہت بڑا تھا۔ قسریہ گوسا جی تھی۔ لیکن سیٹ فیملی میں بیٹھی تھی۔ راج لا ہیرو کے فراق میں مدد کے لئے سوچا جاتا ہے۔ اور خوب میں ایک منظر دیکھتی ہے۔ جو اس سیٹ میں دکھایا گیا تھا۔

لیکن جوشی اور اکرم کی بحث اس سیٹ یا اس سیٹ میں تھے جلتے والے شاطی سے متعلق تھی۔ جب سے اکرم نے غیر خوش کی ہدایت کاری پر لات ماری تھی۔ اس کی بے ہودہ گاری بڑھ جاتی تھی۔ اور اب تو اس کے خوب صورت چہرے پر بھی نمایاں ہو چکی تھی۔ اکرم نے پریشانی بھگتے بھگتے شروع کر دی تھی۔ جوشی جی نے اکرم پر ترس کھا کے (اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ترس کا مقام کا ہوا چہرہ ہے) اُسے نایک کا ایک منظر گیت میں بانٹنے کے لئے دیا تھا۔ آج اکرم وہ گیت لے کے آیا تھا۔ وہ اصل اکرم کوئی اور ہی گیت اور نایک کا کوئی دوسرا ہی منظر لے کے آیا تھا۔ اور اس نے بھی جوشی جی نے اس کا گیت ناظر کو دیا تھا۔ ویسے اگر وہ گیت انہیں دل سے پسند ہی ہوتا۔ پھر بھی وہ اُسے ناظر

کہتے۔ انہیں دراصل اکرم سے کوئی نگیت کھونا نہیں تھا۔ مرنے آئے ذلیل کرنا مقصود تھا۔ اس وقت بحث کا رخ تیزی کی طرف تھا۔

جوشی جی نے سامنے پڑی ہوئی تپائی پر اتنے زور کاٹکا مارا کہ تپائی الٹ گئی۔ اہل بھجوا کا جو کہ بڑے۔ انہیں اکرم بھائی۔ نہیں چلے گا۔ یہ گیت مجھے اپنے ڈانس میں نہیں چاہئے۔ کہ اس طرح کا گیت لکھو۔ رات جوں ہے۔ آسان پر چاند ہے۔ میرے پاس آ جاؤ۔

اکرم نے کہا: مگر ہر ڈانس کے بول تقریباً ہی ہوتے ہیں۔ رات جوں ہے۔ آسان پر چاند ہے۔ میرے پاس آ جاؤ۔ تمہارے اسی سیٹ کے ناچ کے بول بھی تقریباً ہی ہیں۔ کیا ناچ اس کے سوا اور کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ تمہارا ناچ یہ بھی تو کر سکتا ہے۔ دھوپ ٹھیکلی ہے۔ گیموں کی باتیں سرسراتی ہیں۔ آؤ کام کرو۔

یا

دل بکلا رہا ہے۔ چنی سے دھواں نکل رہا ہے۔ سوت کے گولے انسان کے ہاتھوں کے منتظر ہیں۔

یا

برون نے سارے راتے بند کر دیے ہیں۔ مگروں سے کوئی باہر نکل نہیں سکتا آؤ برٹ ہٹائیں۔

تمہ نے (RED SHOES) میں جوتوں کا ڈانس دیکھا تھا؟ اور اخبار کا ڈانس کنٹا دلکش انداز میں تھا۔ ہم لوگ کتابوں کا ناچ شال کے طور پر کیوں نہیں دے سکتے؟

جوشی جی نے اکرم سے کہا: اے بھائی میرے۔ تم اپنا فلسفہ یہاں مت لاؤ۔ اپنے کو کچھ اور نہیں چاہئے۔ اپنی کوئی تجربہ کرنا نہیں اگتا۔ کوئی خطرہ مول لینا نہیں اگتا۔ اپنی تو یہ ڈانس ہی گم پر کر

ہیں ہی دے گا۔ رات جوں ہے۔ آسمان پر چاند ہے۔ میرے پاس آ جاؤ۔ ہم تمہاری طرح ناکام ڈاکٹر کیلے
 ہوں انہیں ہاتھ۔ اپنے کو کوئی اور ناپ نہیں چاہئے۔ کوئی اور گیت نہیں چاہئے۔ کوئی اور خیال نہیں چاہئے
 تم کو یہ ملتا ہو تو اسی خیال کو گما کر دوسرے دل میں باندھ کے لاؤ۔ بھوکا مڑا ملتا تو انڈیا میں ہے
 باہر جاؤ ۛ

”مگر ملک اور قوم ... ۛ

”ایسی کی تھی ملک اور قوم کی۔ سب سے پہلے اپنی جیب گرم کرو۔ دیکھو بھائی۔ ہمارا نیا سر پر ڈیوٹر
 باغیچہ یا سیٹھ بھی کرتا ہے۔ اس کا ڈشری جو ٹرالا بگت لال بھی کرتا ہے۔ اس کا انگریز چور ٹھوس بھی
 کرتا ہے۔ اور پھر آگیا (مدا) آڈٹس (ماضی) کی منگلتا ہے ۛ

”تم لوگوں کی یہ بات میں نہیں مانتا کہ لوگ ہمیشہ اسی طرح کی شاعری کو پسند کرتے ہیں بے شک محبت کی
 شاعری کو بہت پسند کرتے ہیں ۛ اکرم نے کہا ۛ اور یہ ایک بڑی خوب صورت چیز ہے۔ انسانی
 محبت، سماج کی بہترین قدوں میں سے ہے۔ لیکن آپ محبت کے ساتھ ساتھ سماجی ماضی کی پاشنی
 بھی دے سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر فیض کی شاعری ۛ

”کون بچے؟ راج تاکے کان کھڑے ہوئے۔ کیوں کہ بیرونیوں میں وہی اتل کوٹیل بھی جاتی تھی۔
 شمشاد بھلا کہاں بچے رہنے والی تھی۔ اس نے بھی مقدمہ دیا ۛ ”ہیں تو کم ذات کی خدیں بہت پسندیں۔
 اس وہی تو لے سائی تھی نا؟“ شمشاد راج لاکھوت دیکھنے لگی۔

راج لاکھوت نے اُسے ٹوک کے کہا ۛ ”اکی کم ذات نہیں ہم زاد۔ تجھے دس بار بتایا ہے ۛ

”ہاں ہم زاد، ہم زاد ۛ شمشاد نے دیہاتیوں کی طرح اپنے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے خدا سا منگلتے
 ہوئے کہا۔ وہ نہایت ہی خفیت سا، بالکل بچوں کی طرح کبھی کبھی خدا سا منگلتی تھی۔ اور لوگوں کو اس کا
 یہ منگلتا اس قدر پسند تھا کہ اُس کی ہر تصویر کے مکالموں میں اس کا جگہ جگہ خیال رکھا جاتا تھا۔

ادب اور آرٹ پر جب اثر شری کی دو مہذب ہیر و تیں۔ اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں تو
اکرم خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد اُسے کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس نے فانی بخل میں دبایا اور چپکے
سے سیٹ سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد جوشی جی نے نوک کا ایک تہقبہ نکالیا اور بولے "آج
میں جی گلو سے اثر شری کی حالت ٹھیک کرنے۔ اپنی پتلون کی حالت کو ٹھیک کر نہیں سکتے۔
اس پر ایک زور کا تہقبہ چڑا۔

"ایکسٹراڈائنس گرلز آن دی سیٹ آ جوشی نوک سے اعزازی میں چٹلایا۔ اور رفیعہ رضیہ اور ولایت بیگم
اور دوسری لڑکیاں جلدی سے سیٹ کی طرف بھاگیں۔ بابو لال انہیں ہدایات دینے لگا۔
جوشی جی نے بابو لال سے کہا "لڑکیاں اس شاٹ میں نوک سے کوٹے ٹکڑے لے سکتی ہیں۔ لاٹک
شاٹ ہے۔ سنو ونگ شاٹ پر اعتراض نہیں کرے گا۔"

پھر جوشی جی نے فکر کشاد اور راج تاسے کہا "ولبرو، جم بھی میک آپ کر لو۔ اگلا شاٹ آپ کا ہے؟
راج لا اور کشاد میک آپ روم میں جا بیٹھیں۔ کشاد نے راج تاسے کہا "مجھے بے چارے انکم
پر براترس آتا ہے؟ راج لا بولی "تو جانی۔ بلالانا اُسے اپنے پاس۔ ویسے دیکھنے میں خاصا
خوب صورت ہے۔"

کشاد سن کر میک آپ کرنے لگی۔

اُن کے میک آپ روم سے دھڑکے پرے ایکسٹراڈائنس کا میک آپ روم تھا۔ وہاں ایک
نکل خپا وہ برپا تھا۔ جیسے ان لوگوں کے میک آپ روم میں ہمیشہ جڑا ہے۔ کشاد نے یہ خود شری کے راج
سے کہا "جانی یہ نکلا ہوا دروازہ تو بند کر دے۔ یہ لو فر وگ اس تہقبہ پہاتے ہیں۔"

راج تاسے کی جانب ٹری۔ ایک سلسلے سے اُس نے عشرت کو ایکسٹرا میک آپ روم
کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ بنزنگ کی وعلادی دارٹی خرٹ اور بھوری بولی پتلون میں وہ بہت

جج رہا تھا۔ راج تھاکا ایک دروازے پر کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ پھر سانس اندر کھینچ کے برلی : ہائے ششاد
بالکل ایلین لاڈ ہے :

”کہاں؟“ ششاد ڈسٹنگ ٹیل سے بھاکی بھاکی دروازے پر آئی۔ عشرت ان دونوں کی طرف پیٹ کے
ایکسٹر ایک آپ دم کی طرف جارہا تھا۔ دروازے پر جگہ کے وہ ٹکا۔ اور خدا سا گھوم کے اُس نے راج تھاکا
کی طرف دیکھا۔ راج تھاکا ششاد دونوں جلدی سے دروازے کی اوٹ میں ہو گئیں۔ راج تھاکے ششاد کا
ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کے کہا : دیکھ! کیسے دل دھک دھک کر رہا ہے :

ششاد نے کہا : جج جج۔ بالکل ایلین لاڈ ہے :

راج تھاکے کہا : اور بے چارہ ایکسٹر میں کام کرتا ہے۔ ہائے کی کم نچی :
ششاد نے سنی خیر صحیح ہیں سے راج تھاک کی طرف دیکھ کر پوچھا : کس کی کم نچی آئی ہے ؟
مگر راج نے کوئی جواب نہ دیا پھلے کر اپنے ابرو دھرت کرے گی ۔

شام کے پانچ بجے کے قریب رہیہ کا آخری شاٹ ختم ہو گیا۔ عشرت کمرن ایک شاٹ

باقی تھا۔ رنہ نے عشرت سے کہا : میں کہیں میں ہل کے منتی ہوں :

عشرت نے کہا : ”اے تم ہلو۔ میں ابھی آتا ہوں :“

اس کے کئی مین منٹ کے بعد عشرت کا شاٹ بھی ختم ہو گیا۔ اور جوشی جی نے تمام ایکسٹر لوگوں کو منہ دی
اب منٹ دو کلزا پ باقی تھے۔ ایک ششاد کا۔ ایک راج تھاکا

راج تھاکے کہا : ”میرے سر میں درد ہوتا ہے :“

جوشی جی نے کہا : ”میں ایک ہی تو شاٹ ہے :“

راج لا جلدی سے بولی : کل ے لینا۔ اس وقت مجھے جانے دو، سر پٹا جا رہا ہے ۵

یہ کہہ کر بعد خوشی ہی کی مزید گفتگو نے بغیر راج لا جلدی سے سیٹ سے باہر نکل آئی کیٹشیں راتے میں پڑنا تھا۔ لیکن کیٹشیں سے پہلے شیخ سے باہر ایک کھلی جگہ میں راج کی گاڑی پارک کی ہوئی تھی۔ راج جلدی سے میک آپ اپنا اُتارے بغیر گاڑی کا دروازہ کھول کے اُگے بیٹھ گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد عسرت میک آپ دم سے اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے باہر نکلا اور کیٹشیں کی طرف چلا۔ راتے میں اس کے کانوں میں کھنکھائی مچاں جاوے ؟

عسرت نے پلٹ کے دیکھا۔ راج لا جلدی میں تھی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”جی ہاں ؟ عسرت نے پوچھا۔ اس کے کانوں کا اعتبار نہ رہا تھا۔

”آپ — آپ کہاں جا رہے ہیں ؟“ راج قلقلے پوچھا۔ ”میں آپ کو چھوڑ دوں ۵

عسرت کے منہ سے بے اختیار نکلا : ”میں بھڑی بازار میں رہتا ہوں ۵

”آئیے بیٹھے۔ میں آپ کو وہاں چھوڑ دوں گی ۵“ راج نے اپنی گاڑی کو سٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

گر بس ایک۔ صرف ایک لمحے کے لئے۔ عسرت بچکھپایا۔ پھر وہ گاڑی کے اندر بیٹھ گیا۔ راج نے گاڑی سٹارٹ کر دی۔ گاڑی دھیرے دھیرے بڑھتی ہوئی کہیں کے سڑک سے گزرتی تھی وہ دیکھ کر عسرت ”

رضیہ نے رضیہ کو زندہ سے ٹھوکا دیا۔ دونوں ایک بچی پر غمی پلے پڑ رہی تھیں۔ رضیہ کے ہاتھ سے پیالی گئی اور فرش پر چھینے سے ٹوٹ گئی۔ مگر رضیہ کو کسی بات کا ہوش نہ تھا۔ وہ ہماگ کر سڑک سے ہٹ کر گئی ہوئی۔ اب کار اُگے جا چکی تھی۔ راج اور عسرت کا رخ بھی وہ دیکھ سکتی تھی۔ وہ دھڑکے ہوئے تھیں۔

دھندھاری تلوار کی طرح اس کے سینے میں چل گئے۔

آہستہ آہستہ راج کی گاڑی سٹوڈیو کے دفتر کے سڑک سے پلٹ کر آگے بڑھے گیٹ کی طرف

ٹری اور پھر لنگروں سے اوجھل ہو گئی۔ رضیہ نے رضیہ کا ہاتھ زندہ سے پکڑ رکھا تھا۔

رضیہ چلائی "اری کیا کرتی ہے۔ بھتیجی! ناخن کاٹ دے میری کلائی میں "۔

گھاڑی اندھیری سے محلی۔ سٹیشن کے گیٹ سے گزری۔ بچی کی جانب مڑی۔ ولے پارے گیا
ساتا کر دیا۔ کھا گیا۔ لیکن گاڑی بھنڈی بازار جانے کے لئے پاندرہ کی طرف نہ مڑی۔ پالی ہیل کی
جانب گھوم گئی۔ جہاں راج لٹا کا بنگلہ تھا۔

رضیہ رضیہ کو کچھ پس لے گئی۔ لیکن کبھی کبھی انسان آنکھیں جوتے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکتا
کان ہوتے ہوئے بھی نہیں سُن سکتا۔ تصویریں رضیہ کی تپلیوں بے پھسل کر جتنی چلی جا رہی تھیں۔ اس
کے دماغ کی تہوں میں نہیں پہنچ رہی تھیں۔ اداکار گنگو کر رہے تھے۔ مگر ان کا ایک فنکار بھی رضیہ کے کان میں
نہ پہنچا تھا۔ اس کے کانوں میں تو کوئی سمند کی طرح گرج رہا تھا۔ اور اس کی آنکھیں ایک گاڑی کو دیکھ
رہی تھیں۔ جو دیرے دیرے چلتے ہوئے اس قدر اس کے قریب آ جاتی کہ اسے محسوس ہونے لگتا
جیسے وہ اس گاڑی کے نیچے آ کے دب جائے گی۔
رضیہ نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

"تصور نہیں دیکھنے کی؟" رضیہ ہمدردی سے بولی۔

رضیہ نے کہا "میں ابھی ہمدردی سے آئی "۔

لیکن وہ واپس نہیں آئی۔ رضیہ جانتی تھی کہ وہ واپس نہیں آ سکے گی۔ تو بھی اس نے اسے
جلنے دیا۔ کبھی ایسا لگا تھا ہے کہ ہمدردی کا ہر لحاظ ناکارہ ہے۔ کار ہر حال ہے رضیہ نے سوچا۔ جلنے دھ

خود ہی ٹیک ہو جائے گی :

”کرت کا کر رفیہ سیدھی گھر گئی۔ مگر عشرت ابھی تک نہ آیا تھا۔ رفیہ کھانا تیار کرنے لگی کھانا تیار ہو گیا مگر حضرت پوچھ ہی نہ آیا۔ رفیہ نے تجوں اصرافی کو کھانا کھلا دیا۔
 اسی نے پوچھا ”اور تو ———؟“

”مجھے بھوک نہیں ہے“

”عشرت کہاں ہے؟“ اتنی نے پوچھا۔

”اس کی شوٹنگ ہے“ رفیہ نے جھوٹ کہہ دیا۔

”اتن غور سے رفیہ کا چہرہ دیکھنے لگی۔

فوجی گئے۔ عشرت نہیں آیا۔

ایکایک رفیہ بے قرار ہو کے اپنی جگہ سے اٹھی۔ اتنی نے اس کا ہاتھ پھڑپھڑایا ”کہاں جاتی ہے؟“ اس نے لڑتی ہوئی صداک ادا کر میں پوچھا۔ ”جہنم میں!“ رفیہ اپنی اتان کا ہاتھ پھڑپھڑانے لگی۔
 ”سے باہر نکل گئی۔

کتنی ہی پُر تپ گلیاں تھیں کتنے ہی اندھیرے راستے تھے۔ کتنے ہی روشن باز تھے، کتنی ہی بسیں، فرا میں۔ وہ کہاں گئی۔ کدھر گئی۔ کہاں فرا میں بیٹھی۔ کہاں بس میں۔ اسے اس کا کچھ پتہ نہ تھا۔ وہ کسے تلاش کر رہی تھی۔ کہاں گم رہی تھی۔ کس سے بھاگ کے کہاں جا رہی تھی۔ تمام ظلمت، تمام مجرور بار۔ ”فی ساری صدی اس کے لئے مر گئی تھیں۔ موت اس کے دل کے دروازے پر کوئی نہ نہ نہ سے ہتھوڑے ادا ہوا تھا۔ جھٹ! جھٹ! جھٹ! کیا جہنم میں شیطان انسان کے دل کو اسی طرح کھجکا کرتا ہے؟

راج لا عشرت کو ساتھ لے کر اندر سے ایوان فرزندیں گئی۔ ایوان سے وہ دونوں خانز
 میں گئے۔ خانز سے گھڑی تاج کے پیچھے ڈیاس اینڈ سنز کی پورچ میں جاٹکی۔ وہاں سے گاڑی بورس
 ہوئی۔ گاڑی کی پہلی سیٹ پر تیار شدہ سوٹ۔ نائی لائن کی روانہ جڑا ہیں۔ جیک کارڈز کی ٹائیاں پکڑ
 زمین کی ہیٹ برادگ کے جوتے۔ کیمیری سو مال اور پیرس کارڈز پر سے تھے۔ گاڑی پھر وہاں سے ہٹو
 کی طرف ہوئی۔ اور پالی ہیل پر چلی گئی۔

جب عشرت غسل خانے میں نہانے کے لئے گیا تو ابھینو نے اپنی بہن سے پوچھا۔
 ”یہ کیا؟“

”شٹ اپ! راج لا گرج کے بولی۔“

ابھینو نے جیرا بل کے فوراً فوٹی یوٹ جلتے ہوئے کہا: ”اکل رائٹ لام!۔۔۔ گراہک چل اس
 خاکسار کے لئے بھی نے آئی ہوتی۔ رشتے میں بھائی ہوتا ہوں۔“
 ”یوٹ اپ! راج لا پھر ملو کے بولی۔“

”بہت اچھا دام! ابھینو نے کہا: میں اپنے کمرے میں چلا ہوں۔ مگر اس وقت کی بھنگ کے لئے
 —۔۔۔ لٹکی فوٹ ہو رہی ہے“ راج نے اُسے بڑے سے دس روپے نکال کے دئے۔ ابھینو
 فوٹ کو انگلیوں میں حقارت سے گھماتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ دیر تک راج وہیں اپنے کمرے کے
 باہر کھڑی سوچتی رہی۔ پھر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

بڑی صاف شستری ہلکی ہوئی رات تھی۔ آسمان تاروں سے خراب۔ زمین روشنیوں سے
 منور۔ راج پورچ کی میز میں سے اتر کر ٹھکانی ہوئی بجھے کے باہر آگئی، جہاں اس کی گاڑی کھڑی تھی

آج وہ مات کے وقت شکر کو اپنے شوہر ڈرائیور کو نہیں لے جا رہی تھی۔ اس وقت اس نے گولڈرے ویکہ کا فریک پین دکھا تھا۔ بالوں میں پھروں کے بجائے سفید کوہر تھکے جواہرات کی دینی گاہ تھی۔ اور وہ اس وقت گاڑی کے مٹھا روٹے لگی ہوئی گیت گنگنا رہی تھی۔ اور عشرت کا انتظار کر رہی تھی جو ابھی اندر اپنے کمرے سے باہر نہ آیا تھا۔ اس وقت راج تلنے ان پہلی ہوئی حیران چلیوں کو مڑ کے دیکھا۔ جربنگلے کے باہر گاڑی کے قریب گل ہیر کے ایک پڑے نیچے سے اُسے دیکھ رہی تھیں۔

”غوب صورت ہے بے درغوب صورت ہے روضیہ نے روضت کے نیچے سے راج لتا کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے دل سے کہا۔ پھر یہ ایک وہ نذر ہے ایک سانس اندر کینچ کے رہ گئی۔ عشرت پورج سے گزرتا ہوا لیے لیے مردانہ ڈگ بھرتا ہوا بنگلے سے باہر آ رہا تھا۔ مگر وہ عشرت د تھا۔ ایک سبلی غیر سبلی شہ پٹلا اور ٹی شرٹ میں بلوس۔ اس وقت اس نے ڈریس سوٹ پہن رکھا تھا۔ اور اس کی سفید تھیں پر سیاہ جیب بہاروے رہی تھی۔ عشرت کی آنکھوں میں ایک مفرد چمک تھی۔ اور جب وہ راج کے سامنے لگے مٹھا تو اس کا مسکراتا ہوا اور کھلتا ہوا گور رنگ منگ کی بچی کی روشنی میں جبک جبک گنگنے لگے گا۔ بالکل بے اختیار ہو کر روضیہ نے نذر سے سانس اندر کینچ لیا۔ جیسے کہیں بہت دھاس کے دل کی گہری ہتھوں تک کوئی خنجر اُتر گیا ہو۔

راج نے مڑ کر دیکھا۔ لیکن گل ہیر کے درخت کے آس پاس اندر میرا تھا۔ اندر وہ کچھ نہ دیکھ سکی۔ شاید یہ بات کی سہ کی تھی۔ یہ رات بھی شاید عشرت کے حُسن سے مسحور ہو گئی تھی۔

”واؤ؟ راج تلنے ٹپے پیار سے عشرت کی طرف دیکھ کر کہا۔ اور پھر وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر گاڑی کا دروازہ کھولنے کے لئے مڑی۔ اور اس کی گھیرے دار گولڈرے ویکہ کی نراک نڈا دائروں کی شکل میں گھوم گئی۔ تاج حلقے موسیقی۔ بہاد۔ قزقم۔ راج کے جسم کا ہر روج اور ہر خم عشرت کے دل میں جا رہا تھا۔

مہاج میں چلیں گے ۛ راج بہت دیر سے آہستہ سے ہلے۔ جیسے وہ نہیں کوئی بوسہ ہل رہا ہو۔
رات اور رقص۔ سمندر اور ساحل۔

رضیہ اور گل ہیر۔

مگر گل ہیر کے پھول بہت دیر تھے۔ اوپر شاخوں میں تاروں کی طرح اپنی آنکھیں جھپک رہے تھے۔ اور اُن سے بہت دیر پہلے گل ہیر کے تنے سے لگی رضیہ سوسکیاں لے رہی تھی۔ مگر سخت کاہنہ سخت ہوتا ہے۔ اس کی چال بھی بڑی سخت اور کمرھنی ہوتی ہے۔ اس میں کہیں خفیہ اھلچ، اوروہ درد کو بھنے کی قوت نہیں ہوتی۔ جو رگوں میں لہو کے دوڑنے سے آتی ہے۔ تنے کی رگوں میں قہ پانی چلتا ہے۔ اور پانی لہو کا درد کیسے بھجھ سکتا ہے۔

کھولی میں بہت اندھیرا تھا۔ اماں جاگ رہی تھیں۔ بڑھی اماں ہوئے ہوئے کانپتے ہوئے
 ہاتھوں سے بستر ٹٹول رہی تھیں۔ مگر بستر خالی تھا۔ اماں کو معلوم تھا۔ صرت چند فٹ پرے۔ رضیہ
 سو رہی تھی۔ سو نہیں رہی تھی۔ جاگ رہی تھی۔ اماں کو معلوم تھا۔ اس کی بچی بچے میں سر دے رو رہی ہے
 مگر وہ کچھ نہیں کر سکتی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ رضیہ کے پاس چلی جائے۔ اس کے سر پر اپنا جھڑیوں والا
 ہاتھ پیرے۔ مگر وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ کتنے ہی سالوں سے اماں نے محسوس کر لیا تھا۔ کہ وہ کچھ نہیں کر سکتی
 اس کا خاوند مر گیا اور وہ کچھ نہیں کر سکی۔ اس کی بڑی بیٹی کا خاوند مر گیا۔ اور وہ کچھ نہ کر سکی۔ اس کی بیٹی گئی
 اور وہ کچھ نہ کر سکی۔ مجھ نے مجھ لے پانچ بچے رہ گئے اور وہ کچھ نہ کر سکی۔ کیوں کہ اسے کچھ کرنا سکھا یا ہی نہ
 گیا تھا۔ وہ صرف اتنا جانتی تھی کہ عورتیں یہاں بننے کے لئے بستر پر لیٹ جانے کے لئے اوب بچہ پیدا
 کر کے اُن کی پرورش کرنے کے لئے بنائی گئی ہیں۔ اُن کے خاندان میں ہمیشہ ایسا ہوتا آیا تھا اور ان
 کے اس پاس کے خاندانوں میں ہزاروں سالوں سے ایسا ہی ہوتا آیا تھا۔ اور ایسا ہی ہوتا رہے
 گا۔ اس نے سبب بھی کوئی مصیبت اتنی تو عورت دُعا کے لئے دونوں ہاتھ اُٹھا دینے کے سوا اور کیا کر سکتی
 ہے۔ اور اماں کی تو زندگی کا اب ہر ایک لمحہ محترم دُعا تھا۔ دونوں ہاتھ اُٹھا کر اُنھے ہرے جس باقا ملے سے

وہ نازاں کتنی نہیں کس مشغور و مشغور سے ہر روز دعا مانگتی تھیں: میری رخصتی کا نے سے لگ جائے۔
یہ چھڑا سا گنہ کس طرح سنو رہا۔ اے خدا! اے خدا! اے خدا...

لیکن آج اندھیرا بہت تھا۔ اور اس اندھیرے میں رخصت آہستہ آہستہ ہی آہستہ جیسے اپنے سینے کا سارا سوز اپنی مٹھی میں دبائے ہوئے ہوئے سسک رہی تھی۔ اور اناں کا دل اپنے لیستر پر لیٹے لیٹے حشرے ہو رہا تھا۔ مگر یہ دل حشرے کیوں نہیں ہو جاتا۔ یہ غم کا سوتا رگوں میں ٹنک کیوں نہیں ہو جاتا۔ یہ دھبے دھبے چلنے والا سانس ایک بارگی آنکھیں نہیں ہو جاتا۔ کب تک اپنی بچی کی برصیبت دیکھتی رہے گی۔ اے خدا... تم اس قدر دُور کیوں ہو۔ اتنے دُور ہے کیوں ہو، آسمانوں میں رہنے والے آؤ تا۔ اس کھوٹی میں اُتر آؤ۔ اس کا اندھیرا دیکھو۔ اس کی غریب دیکھو۔ اس کی آہوں میں سانس لو۔ میرے رب۔ میرے مولا۔ میری بچی اس طرح سسک رہی ہے۔ اور تم سے کچھ نہیں ہوتا۔ کچھ نہیں ہو سکتا اے خدا کیا؟

بھائی اناں نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ توبہ۔ توبہ۔ میں کس کی شان میں یہ گستاخی کر رہا ہوں۔ میرے مولا۔ بے معاف کر دے۔ میرے گناہ بخش دے۔ یہ میں کیا بک رہی ہوں۔ چچاچا ان مصیبتوں نے میری عقل مار دی ہے۔...

مگر رخصت کراں اس بحث سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ وہ خدا اور گناہ۔ دُعا اور جزا کے سہانوں کا الگ ایک کونے میں مٹھی سسکیوں اور جھپکیوں کے درمیان روتی جاتی تھی۔ آج چاروں طرف بختل اندھیرا تھا۔ اور کہیں روشنی نہ تھی۔ انسان کے دل میں ایک شہر ہوتا ہے۔ اس کی گلیاں اللہ بازار چلتی ہیں۔ جہاں یا دلوں اور دُروادوں کا ایک جہم رہتا ہے۔ اس کی دوکانوں میں ہزاروں طرح کی نشانیں بختی ہیں۔ خریدی اور بیچی جاتی ہیں۔ اس کے کارخانوں میں محنت سانس لیتی ہے۔ اور اس کے باغوں میں کبھی کسی چاند چمکتا ہے۔ اور یہاں پہلے ہیں اور آہستہ خرام جڑے ایک دوسرے کی کمرس ہاتھ ڈالے

خاعوش نکاحوں سے محبت کا پیام دیتے ہیں۔

دل کا شہر بھی انسان کے شہر کی طرح بستہ ہے۔ محنت کرتا ہے، کام کرتا ہے، ہنست ہے، افسوس لہے۔ کبھی کبھی ایسے دن آتے ہیں جب ہر لمحہ عید ہوتا ہے۔ ہر یاد اک نیا جڑ بھین کر نکلتی ہے۔ ہر قضا، ہر غمی سنوڑی پھیلیوں میں چٹاکی نقشِ تصویر میں بھلتے۔ ہر آنگ نئے نئے پتوں کی طرح خوشی سے ہنستی ہوئی، اکھڑاں مارتی ہوئی ہر آفسو جہان اور بلند مستقبل کی خوشبو سے مکتی ہوئی دل کی گھیسوں اور بازاروں میں بھل آتی ہے اور خوشیوں کے میلے میں اور سڑکوں کے آروام میں گھوم جاتی ہے۔

مگر آج اس شہر میں کیسا ساٹھ ہے؟ آج دل کی پڑتی گھیسوں اور بازاروں اور سڑکوں پر اندھیرا ہے۔ آج کہیں پردوشی نہیں ہے۔ آج کوئی عراو نہیں ملتی۔ کوئی آرزو نہیں بچی، کوئی آنگ نہیں ہنستی، آج سائے دیکھے بند ہیں، اور سائے دوانے مقل ہیں، اور سائے بازار غالی ہیں مرگ کہیں کہیں بھٹو پر چند روٹی یا دیں گھرے ہوئے آیام کا سیاہ لبادہ اوڑھے ہوئے ہوئے ایک دوسرے سے سرگوشی کر رہے ہیں۔

آج سارا شہر غالی ہے۔ آج سڑکوں پر پردوشی نہیں، باغوں میں چاند نہیں، پیڑوں میں پھول نہیں۔ آج وہ بچی بھی غالی ہے جہاں رخصت اور عسرت جٹا کرتے تھے۔ یکایک رخصت کو ایب محسوس ہوا جیسے آج کے بعد یہ بچی ہمیشہ غالی رہے گا۔

انسان کا دل بھی ایک عجیب شے ہے۔ وہ کسی یاد کو تو ایک خوشبو میں بدل دیتا ہے۔ جو زندگی بھر بھکتی رہتی ہے۔ کبھی ایک کھٹے میں جو زندگی بھر جیتا رہتا ہے۔ اور کبھی ایک تصویر میں جو زندگی بھر ایک ہی چوکھٹے میں جڑی، ایک ہی دیوار پر لگی ایک ہی زاویے سے دکھائی دیتی چلی جاتی ہے۔ یکایک رخصت کو محسوس ہوا جیسے آج کے بعد وہ اُس باغ میں کبھی نہیں جائے گی۔ جہاں وہ عسرت کے ساتھ گھومنے جا یا کرتی تھی اس بچی پر نہیں بیٹھ سکے گی۔ جہاں عسرت کے ہاتھ خود بخود اس کی کمر کے

گرد آجایا کرتے تھے۔

نہیں پہنچے آج کے بعد ہمیشہ خالی رہے گا۔

پتہ نہیں ایسے کیوں ہوا۔ لیکن جب اس نے اس تصویر کو جو کٹے میں جڑ کے وہاں سامنے کی دیوار میں گویا لگا دیا۔ تو اُسے اطمینان سامحوس ہوا۔ اس کی سب سکیاں اور پچھیاں بند ہو گئیں۔ اس کی پکلیں ہماری ہوتی گئیں۔ اور آخر وہ دم دم سامنوں کے درمیان خند کے ٹھوڑے میں بہتی ہوئی کھڑی۔ اور ہر کندہ رات بھر کی جاگ بونی تھی۔ اس نے مج بہت دیر تک سوتی رہی۔

مج ہو گئی۔ سورج نکل آیا۔ باناٹوں میں ٹرامیں اور بسیں اور راہ چلنے لوگوں کا شور مچا گیا مگر رفیعہ بڑے آرام سے سوتی رہی۔ اس کی آنکھوں نے ابھی اُسے نہیں جھگایا۔ اس نے اپنی ٹی کے خماروں پر رات کے آنسوؤں کے خشک نشان دیکھے۔ اور اُسے سوئے رہنے دیا۔ اور غریبی کا پتہ نہ ہونے ہوا۔ مگر کاسا کا کام کاج کتنی رہی۔ برتن صاف کر کے۔ گھرے میں پانی بھر کے ٹوں کو ہٹا کے کھانا پکا کے انہاں جب فارغ ہوئیں تو انہوں نے دیکھا رفیعہ ابھی تک بے سہ فز پر سو رہی تھی۔ کھڑکی سے عیب روشنی رفیعہ کے چہرے تک آنے لگی تو انہاں نے آہستہ سے کھڑکی کے قریب جا کے اس کے پٹ بند کر دیے۔ اور واپس آکر کپڑوں کے لئے کھانا نکالنے لگیں۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی، انہاں نے اٹھ کے دروازہ کھولا اور حیرت سے اُن کی نگاہیں سی بندھ گئی۔ اور وہ کھلی کھلی ہنسی لگا ہوں سے عشرت کی طرت دیکھتی رہ گئیں۔ یہ عشرت تھا۔ مگر شاید کوئی اور ہی عشرت تھا۔ اتنے چمے لباس پہنے ہوئے کسی طرح وہ صاف ستمرا خوشبوؤں میں پٹا ہوا نظر آتا تھا کہ انہاں تو دروازے میں کھڑکی کی کھڑکی رہ گئیں۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد عشرت نے مسکرا کے کہا "انہاں مجھے اندر نہیں آئے دو گی؟"

انہاں دروازہ چھوڑ کر ایک طرت کھڑکی ہو گئیں۔ لیکن اب بھی ایک لفظ اُن کے منہ سے نہیں نکل سکا۔ عشرت اندر آگیا۔ اس نے ایک بچنے کے سر پر ہاتھ پیرا پھر آگے بڑھ کر سوتی ہوئی رفیعہ

کی طرف دیر تک دیکھتا رہا۔ پھر ٹھیک کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ رضیہ کا سینہ ذرا سا کھلا تھا۔ ہرگز بھی
خدا سے بچے تھے۔ آنکھیں بھی۔ گردہ خند میں مستغرق تھی۔ عشرت کو نہیں دیکھ سکتی تھی۔

عشرت نے کہا "رضیہ۔"

رضیہ سوئی رہی۔

پھر عشرت نے رضیہ کو ایک ٹھوکا دیا۔ رضیہ ہڑبڑا کے جاگئی۔ اور اپنے سامنے عشرت کو اس قدر قریب
دیکھ کر حیران اور پریشان ہو گئی اور گھبراہٹ ہو گئی۔ اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ اس نے دو ایک بار اپنی
آنکھیں مل کر عشرت کی طرف دیکھا۔ اُسے چھو۔ جب جلے اُسے یقین آیا اور جب یقین آیا تو بے انتہاء
اس کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائیں۔

عشرت یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اس نے رضیہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا "بھئی۔ تو کیا
کچھ بتاتی تھی میں نہیں آؤں گا؟"

رضیہ نے اس کے نئے سوٹ کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہ اس کے چلتے ہوئے برقعوں پر پڑی خوبصورت
ٹائی پراسانی رنگ کی دھاری دار قمیص پر۔ اس کے سونے کے ٹینوں پر۔ وہ چُپ رہی۔ اس نے کوئی
جواب نہ دیا۔

عشرت نے رضیہ کی خاموشی کے کچھ اڑ کو محسوس کیا۔ بولا "تم نے نہیں پوچھا۔ تم رات کہاں ہے؟"
رضیہ بولی "پوچھنے کی ضرورت ہے کیا؟" یکایک اس کے لمبے میں آگئی۔

عشرت خاموش ہو گیا۔ وہ سمجھا کہ رضیہ کے دل بے کو اپنی آنکھوں پر لپٹنے اور کھولنے لگا۔
رضیہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔

عشرت آہستہ آہستہ بولا "بات یہ ہے رضیہ۔ یہ دنیا بڑی ظالم ہے۔"

میں جانتی ہوں۔ کوئی نئی بات بتاؤ۔

عشرت پھر خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک پھر اس کے دل بچے کے کنارے سے کیلتا رہا۔ پھر کہنے لگا
 ”میں بے وفا نہیں ہوں۔“

”میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔“ رضیہ بولی۔

عشرت نے کہا ”مان لو۔ رضیہ میں بے وفا نہیں ہوں۔ یہ جو کچھ میں کر رہا ہوں۔ اپنی اور تمہاری
 بہتری کے لئے کر رہا ہوں۔ یہ صرف ایک طریقہ ہے اپنے دونوں کو لانے کے لئے۔ تمہیں تو مسلم ہے یہ
 فلم انڈسٹری کیسی ہے۔ یہاں جب تک کوئی گس کی سفارش نہ کرے کام نہیں چلتا۔ تم خود ہی اپنے
 آپ کو دیکھ لو۔ راج کو دیکھو۔ شمشاد کو دیکھو۔ رجنیا کو دیکھو۔ اوشا کو دیکھو۔ کسی بھی میرو یا میروئن کو لے لو
 کسی کسی کے کندھے پر سوار ہو کے آگے بڑھے گی۔“

”تم کس کا کندھا چھو رہے ہو؟“ رضیہ نے پوچھا۔

عشرت نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بولا ”دنیا اسی طرح کی ہے۔ میرا مطلب ہے ایک نیسے
 کی طرح۔ جب آوی ایک نرینہ چڑھتا ہے تو کچھلا نرینہ چھوڑ دیتا ہے۔ میرے لئے راج ایک نیسے سے
 زیادہ نہیں ہے۔ اس نے مجھے ہیرو کا چانس دلوالے کا وعدہ کیا ہے۔ جوں ہی میں ہیرو بننا۔ اور تم
 جانتی ہو۔ راج اس انڈسٹری کی مشہور ترین ہیروئنوں میں سے ہے۔ وہ مجھے چانس دلا سکتی ہے
 جوں ہی میں ہیرو بننا میں اسے چھوڑ دوں گا۔“

”ایک نیسے کی طرح؟“ رضیہ نے پوچھا۔

عشرت نے رضیہ کا دوسرا ہاتھ بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔
 ”میں صرف تم سے پیار کرتا ہوں۔ صرف تمہیں چاہتا ہوں۔ کیا تم بھی جو مجھے تمہارے دھوکا دے رہی
 ہے۔ وہ دھوکا مجھے بھی ہے۔ تم سے جدا ہوں۔ یہ عارضی جدائی ہی ہوگی۔ تم سے جدا ہو کر مجھے بحیف نہ
 ہوگی! مگر ڈارنگ اپنے مستقبل کے لئے۔ اسی نکلنے کے مستقبل کے لئے مجھے ایسا کرنا ہوگا۔ میں جب ہیرو

بن جائیں گا تو ایک ساندرا بچہ خریدوں گا۔ دوسرے گاڑیاں ہوں گی۔ ایک میرے لئے۔ ایک تمہارے لئے۔ پھر میں اپنی اتی اور اپنے چھوٹے چھوٹے بھائی بہنوں کو بھی یہاں بلاؤں گا۔ پھر تمہارے لئے فلم میں کام کرنا ضروری نہ ہوگا۔ بلکہ میں تمہیں کام کرنے بھی نہ دوں گا۔ یہ ذلیل محنت !

”محنت کبھی ذلیل نہیں ہوتی۔ اگر عزت سے کی جائے“ رضیہ غصے میں اُکے بولی: ”تمہارا کیا خیال ہے۔ میں اگر چاہوں، تو یہ کھولی تبدیلی نہیں کر سکتی؟ ایک بچہ نہ سہی، ایک غلیظ تو لے سکتی ہوں۔ نئی گاڑی نہ سہی۔ سیکنڈ ہینڈ گاڑی تو خرید سکتی ہوں۔ کیا تم کہتے ہو۔ ہارنجی سوڈر ارام سلاچی کے کاغذ کے حیکوں میں سلور برڈ کیڈ کے فرک دیکر کریری ادھ بے قرار نہیں ہو جاتی؟ کیا تم کہتے ہو، میں صورت نہیں ہوں۔ میراچی خوب صورت ساڈیوں، خوش نما بلاؤنڈوں اور نئے نئے لڑاؤں کے پہننے کے 2 نہیں لپاؤں۔ کیا میں نہیں چاہتی کہ میرا بھی اچھا گھر ہو۔ خوب صورت پردے ہوں۔ رات کی دم دم روشنی میں ریڈیو گرام ایک کونے میں بچھا ہو۔ میری بہن کے بچے اچھے خوب صورت کپڑے پہنے اس کے گرد بٹا ہو کے تھون کا پردہ گرام سنتے ہوں۔ کیا تم کہتے ہو میرے دل میں یہ تصویریں نہیں۔ سب ٹھیکو میں یہ سب نہیں کر سکتی۔ اُن تصویروں کو خریدنے میں مجھے جو کچھ بچا پڑے گا۔ اس سے بھی بہتر ہے کہیں اُن تصویروں کو بھاڑ ڈالوں۔ میں خالی دیواروں میں رہوں گی۔ ایک ادھیڑی کھولی میں۔ فلم والے گھر مجھے کام نہیں دیں گے تو میں کسی گھر میں جمال دوں گی، برتن صاف کر دوں گی۔ کسی کے بچے کی کیا بن جائیں گی، ختم مرگ پر کوٹنے لگوں گی! کبھے؟ کل تک تمہارا بھی یہی خیال تھا۔ آج تم کیسے بدل گئے۔“

”غری رضیہ! عشرت نے کہا: غری بہت کچھ کر سکتی ہے۔“

”میں نہیں مانتی کہ غری میں آدمی اپنی عزت بھی کھو دیتا ہے۔ یہ ہمارے اس پڑوس کی سیکڑاں جوتیں کام کرتی ہیں، چاول کو گھتی ہیں، بازار میں سبزی بکتی ہیں، کارخانوں میں کام کرنے جاتی ہیں۔ غری بھی

پر ہر کاری کا لازم نہ لگاؤ اپنی کمزوری دوسروں سے منسوب نہ کرو۔ میں ہر روز ان غریب عورتوں کو دیکھتی ہوں۔ اسی میں سے کئی ایک بے مدد ہیں۔ تمہاری کئی بیویوں سے بھی زیادہ حسین ہیں۔ ان کے پاس نہ ریڈیو گرام ہے، نہ کار ہے، نہ فلیٹ ہے۔ نہ سونے کے زیورات ہیں۔ مگر ان کا دل تو فاش بننے کو نہیں چاہتا۔ میں کیوں انہیں بازار میں بیٹھے ہوئے نہیں دیکھتی کبھی کبھی ان کے ہاں غلطی بھی ہوتے ہیں۔ کبھی کسی کا بچہ دوا نہ ملنے سے مر گیا جاتا ہے۔ پھر وہ موتی ہیں۔ دودھ پائے دوائے کرتی ہیں۔ پھر جی مضبوط کر کے کارخانے میں کام کرنے پٹی جاتی ہیں کیوں انہوں نے اپنے آپ کو نہیں بچا۔ جیسے تم نے آج اپنے آپ کو بچ دیا ہے۔ تمہارا خیال ہے۔ اس گیسٹروین کے سوٹ میں ریشمی ٹائی اور چمکتے ہوئے بوتلوں میں تم بہت حسین معلوم ہو رہے ہو، میں تمہیں بتاؤں تم طوائف معلوم ہوتے ہو۔ ایک مرد طوائف !!!

عشرت ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ جیسے کسی نے اُسے گولی ماری ہو۔ پھر بحال ایک اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ اپنے ہونٹ کاٹتا ہوا وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے رضیہ سے منہ پھیر کے کہا "تم دیوانی ہو گئی ہو۔ تم دیوانی ہو گئی ہو۔"

پھر وہ آٹاں کی طرٹ مڑا۔ اور انہیں ایک سوکانوٹ دیتے ہوئے بولا "آٹاں یہ تو بھلی ہے۔ آپ تو بچے جانتی ہیں۔ میں — میں — یہ سوکانوٹ تو رکھئے۔ میں ہر ماہ کبھی نہ کبھی ادھر آیا کروں گا۔ پوچھ لیا کروں گا۔ اگر آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو آپ رضیہ سے نہیں مجھ سے کہہ دیا کیجئے۔ میں خود خیال رکھوں گا۔ میں ہر ماہ آپ کے لئے — میرا مطلب ہے — آپ کا خرچہ یہاں پہنچا دیا کروں گا۔"

رضیہ نے گج کر آٹاں کے ہاتھوں سے وہ سوکانوٹ چھین لیا۔ اور اس کے سامنے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہوئے بولی "یہ تم میری محبت کی قیمت چکانے آئے ہو۔"

رضیہ کی آنکھوں سے قطرے نکل رہے تھے۔

عشرت نے کھیانہ ہو کے کہا: ”تم ————— تم ————— کتنی نہیں ہو“

”جاؤ۔ چلے جاؤ۔ عشرت آج کے بعد کبھی اپنی صورت نہ دکھانا“

اور جب عشرت چلا گیا تو بچا ایک رضیہ کے دل کی ساری دیواریں ڈھے گئیں۔ اور وہ منہ پھر کے ایک کونے میں موڑ کے اپنے ہاتھوں میں اپنا منہ چھپا کے کہنے لگی ”نہ جاؤ عشرت، کہیں نہ جاؤ یہ کھوٹی تمہاری ہے، میں تمہاری ہوں۔ میری ساری زندگی تمہاری ہے۔ آ جاؤ عشرت۔ میری زندگی کے جوتے بنا کے اپنے پاؤں میں پہن لو۔ مگر یہاں سے نہ جاؤ۔ اُس گندی قلیظا بد بو دار دنیا میں —“ رضیہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

پہلے پندرہ روز راج لٹا باطل دیوانوں کی طرح رہی۔ یہ دن کچھ اس طرح کے تھے جیسے
 جذبات کی جڑھی ہوئی آندھی ہو، یا سون سون کی موسلا دھار بارش ہو، یا سمندر میں لہریں تھپڑے
 لیتی ہوں۔ اور اپنی اچھال میں کشش کو کبھی بہت اور کبھی بہت نیچے ڈولاتی ہوئی لے جائیں۔ اُن
 پہلے پندرہ دنوں میں راج لٹا۔ کیوں۔ کب۔ کہاں اور کیسے کے تمام سوالوں کو جو ہر فرد کی زندگی
 میں آتے ہیں۔ باطل بھول چکی تھی وہ ایک لمحے کے لئے بھی عشرت کو اپنی نظروں سے اوجھل نہیں
 ہونے دیتی تھی۔ ان پندرہ دنوں میں وہ اپنے بچھے سے باہر نہیں نکلی۔ اور اگر کہا جائے کہ اپنے کمرے
 سے باہر نہیں نکلی تو زیادہ صحیح ہوگا۔ کبھی کبھی قودہ کی چلنے ناشتہ، دوپہر کا کھانا شام کی چلنے اور
 رات کا کھانا بھی وہیں تنگ لیتی تھی۔ کبھی کبھی خود سٹوڈنٹوں کے عشرت کے لئے مرغ بھونتی تھی راج لٹا
 بہت اچھا کھانا بنا سکتی تھی۔ کیوں کہ جس گھر سے وہ آئی تھی۔ وہاں اُسے خود کھانا تیار کرنا پڑتا تھا۔ سرورین تو
 وہ جلد میں ہوئی۔ پہلے تو وہ مشنر کی بیوی تھی۔ مشنر جو اب اس کے گرج میں رہتا تھا۔ مگر اب راج
 کیسے کسی کی پرہیزگار تھی اس سے پہلے اس نے کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔ یہ نہیں کہ اس سے پہلے ساٹھے
 نہ ہوئے ہوں۔ راج کو تو اب اُن کی تعداد بھی یاد نہ تھی۔ مگر چیز الگ تھی۔ یہ جذبہ ہی کچھ اور تھا۔

ہیں۔ شے اہل ہے۔ راج نے سوچا۔ عشرت کے بغیر قزوہ زندہ کیسے رہ سکے گی۔ سٹوڈیو شوٹنگ کرنے کیسے ہلے گی۔ شروع کے پندرہ دنوں میں اس نے ایسا ہی کیا۔ نہ صوفیہ کہ وہ کب سے باہر نہیں نکلی بلکہ شوٹنگ پر بھی نہیں گئی۔ بہت سے پروڈیوسر آئے اور وہاں چلے گئے۔ کسی کی ملاقات نہ ہو سکی۔ ان دنوں میں وہ عشرت کے سوا کسی کی صورت بھی دیکھنا نہ چاہتی تھی۔ ایسی مرضی تھی اس پر۔

مگر میں سب لوگ پریشان تھے یوں تو راج کی بے راہ روی سے سب اکاؤتھے۔ بلکہ ایک طرح سے اس بے راہ روی کی ترضیب دینے والے بھی دی تھے۔ راج کے ماں باپ بہت غریب تھے، راج بہت حسین تھی۔ شکر اُن دنوں دولت مند تھا۔ کیا ہوا اگر وہ اور میٹر سے اہر کا تھا۔ انہوں نے پانچ ہزار روپے لے کر راج کو شکر سے بیاہ دیا۔ لیکن جب شکر غریب ہو گیا اور منافع والے سماج میں یہ کہنا بہت مشکل ہوتا ہے کہ کون امیر کب غریب ہو جائے گا اور کون غریب کب امیر ہو جائے گا۔ زندگی کی دوڑ ایک مسلسل غیر قطعی دوڑ ہوتی ہے۔ راج اپنے بڑے خاوند سے جھگڑ کے اپنے ماں باپ کے پاس چلی آئی۔ اس کے بھائی اجمین کو بچپن ہی سے بُری عادتیں پڑ چکی تھیں۔ وہ راج کو گھیر گھاس کے پھسل کے سبز باغ دکھانے لگے آیا۔ راج کی شوخیاں۔ اس کی شریر ادائیں۔ اس کا بے مثل عُن پروڈیوسروں کو بہت پسند آیا۔ تھوڑے ہی دنوں میں وہ قرقی کے منازل طے کرتی ہوئی۔ اہلی درجے کی بیوی بن گئی۔ اب کوئی دشواری نہ تھی۔ راج نے اپنے شوہر شکر کو اپنے پاس بلا دیا۔ خاوند چاہے بڑا ہی ہرودھو کے کی ایک عمدہ مٹی ہوتا ہے۔ اور بھڑکا ریشور تھے۔ ان کی بیوی گنیشی تھی۔ یہی ڈلاری تھیں۔ ان کی بیٹی رام پیاری تھی۔ رام پیاری کا شوہر ارجیت سکو تھا۔ یہ سب لوگ راج کے معزلوں پر پل رہے تھے۔ اور اس طرح پلنے کے سوا۔ اور کسی دوسرے طریقے سے پلنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ کام کرنا تو ایک غیر شریفانہ فعل ہے جسے آدمی اس سماج میں انتہائی بھوری کے تحت سرانجام دیتا ہے۔ اُن میں سے ہر شخص مگر میں ایک چھوٹا سا فرعون تھا۔ ہر شخص خودی کا ایک بوجھ

پشتہ راہ ہاندے اپنے محفوظ پنے کو چھپانے کی کوشش میں غلط تھا۔ بر شخص کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ کسی طرح سے راج کا منظور نظر بن جائے۔ اس چھوٹے سے نظام کشی کا مرکز راج تھی، اور یہ سب مینا سے اس کے گرد گھومنا کرتے تھے۔ اس لئے یہاں عزت نفس کا سوال نہ تھا۔ تو کبھی پیدا ہی نہ ہوا تھا۔ سوال تھا کہ کہیں اگر یہ معاملہ بڑھ گیا تو پھر کیا ہوگا۔ اگر کہیں عشرت اور راج نے شادی کر لی تو ہمارا کیا ہے مگر۔ گو سوال پاس طریقے سے کہی؟ نہ ہوئی تھی۔ یہ سوال تو دل میں اندر ہی اندر رہتا تھا مگر تھا بھی۔ بنیادی مرکزی سوال میرا طرہ و انداز کیسے سلامت رہے؟ اگر راج ان چندہ دنوں میں کسی طرح سے اُنہیں اس بات کا یقین دلا دیتی تو وہ کاہے کو اتنے پریشان ہوتے۔ مگر راج کو اتنا سوچنے کی فرصت کہاں تھی۔

ایک پرانی پورٹس کار پورچ میں آکے ٹکی۔ اور مرزا راحت حسین فلم "جوڑ توڑ" کھانا کھاتے اُس میں سے اُتر کے برآمدے کے جانب بڑھتے ہوئے دکان دئے۔ ابھینو نے بھاگ کے انہیں اسے ہی میں لینا چاہا۔ مگر جب تک وہ اندر ڈھانگ رام میں چلے آئے تھے۔ مرزا راحت حسین بڑے عجیبے اور خورج مزاج ڈائریکٹر تھے۔ منہ میں ہر وقت پلن رکھتے تھے اور پیک گھولتے رہتے تھے۔ اس لئے جب کبھی گفتگو کرتے تھے۔ تو دو زبان گفتگو میں ہمیشہ چلے چھوڑتے جاتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کدو کہیں پانی کی کسی چلی سٹل سے بول رہے ہیں۔

بورے؟ آج اُنہیں ہے؟" (راج کہاں ہے؟)

ابھینو نے۔ دست بستہ عرض کی؟ حضور کیا بتاؤں۔ بہن کو ایک سو جن بھار ہے؟

"میں اُنہیں کچھ شیتاؤں؟" (میں اسے دیکھ سکتا ہوں)

یہ کہہ کر مرزا آگے بڑھے۔ بیڑوم اُن کا۔ دیکھا بھالا ہوا تھا۔ ابھینو نے آگے بڑھ کے

دستہ تلک لیا۔ ڈری ساجت سے بولا کہ اس وقت سو رہی ہیں۔ ابھی ابھی آٹھ گئی ہے۔ ٹاکسٹ

حالات سے متنبہ بھی کیا ہے۔ مرزا بہت چکرائے۔ بولے: ”آج اُس کی شو شگ ہے۔ شٹ اُکا ہوا ہے۔“ (سیٹ لگا ہوا ہے)

ابھینو میرے پر اپنی مجبوری کا اظہار کرتے ہوئے بولا: ”کیا کیا جائے مرزا جی، کچ تو شو شگ کینسل کرنا پڑے گی۔“

مرزا جی نے گہرا کراہو اور دھڑکیا۔ کہیں اکال دان نظر نہ آیا اور پیک اب منٹ کے اندر بابا بھر چکی تھی جنفریب تھا کہ وہ پیک کو کہیں بھی پھینک دیتے۔ ابھینو نے آگال دان فوراً سامنے لاکے رکھ دیا۔ مرزا جی پیک تھوک کے دو مال سے منہ کو پیک سے اور ماتھے کو پیسنے سے صاف کرتے پھرتے ملے ایک ہزار کا نقصان ہو جائے گا۔ سٹر ابھینو تم تو جانتے ہو۔ احمد بھائی بوزیر ایم ڈیو سرکس تھو گز ہے۔ اس کا تو بارٹ فیل ہو جائے گا۔ بڑے جوڑ توڑ سے میں نے ظم جوڑ توڑ کی ہار ت کساری حاصل کی تھی۔ وہ سب چو پٹ ہو رہی ہے۔ ابھینو بھائی کسی طریقے سے راج کو سیٹ پر لے آؤ۔“

”یہ تو ناممکن ہے۔“

”دبیل کی ایک بوتل دوں گا۔“

”میں تو آدمی بوتل میں ہی راضی ہو جاتا۔“ ابھینو بولا۔ ”مگر وہ اس بیماری میں کیسے آسکتی ہے۔“

مرزا جی نے دوسرا پان کھنکھاکھا اور پٹنے کے لئے تار ہو گئے۔ ابھینو نے مسکرا کے کہا۔ ”مرزا جی، کئی ہزار نہیں سنا دیئے گا؟“

مرزا جی گندی اور عسراں فرمیں کہنے میں یہ طو نے رکھتے تھے۔ اس بات میں ان کا کوئی

شائبہ نہ تھا۔ کتنی ہی شکل سے مشکل زمین نکال کے لائے وہ اس میں حریاں غزل کہہ دین گے۔ کئی غلی پر انکوٹ پارٹی ان کی شمولیت کے بغیر ممکن نہ ہوتی تھی۔ شو قین مزاج لوگ جو جنسیات کے ماہر کہے جاتے تھے وہ اساک کی گولیاں، ملا، عریاں پوسٹ کارڈ اور کوک شاستر کے ملاوہ ایک دو

مرزا جی کے تبرکات بھی اُن کی بیاض سے نقل کر کے اپنے پاس رکھتے تھے۔

مرزا جی مسکراتے ہوئے بولے : ”بھرتوں کا۔ یہ سچ نہیں ہے۔ احمد بھائی، میرا استاد کر رہا تھا۔“
مرزا جی نے اپنی کُملی آستینوں پر آہستہ سے ہاتھ پیرا۔ اپنے شقائق پانچاے پر سے ایک خیالی کُمی اُڑائی
اور بڑی اداسے جھوٹے ہونے باہر نکل گئے۔ اُن کے جلنے کے بعد ابھینوں نے سائنس دیا۔ انھیں
ٹیلیفون کی گھنٹی زور سے بجی۔ ابھینوں نے بھاگ کے ٹیلیفون کا رسیور اُٹھایا۔

”راج لہ ہے ؟“

”آپ کوئی بول رہے ہیں ؟“

”میں سیٹھ بھیدی لال ہوں ۔“

”نئے سیٹھ جی۔ نئے۔ کہئے ۔“

”نستے تم رہنے دو۔ یہ بتاؤ اب علاج لہ کی طبیعت کیسی ہے ۔“

”بہستور بیمار ہیں ۔“

”تو ابھی کیوں نہیں ہوئیں۔ پانچ دن سے میرا سیٹ لگا ہڑا ہے۔ بھیدی جھگے کا کیا بات ہے۔“

”میں اپنا ڈاکٹر کیج دوں ۔“

”نہیں سیٹھ جی۔ آپ کیوں محکف کریں گے۔ ڈاکٹر تو یہاں موجود ہے۔ اس کا علاج بھی ہو رہا ہے ۔“

”محبوب مصیبت ہے۔ راج لہ کا اس سیٹ میں کام ہے۔ اور پانچ دن سے سیٹ لگا ہوا ہے۔ کل

تک انتظار کروں ۔“

”کیا بتاؤں سیٹھ جی۔ اچھا ہونے کو تو وہ کل بھی ابھی ہو گئی تھی۔ اور نہ ہوں تو ایک ماٹک ٹیک نہ ہوں ؟“

”ڈیم ! سیٹھ بھیدی لال نے ٹیلیفون بند کر دیا۔“

”ابھینوں نے اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا ”یہ آج میرا ٹیلیفون ہے چچا“ اور ان کی

ہوئی گشتی اس کے قریب کھڑے ہوئے خاموشی سے سنتے رہے۔ آخر مجاہد امور بدلے "اس طرح سے تو ہم بدنام ہو جائیں گے"

"اس میں کیا شک ہے؟" ابھینو اُن کی تائید کرتے ہوئے بولا۔

"سب پروڈیوسر ناراض ہو جائیں گے"

"بے شک آ"

"پھر کوئی راج کو کام نہیں دے گا"

"بہت ممکن ہے"

"ہم سب کو بھوکا مرنا پڑے گا"

"یہ بھی ہو سکتا ہے"

چچانے چلے کے کہا "تم دروازہ کیوں نہیں توڑ دیتے۔ سالی دن بھر اندر ٹھپی ہوئی کیا کرنی رہتی ہے؟"

ابھینو نے بڑے اطمینان سے کہا "دروازہ سامنے موجود ہے۔ توڑ دیجئے"

مجاہد امور غصے میں آگے بڑھے۔ ابھینو نے انہیں نہیں روکا۔ چچا کو بہت غصہ آیا۔ راج پر

نہیں۔ بلکہ ابھینو پر۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ وہ دروازہ نہیں توڑے گا، اور وہ جانتے تھے کہ

ابھینو بدانتہا ہے کہ مجاہد امور دروازہ توڑنے کی جرأت نہیں رکھتے۔ پھر بھی اس نے انہیں نہیں روکا۔

"کینہ؟" مجاہد اور اسے پرکھو دیر کھڑے سوچتے رہے۔ پھر ہلٹ گئے۔ اور چپکے سے ایک صوفی میں گھس

گئے۔ چچا گشتی اُن کے قریب گئیں اور بڑی محبت سے ان کے سر پر ہاتھ پیر کر لیں "اٹھو لایو پرنسٹن

نہو۔ تباہی ایفم کا وقت ہو رہا ہے۔ چلو۔ چل کے چکی گھارو"

چچا اپنی بیوی کے کہنے سننے پر ایفم گھولنے کے لئے چلے گئے اور ان کے جانے کا انداز بھی

تھا کہ اگر میری ایفم کا وقت نہ ہو گیا ہوتا تو میں یقیناً دروازہ توڑ دیتا۔

کئی کے جانے کے بعد ابھینو نے کمرے کے دروازے کی جانب ٹلا۔ وہاں باکر اس نے دوبارہنگی سی
 دستک دی۔ اندسے علاج ہوئی "کون ہے؟"
 ابھینو نے کہا: "میں ہوں۔ وہ مرزا جی آئے تھے۔"
 "آئے وہ؟"

"سیٹر جمیدی دل کا مکی ٹیلیفون آیا تھا۔"
 "سب کو دیکھ کر؟"

"نہر دیا: ابھینو خدا فرستے ہوا۔"

تھوڑی دیر غاموش رہی اور ابھینو نے کہا: "بہن ٹوٹ گئی ہے۔ میں نعلیہ درود۔"
 "بھواس مت کرو۔" علاج اندسے چلائی۔

ابھینو غاموشی سے ٹسکرا تا ہوا اندانے کے باہر نکل آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد کسی نے دروازے
 کے نیچے سے دس دس کے دروازے پر کدے ابھینو نے ٹوٹ اٹھائے۔ اور اپنے کمرے کی طرف جانے ہی
 والا تھا کہ پہلے میں ایک گاڑی کے ٹکرنے کی آواز آئی، اور میڈم تیزی سے اپنی اونچی میٹی کے جوتوں سے ٹپ ٹپ
 کرتی ہوئی اندر آگئیں۔ ابھینو نے لپک کے انہیں دیکھیں کہ میں جا لیا۔

ابھینو نے کہا: "اے آپ بھی خوب دقت پر آئیں۔ ایک نئی غزل لکھی ہے۔"
 "غزل سننے کا یہ دقت نہیں ہے۔" میڈم قرائش۔

"تو پٹنے ایک دو بازی تلاش کی ہو جائے۔"

"پتھر کی تو صورت بھی میں اس وقت دیکھنا نہیں چاہتی۔ مجھے تم کسی طرح سے راج کی صورت دکھا دو۔"
 "بس یہی نامکن ہے۔"

"اے یہ کیسے نامکن ہے۔ کل میرا سیٹھ ہے، اور وہ اس میں کام کر رہی ہے۔"

”کہ تو بیماری پیاری ہیں“

”کیا پیاری ہے اُسے!“ میڈم نے ڈپٹ کے پرچھا۔

”بھینو نے سکر کے اصرار اور دھچکا جیسے کوئی راز کی بات کہنے والا ہو۔ میڈم اس کے قریب آئی۔ ”بھینو خاموش کھڑا رہ گیا۔ اس کے چہرے سے سلوم ہوتا تھا۔ جیسے اس نے اپنا ارادہ بدل لیا ہے۔ میڈم نے اس کا ہاتھ پکڑ کے اُسے اپنے قریب کھینچ لیا۔ ”میں نے دس ایک نوٹ نکالا۔ ہن“ اب بتاؤ۔ راج کو کیا بیماری ہے“

”عشرت!“

”میڈم نے کہا: ”آہ! مجھے تشاوت بتایا تھا لیکن میں نے یقین نہیں کیا تھا۔ اسے اقل درجے کی ہیروئن اور ایک ایکسٹرا لائٹ ہے۔ کیا انڈسٹری کے سارے ہیرو مر گئے تھے۔ آؤ! تم کام کرے تو کم از کم کھلتے سے ٹوکرے“

”جی ہاں! بھینو نے سر ہل کے کہا“ ”یہی تو میں بھی کہتا ہوں۔ اعتراض بڑے کام پر نہیں ہے۔ پہلے ہو ہے۔ اور سیلف ڈری چیز ہے۔ میڈم ایک فلم میں نے لکھی ہے۔ سیلف!“

”ہاں بھائی۔ اس وقت فلم جو ہے نہیں شنی جاسکی۔ تم کسی طرح سے علاج لا کر کل میرے سیٹ پر لے آؤ“

”یہ ناممکن ہے“ بھینو نے آہ بھر کے کہا۔

”میڈم نے سوکا نوٹ جیب سے نکال کے اُسے دیا۔

”اب ممکن ہے“

”بھینو کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے سوکا نوٹ جلدی سے جیب میں رکھ کے کہا: ”دیکھئے کوشش کرتا ہوں۔“

”دیکھئے کوشش کرتا ہوں“

”مجھے معلوم ہے تم بہت کچھ کر سکتے ہو۔ میڈم نے اس کی بیٹی تھپتھپاتے ہوئے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے کہا۔ انداز میں اُس کی طرف دیکھا کہ بھینو اپنی ساری پالا کی کے باوجود ساری سٹی جی بھول گیا۔ میڈم جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اُسے معلوم تھا۔ اُس کی آنکھیں کس حد تک کس کی طرف بے خطر ہو کر کب تک دیکھ سکتی ہیں۔ اب وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں رات کو پھر نئی فن کروں گی۔“

میڈم کے چلے جانے کے بعد ابھینو پھر راج کے کمرے کے دروازے پر جا کے دستک دینے لگا۔ اندر سے رات پھر چلائی۔

”کون ہے؟“

”میڈم آئی تھیں۔“

”بھال دیا ہوتا؟“

”کمال دیا۔“

”کیا کہتی تھی؟“

”کل شوٹنگ ہے۔“

”منت بھو۔“

”مزد بھو۔“ ابھینو نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”مگر مجھے میں پہلے لے گئی تھی جو تم نے دئے تھے کھنڈا میں اتفاق سے ہرں بھول گئی گھڑی میں پڑول ڈولا ہے۔“

غور سے دیر کے بعد مدھانے کے نیچے سے کسی نے دس دس کے دو نوٹ بھر سکا دئے۔

ابھینو نے میں وہ پچھلے جیب میں دھک کر اپنی بھری ہوئی جیب کو اطمینان سے تھپتھپایا۔ پھر اُس نے ہچی گینٹی کے پاس جاکے اُسے میں کے نوٹ دئے اور بولا۔

”یہ راور گھر کا خرچ پلاؤ“

”اور میرے لئے“ چلنے بیٹاب ہو کے پوچھا۔ وہ دور روز سے اپنی رنڈی کے ہاں نہیں گیا تھا۔
”تصبر کرو۔ یہ نصیبت ٹل جانے دو“ ابھینو نے بڑی مردہری سے کہا۔

اور پھر وہاں سے اٹھ کر موسیٰ دھاری کی بیٹی رام پیدی کے شوہر اجیت سنگھ کے پاس گیا۔ اسکا
سے سرگوشی میں کہنے لگا: آج وہ کی کا بندوبست کرو دو لڑکیاں بھی بلاؤ۔ جو ہر مجلس کے
فرط است سے اجیت سنگھ نے اُسے گلے سے لگالیا۔

دن گزرتے چلے گئے۔ ایک ہفتہ گزر گیا۔ دوسرا ہفتہ گزر گیا۔ تیسرا ہفتہ گزر گیا۔ ایک مہینہ
گزر گیا۔

اندکے میں عشرت نے ایک جاہی بے کر کہا: ”ڈارنگ۔ اب تو اس کرے میں دم گھٹنے لگا“
”کھڑکی کھول دوں؟“ راق نے بڑے پیار سے اُس سے پوچھا۔

عشرت بولا: ”سر میں شدید درد ہے“

راق بولی: ”سر وہاںوں پاس ہے؟“

عشرت نے کہا: ”نہیں پاری۔ یہ بات ہے کہ اب باہر گھومنے کو کبھی پابند ہے“

”آگیا گئے؟“

عشرت نے کہا: ”تم تو میری جان میں مگر تازی ہوا، کھلا آسمان.... کیا خیال ہے۔ میں اس کرے میں

انے ہوئے کھتے دن ہوئے ہوں گے ۛ

س ایک لمحہ ۛ راج نے اس کے رخسار سے اپنے رخسار لگاتے ہوئے کہا۔

عشرت اٹھ کھڑا ہوا بولا ۛ باہر جائیں گے ۛ

راج اس کی طوط شکایت بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔

عشرت نے کہا ۛ آج میں بہت اُاس ہوں۔ اتنی یاد آ رہی ہیں اور میرے چھوٹے بھائی بہن ۛ

جتے رہ پے کہو انہیں بچے ہوں؟ ۛ

وہ تو میں جانتا ہوں۔ ڈارنگ۔ مگر یہ بھی تو سوچو۔ مجھے بھی تو کچھ کرنا چاہئے۔ میں خود کدے تھیں کہلاؤ۔

چاہتا ہوں۔ اپنی راج کو... ۛ

راج بولی ۛ میں تمہیں اک دم ہیرو کا پانس دلوادوں گی ۛ

ۛ یہ پانس جب تک ہم اس کمرے سے باہر نہیں نکلیں گے۔ کیسے ہاتھ آئے گا ۛ

راج اوجاب ہو گئی۔ کچھ سوچ کے بولی ۛ اچھا۔ میں کل ہی تمہارے لئے ایک شاندار پارٹی کا

بندوبست کرتی ہوں۔ انڈسٹری کے تمام بڑے بڑے ہدایت کاروں اور پروڈیوسروں اور دوسرے

لوگوں کو بلاتی ہوں۔ سب کا تم سے تعارف کراؤں گی۔ وہیں ہاتھوں ہی باتوں میں تم دیکھو یہاں تمہیں کسی نہ

کسی کچر کا پانس دلوادوں گی۔ یہ کیا خصل ہے ۛ

ۛ تو اٹھو دروازہ کھولو ۛ

ۛ دل ہوں۔ جی نہیں چاہتا ۛ راج اک مواسے ہوئی۔

ۛ تمہاریاں ۛ عشرت نے اس کی چٹیر چٹپٹاتے ہوئے کہا۔

ان نے اٹھ کے ٹہکی بہ ہل سے دروازہ کھولا۔ عشرت اٹھ کھڑا ہوا باہر نکلا۔ ایک ماہ کی تید باشتت سے

وہ آن باہر آیا تھا۔ دنیا اسے نئی ہی معلوم ہو رہی تھی۔

راج باہر آگئی : ” اکیس نوے سوڑے پچھے کہا۔

”راج باہر آگئی!“ پچھلے بجاک کے گنتی سے کہا۔

گنتی جھٹکی جھٹکی مری مری کے بل پکچھی ”راج باہر آگئی۔“

مری مری باہر آگئی جھٹکی جھٹکی کے کرتے پکچھی۔ وہاں س کاٹا دھواں کی گنتی کو پیش کیا

تھا۔ راج کے باہر آنے کی خبر سن کر اس نے لمبے خوشی کے اپنی پٹنی جھٹکی مری کر گئے سے گھایا صاحب

سب سوڑتے ہوئے ڈرائنگ روم کی طرف چلے۔

راج ٹیلیفون کر رہی تھی۔

تھوڑی دیر میں یہ خبر ٹیلیفون پر ٹھوڑے ٹھوڑے ایک فلم کے ذخیرے دھڑکے فلم کے ذخیرے پر

گھڑکی ”راج باہر آگئی“

”راج باہر آگئی“

”راج باہر آگئی“

”راج باہر آگئی“

فلم کے ذخیروں سے یہ خبر فلمی رسالوں اور پرنٹنگ پریس کے اخبارات کی تلاش والی کا پڑھنے خوشی سے

ہے اسٹنٹ، پیکر اور چرچی سے۔ ایک ہی شخص تھا۔ اور جو خود ہی تھا۔ چلو کے کہا۔

”راج باہر آگئی“

پروڈیوسر ہارم کرنے کی خبر اچھی سنائی خیر نہ تھی۔ یہی راج کے باہر آج کی خبر تھی۔ دھڑکے

فلم راج کی تصویر تمام فلمی پرنٹس اور رسالوں میں پہلے سے پہلے جی صاحب پر ڈھایا۔ سچ رہا تھا۔

”سلا، سلا سے پہلے پاس پر ڈھائی تھی۔ اب تو کسی صاحب میں شرف دار سے کم نہ ملے گی!“

یہ پارٹی ہلے نکلنے میں ہوتی، ہمارے بحال میں ہوتی، تم سمجھتی ہو۔۔۔“
 ”جی فرمائیے؟ ولایت عجم نے کہا۔

”نہیں۔ نہیں۔ مگر یہ سمجھنے کی بات ہے۔ چنے چم بھی ہیں۔ پتے یہ لوگ بھی ہیں۔ کمرانے پنے میں فرق ہے۔ ہمارے کلوس جوا ایک خاص طرح کی تہذیب۔ ایک خاص طرح کا رنگ رکھتاؤ۔ ایک خاص طرح کا گرز۔ ایک خاص طرح کی نفاست۔۔۔۔۔ ایس! ایس! کیا کہہ رہا تھا؟“ بجن دت نے ولایت عجم سے پوچھا۔
 ”نفاست! ولایت عجم نے جانتی لے کے ڈھرا دیا۔

بجن دت کی آنکھیں خواہدہ ہو گئیں۔ بولا: ”میں دنیا کا سب سے بڑا موسیقار ہو سکتا تھا۔ مرسیری محبت نے مجھے تباہ کر دیا!“

”آپ کو کسی سے محبت ہے؟ ولایت نے پوچھا۔

بجن دت نے ولایت کی کمر کو زور سے چڑا لیا غصے میں بولا ”محبت کے بغیر موسیقی ناممکن رہتی ہے جب زندگی کا فخر ہے، ہا کوری ٹیگور نے کہا ہے ولایت ہیں لڑکی سے میں محبت کرتا ہوں۔ اس کی آنکھیں اگر تم کو کھو۔ چھوڑ دو۔۔۔ کوئی اور بات کرو۔ بجن دت نے ایسی سے سر ہٹ کے کہا۔
 ”کوہ کی دو؟ ولایت نے کہا۔

”یس! یس! اس کی۔ میرے ہاتھ سے پیر! بجن دت ولایت کو دھکی پلانے لگا۔

ایک گھونٹ پی کر بجن دت نے کہا ”میں بے مد تاوش ہوں، دنگی ہوں، مصیبت میں ہوں۔ ولایت تم کسی طرح سے میری مدد کرو، میں اس لڑکی کو بھولنا چاہتا ہوں!“

ولایت مشکو کے ہلے ”میں بھی کسی کو بھولنا چاہتی ہوں!“

”آہ! بجن دت نے ولایت کی کمر کو زور سے کس کر کہا ”میں بھی تاوش، تم بھی تاوش تو چلو ہم دونوں جو ہو طیس۔ میں تم سے کندنے پر سر رکھ کر بدلیں گا۔ تم سیرے کندنے پر سر رکھ کر

رونا۔ فائن :-

بجین دت دسکی پینے لگا۔ اتنے میں ایک عظیم فن کار قسم کا پیر جس کا نام بھندہ کار دت۔ منہ بسورے رکھتا تھا۔ بجین دت سے آگے پوچھنے لگا :- ”بجین دت آرٹ کسے کہتے ہیں؟“ بھندہ کار نے شرط لگ چکی ہے :- ”بجین دت نے بھندہ کار کے ساتھ کھڑی ہوئی۔ مشہور ہندی ریڈیو کو دیکھ کے کہا ”آرٹ آرٹ ایک سانپ ہے :-“
”سانپ!“ ریڈیو زور سے چلی۔

برآمدے میں بہت سی کھڑی ہوئی لوکیاں چلائیں ”سانپ! سانپ! سانپ! بہت سے لوگ ادھر ادھر بھاگے۔ اک بھگدڑ سی مچ گئی۔ شراب کے بہت سے جام ٹوٹ گئے۔ بہت سی لوکیاں ڈر کے مارے مردوں کے سینے سے لگ گئیں۔ سانپ نے واقعی پدائی میں جان ڈال دی تھی۔ بڑی مشکل سے بھندہ کار نے سلاٹ کو بند کیا۔ اس نے کہا ”ابھی یہاں تو آرٹ کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی :-“

”آرٹ؟“ ششاد چمک کے بولی :- ”سب سے اچھا آرٹ سلک جیناں سنگھی کی دکان میں ملتا ہے، جواب نہیں ہے وہاں کے آرٹ کا :-“

بھندہ کار نے موڑ کر اکرم سے باتیں کرنے لگا :- ”آپ آج کل کون سی تصویر پرکھایت کاری میں مصروف ہیں :-“

”نی امال تو کوئی نہیں :-“

”تو پھر کسی تصویر کی کہانی گیت مکالمے :-“

”ابھی تک تو خالی ہوں :-“

”اوہ :-“ بھندہ کار نے چونک کر کہا۔ پھر کسی گہری سوچ میں لکھو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہوش میں

بھندکار اکرم کو جھوٹا کریمنا کی طوت چلا گیا۔ جس سے بے کار میں پٹنے کی کوشش ایک عرصے سے جوشی جی کر رہے تھے۔ بھندکار کے سامنے کس ڈائریکٹر کی پہل تھی۔ بھندکار کھلتے دیکھ کر جوشی جگ ہو گیا۔ بھندکار نے اُسی طوت شکر کے کہا: ”سودا“

”جی سرکار“ جوشی مسرت سے چلایا۔ اور طوت لاکر ڈھونڈنے لگا۔

راج تاعشرت کا تعارف بیٹھ باہو لائے کر رہی تھی۔ شروع شروع میں سلامان نہ تھا۔ لوگوں کو معلوم نہ تھا کہ یہ پارٹی کس تقریب میں دی جا رہی ہے۔ لیکن جب راج نے مختلف پروڈر سوں کی ٹولہوں میں جا جا کے اپنے محبوب کا تعارف کرانا اور ان سے رول اٹھانا شروع کیا۔ باتوں کی باتوں میں شہس کر گئی اور اسے کبھی شوخ آراء شہسے۔ کبھی اک عجیب پائیت سے جھاپا جیت کے باوجود نہایت غلیظ معلوم ہوتی تھی۔ تو سب سے راز ٹھل گیا کہ یہ وہی کے جام کیوں مٹا دے جا رہے ہیں۔

”جی ہاں۔ مزے کوئی کرے۔ رول ہم دیں۔“ بیٹھ چھیدی لال بولے۔ ”ایسے اونچے ہم نہیں ہیں؟“

مرزا جی کا ہاتھ ان کے منہ میں پیک گھول رہا تھا۔

”مگر اس لڑکے میں ہے کیا؟“ رجنال نے ڈی غرت سے بھندکار سے پوچھا۔ بالکل رنجا معلوم ہوتا ہے

پعشرت؟“

بھندکار نے کہا: ”نہتے ہیں، امین لائے اس کی صورت ملتی ہے“

”جی؟“ رجنال بولی۔ ”تھے میں اُسے راج لٹا آئے ہوئے دکھائی دی۔ فوراً پٹ کے اس سے پٹ گئی۔ بولی۔“ ہائے دی کتنی خوش قسمت ہے تو۔ میری تو حضرت کو دیکھتے ہی جان میں گئی، ہوشیار ہونا کسی دی جیت کے لئے جانتی گی۔“

راج تالے حد خوش ہوئی اس نے رجنال کو جوم لیا۔ دونوں سبلیاں ایک دوسرے سے پٹ گئیں۔

پھر راج نے بہت کم مارے پرچھا۔

”پارٹی پسند آئی؟“

”سیڈم؟“ بہت کم مار اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کے مغربی انداز میں ٹھکاتا یہ مگر ٹیسٹ شاندار سٹ
عظیم شانست پارٹی ہے جو میں نے اپنی زندگی میں دیکھی ہے۔“

جوشی جی ابھینو کر لے ایک کمرے میں بیٹھے بی رہے تھے۔ رشتے داروں میں مومن بھینوی،
پارٹوں میں شریک ہو سکتا تھا۔

جوشی جی کہہ رہے تھے ”گنگا جلی کی نسیم کھانے کے کہتا ہوں۔ مریاؤں کا۔ مگر اس عشرت کو کبھی پارٹ
نہیں دوں گا۔“

ابھینو نے کہا ”جی ہاں۔ کبھی مت دیکھے گا۔ مگر بچے دیکھے۔“ ابھینو نے بام خالی کر دیا
جوشی جی کہہ رہے تھے ”اور وہ بھی پھر ایک مسلمان لڑکے سے! اری تنہا ہی غیبت کو کیا ہو
ہے ابھینو۔“

”ایک شریف ہندو مگر ان کی لڑکی۔۔۔۔۔ اور وہ ایک مسلمان سے عشق کرے۔ میں پوچھا ہوں
کوئی ہندو نہیں ملا تھا۔ کیا انڈیٹری کے سب ہندو بیروں گئے تھے؟“

”بڑا بڑا“ ابھینو نے سے تالی بھانکے چونکا۔ جوشی جی نے کہا ”کیا بات ہوئی؟“

ابھینو بولا ”جلدی سے دیکھی ہو۔ یہ میری ہندو شرافت کا تقاضا ہے۔“

”تنہا ہی شرافت کہاں ہے؟ جوشی جی نے فستے سے پوچھا۔

”میری جیب میں“ ابھینو نے جیب سے چھ سات دس دس کے نوٹ نکالے۔ اور انہیں پھر پڑے پدار

سے چوم کر جیب میں واپس ڈال دیا۔ بولا ”آج میں بہت شریف ہوں۔ میری۔۔۔۔۔“

اکرم اصرے گند رہا تھا۔ ابھینو کی نظر اس پر پڑ گئی۔ اس نے جلدی سے اکرم کو کمرے میں بلا لیا۔

جوشی بھی کرتا رہا۔

ابھینو نے کہا : ”اکرم بتایا ایک شعل آن پڑی ہے۔ مل کر دیکھئے :“
”فرمائیے !“

جوشی نے اکرم کے آنکھ مار کے کہا : ”یہ پئے ہوئے ہے :“

ابھینو نے شعلہ بارھکا ہوں سے جوشی کی طرف دیکھا اور کہا : ”جی ہاں۔ میں ہر روز جنگ پتا ہوں۔ آج
دسکی پی رہا ہوں :“ ”فرمائیے بات کیا ہے مجھے جلدی مکر رہا ہے :“ اکرم نے کہا

”اتنی جلدی ؟“ ابھینو نے پوچھا : ”ابھی تو پارٹی شروع ہوئی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں یہاں پولیس
آئے گی۔ پھر تھوڑا سا ہنگامہ ہوگا۔ اس کے بعد ہم سب لوگ یہاں سے نکالے جانے کے بعد چور ہو
پرطیں گے۔ راج نے جو ہوکا ایک ہورا ہوٹل آج کی رات کے لئے مجھ کو لیا ہے۔ آپ نہیں جائیں گے۔“
”نہیں :“

”کم از کم پولیس کو تو آنے دیجئے۔ ہم میں سے ایک تو ایسا ہونا چاہئے جو پولیس سے لگنت کے بغیر
بات کر سکے :“

اکرم نے پریشان ہو کر کہا : ”آپ بات بتائیے۔ نہیں تو میں ...“ ابھینو نے اُسے آستیں سے
بچھڑ کر اپنے پاس بٹھایا۔

”بڑا سادہ سوال ہے۔ یہ جوشی جی کہتے ہیں کہ راج ایک ہندو لڑکی ہے۔ اُسے مشرت سے محبت
نہیں کرنا چاہئے۔ اگر مشرت ایک ہندو لڑکا ہوتا۔ تو انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ یہاں تک نہیں ہے
کہ جوشی جی ہندو مسلمانوں کی آپس کی شادیوں کے خلاف ہیں۔ مثال کے طور پر اگر بھی مشرت ہندو
ہوتا اور راج مسلمان ہوتی تو انہیں اس شادی پر بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔ انہیں نہ محبت پر اعتراض
ہے۔ نہ مذہب پر۔ بھر کس بات پر اعتراض ہے۔ یہ میری جگہ میں نہیں آتا۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں ؟“

کری جوشی جی کا سنہ دیکھنے لگا۔

جوشی جی کھیانی جیسی نہیں کر رہے ” میں تو اکرم تم جانتے ہو، اس قسم کی فرقہ واریت سے کتنا درد
ہوتا ہے۔ یہ کج بخت ابھینو اس وقت پی کر بیگ گیلے ہے ؟

اکرم نے ابھینو سے پوچھا : ” کیا تمہیں نہیں ہے کہ بخت ہے ؟ حضرت ادراد کے درمیان محبت
ہے ؟ “

ابھینو نے کہا : ” کیا تمہیں نہیں ہے کہ اگر حضرت نہ ہوتا تو یہ محبت ہوتی۔ حضرت نہ ہوتا جوشی جی چوتے
تو یہ محبت ہوتی، راج نہ ہوتی، ششاد ہوتی تو یہ محبت ہوتی ؟ “

ابھینو نے کہا : ” مگر اکرم بھیا، میں اس سوال کو حل کر کے چھوڑوں گا تا ابھینو کی بہنوں کی شکایتیں
اس نے بڑی سنجیدگی سے ایک مجلس دہکی کا اپنے سامنے رکھ کے کہا ” یہ ایک ہندو لڑکا ہے ؟
پھر اس نے ایک دوسرا مجلس اُٹھایا۔ اور کہا ” یہ ایک ہندو لڑکی ہے۔ کیا یہ دونوں مل سکتے
ہیں ؟ “ دیکھیں ؟ ابھینو نے ایک مجلس کی دہکی دوسرے میں ڈال دی۔ مل گئی۔ ” ابھینو تو بالی
بھالکے بولا ” اچھا اب یہ مجلس اُٹھاؤ یہ مسلمان لڑکا ہے۔ یہ اُٹھاؤ۔ یہ مسلمان لڑکی ہے۔ وہ لڑکا
کر لڑاؤ۔ آبا۔ پھر مل گئے “

ابھینو نے پھر دو مجلسوں کی دہکی اپنے مجلس میں اڑیل لی۔ چار چھوٹے لڑکے ایک بڑا
پگہل کے سامنے تھا۔ ایک پگ۔ پھر اس نے ایک مجلس میں دہکی ڈالی۔ یہ ہندو لڑکا
ہے۔ یہ مسلمان لڑکی ہے۔ آبا۔ دونوں مل گئے۔ وہ دونوں چھوٹے بھی اس نے اپنے پگہل پر
ڈال دیے۔ اب اس نے ایک اور مجلس اُٹھایا : ” یہ مسلمان لڑکا ہے۔ یہ ہندو لڑکی ہے جوشی جی
کہتے ہیں۔ یہ نہیں ملیں گے۔ آئیے دیکھیں، ایں۔ یہ تو مل گئے۔ ایک ہی رنگ، ایک ہی خالہ دی
ہو اس دہکی مذہب کی گئی، وہی اس کا خالہ “

جوشی جی نے کہیلے ہر کے کہا۔ ارے بُدھو۔ اب سب گلاسوں میں توڑ دی ہے۔
 اہمینو بولا۔ یہی تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ ہم سب میں دسکی ہے۔ ہم سب اسی آگ اور پانی سے
 بنے ہیں۔ نام عشرت ہوا لڑکیا، اور جوشی ہوا لڑکیا۔
 اس کے بعد اہمینو بہت بڑا پگ ٹکناٹ پہنے لگا۔
 جوشی جی نے کرم سے کہا۔ "آج مرے گا۔"
 کرم کوئی جواب دے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا۔

بڑے ہل میں سے تالیوں کی گونج سنائی دے رہی تھی۔ غلی ریکھا ڈن کی دھن پر
 رقص، رقص اور ولایت گم تاج رہی تھیں۔ راج تلے خاص طور پر ان لوگوں کو پیسے دے کر کچے
 کئے ہوئے اجاڑا۔ رقص نہ آتی مگر آٹاں سخت پڑ تھیں اور اُسے روپوں کی سخت ضرورت تھی۔
 اُسے ملو تھا۔ وہاں پر عشرت ہو گا۔ مگر آٹاں کی جان کے لئے پڑے ہوئے تھے۔ دھڑکے قلعے
 تھے بہن کے چھوٹے چھوٹے بچوں کی خوب مصوت بھاہوں کی اداسی رقص سے دیکھی نہ جاتی تھی۔
 چندہ دی سے کہیں کام نہ ملا تھا جب راج تلے تیس روپے ایڈوانس کے پیچھے لئے تو رقص سے
 انکار نہ ہو سکا۔

تاج سے پہلے رقص پائٹی میں باطل شریک نہیں ہوئی۔ رقص اور ولایت گم دونوں
 شریک تھیں۔ مگر رقص فاسوشی سے میک اپ کے کمرے میں بھی رہی۔ کسی کو اس کی آنکھ پڑ نہ تھا۔
 کسی کو پردا بھی نہ تھی۔ عشرت کو بھی ملو نہ تھا۔ راج نے بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ایک
 ایکسٹرا لڑکی!

رقص نے سوچ لیا تھا کہ وہ بھاہیں اٹھا کے کسی طرف نہیں دیکھے گی۔ وہ دو اور لوگوں کو
 دیکھے گی۔ چہت کو دیکھے گی۔ اور فرس کو دیکھے گی۔ اور ہوا کو دیکھے گی، مگر کسی کے چہرے کو

اور کسی کی آنکھوں کو اور کسی کے ہونٹوں کو اور کسی کے بالوں کو اور کسی کی مسکراہٹ کو کبھی نہیں دیکھے گی اگر کسی طرح سے وہ نہ دیکھ سکے۔ اس نے اپنی آنکھوں سے کہا تم صرف اس جگہ انگلی ہوجانا جہاں وہ تمہا پر مجھے روپوں کی شدید ضرورت ہے۔ میں اپنے پاؤں سے ناچوں گی اور اپنی کمر سے۔ کڑے سے۔ بازوؤں۔ گردن اور شانے سے اور ہونٹوں کی چمبش سے ناچوں گی، مگر آنکھوں سے آج نہیں ناچ سکوں گی۔ کیوں کہ آنکھیں روح میں جھانک کر دیکھ سکتی ہیں۔ اور اگر اس نے کہیں دیکھ لیا تو یہاں ہی اسے میری شکل دیکھ لی۔ تو وہ کہہ مسکرائے گا۔ آنکھوں! کیا تم اندھی نہیں ہو سکتیں چند لمحوں کے لئے، لوگ کہتے ہیں۔ محبت اندھی ہوتی ہے۔ وہ اپنے محبوب کے سوا اور سب کچھ نہیں دیکھ سکتی۔ یہاں تک محبت ایسی بھی تر ہوتی ہے جس میں انسان اپنے محبوب کے سوا اور سب کچھ دیکھتا ہے۔ یہاں تک کہ یہی ہی آنکھیں چاہتی ہوں۔ رضیہ نے اُسے ٹھوکار دیا۔ "پل کم محبت۔ کیا سوچ رہی ہے وہ لوگ! میں روشنی گل کئے ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ ناچ شروع ہونے والا ہے۔"

ہال میں اندھیرا تھا جب رضیہ، رضیہ اور ولایت جیم اندرائیں روٹنی ہوئے ہوئے۔ جیسے جیسے صحت کی سائنس کسی کو دیکھ کر تیز ہو جائے۔ پھر کہیں سے پائل کی جھلک سنائی دی۔ جیسے کوئی تار توڑ کر رہ گیا۔ پھر روشنی کا ایک چھوٹا سا دائرہ گھومتا ہوا ولایت جیم سے رضیہ، رضیہ، رضیہ پر رکا۔ ایک لمحے کے لئے۔ ایک لمحے کے لئے رضیہ کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ ایک لمحے کے لئے کسی نے زور سے سانس اندھ کینی۔ پتھر اس کے کر رضیہ کچھ سکتی کہ کون ہے۔ ہال میں لاٹ ہو گئی اور تپانہ زور سے شروع ہو گیا۔ رضیہ کی نگاہ سب سے پہلے میں پر پڑی وہ عشرت نما مسکراہٹ جیل کی طرح اس کے ہونٹوں پر چمکی ہوئی تھی۔ رات نے اپنا سر اس کی گود میں رکھ دیا تھا: جب رضیہ ناچتی رہی عشرت چمکی طرح بک بنا ہوا میٹھا سا۔ وہ بل نہیں سکتا تھا۔ رضیہ ۲ کے قریب سے ناچتی ہوئی گزری اور قریب سے گزری اور قریب سے گزری۔

یہ ایک عشرت بڑے نور سے چلوا :۔ روشنی مل کر دو :
یہ ایک ہال کی روشنیاں مل ہو گئیں ۔

لاٹ ہیں نے جس کے ہاتھ میں روشنی کا انتظام تھا ۔ عشرت کی جھلکا :۔ آواز سے گھبرا کر ہال کی روشنی مل گئی
تھی ۔ چند لمحوں کے لئے ہال میں ہنگامہ سا ہو گیا ۔
” روشنی کھول دو ۔ کیا ہوا ۔ روشنی :۔ روشنی :۔
راج تا چلائی :۔ روشنی کر دو :۔

ہال کی روشنیاں پھر بجنے لگیں ۔ راج نے پوچھا :۔ کیا ہوا تھا ڈارنگ ؟
عشرت نے اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھ کر کہا :۔ ” کون نہیں ۔ پکڑا گیا تھا ۔ روشنی چھینے لگی تھی :۔
” اب ؟“

” اب ٹھیک ہوں :۔ عشرت نے مسکولے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ۔
میک اپ کے کمرے میں اندھیرا تھا ۔ رضیہ دھیرے دھیرے رو رہی تھی ۔ ولایت بیگم اس کے پاس
بٹھی تھی ۔ خاموش ۔

رضیہ روتے روتے بولی :۔ ” عجیب اندھیرا سا ہے مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے ۔ جیسے میں اس کے
گہرے ہوئے خوب صورت بالوں میں اپنی انگلیاں پھیر رہی ہوں :۔
ولایت بیگم نے کہا :۔ ” اس خاموشی میں کبھی کبھی اُس بچے کی چیخ سنتی ہوں :۔
” کس بچے کی ؟“ رضیہ نے سکتے ہوئے پوچھا ۔

ولایت بیگم رضیہ کے باطل قریب آگئی ۔ اس کے گلے سے لگ کر بولی :۔ ” جانتی ہو رضیہ میں کیا ارسال
کی تھی جب انہوں نے مجھ پر یہ ظلم توڑا ۔ ڈاکٹر کہتے ہیں ۔ میرے رحم میں کوئی نقص پیدا ہو گیا ہے میرے
اب کبھی کوئی بچہ نہ ہوگا ۔ پھر بھی ۔۔۔۔۔۔“

دلایت ہی تختی سے دھبے پٹ گئی۔ بولی: پھر کبھی — کبھی کبھی مجھے اس بچے کی سچ سنائی دیتی ہے۔ کبھی کبھی وہ میری کوکھ میں کسانے لگتا ہے۔ کبھی کبھی میرے بازوؤں میں بچنے لگتا ہے۔ کبھی کبھی اس کے ننھے ننھے ہاتھ میری چھاتیوں پر بیٹھتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ میرے خدا! یہ ایسا کیوں ہوتا ہے ایسا کیوں ہوتا ہے؟

دھبے نے دلایت کو چوم کے کہا: "تو بڑی اچھی لڑکی ہے۔ تو نہ جایا کر۔ ان مردوں کے ساتھ کبھی نہ جایا کر۔ تو کیوں جاتی ہے۔ آج اس کے ساتھ، کل اس کے ساتھ۔ عورت کو یہاں نہیں لگنا چاہئے۔" دلایت خدا کی ہنسی۔ بولی: بھلی۔ میں کوئی عورت تھوڑی ہوں۔ میں قراب طوائف ہوں!

کوئی ہانچے کے قریب سج کر پادشاہ پر ختم ہوئی۔ وہ اہمیت کا کہنا ٹھیک تھا۔ کوئی دھبے کے قریب جہازوں کی شکایت پر پولیس آئی۔ تو سب کا غل غپاٹہ بند ہوا۔ اور سب لوگ گاڑیوں میں بیٹھ کر جھوپٹے گئے۔ اور وہاں سے کوئی ہانچے بچے کے قریب بھٹل برخواست ہوئی۔ بہت سے لوگ جن کی اس دوز شوٹنگ نہیں تھی۔ وہاں کرہاں میں پڑ کے سو گئے۔ دوسرے لوگ جنہیں ہم تھانہ والوں میں بھیج کر گھر لو کو بھاگے۔ راج لاکا شوٹنگ تھی۔ لیکن شوٹنگ سے پہلے اُسے صبح سنا کالج میں ہارن بنی سڈ پرایک ادبی سوسائٹی کا افتتاح کرنے کے لئے جانا تھا۔ اس نے وہ عشرت کو در کر گمراہی ٹھیل کرنے کے لئے۔ کپڑے تبدیل کرنے کے لئے۔ میک آپ کرنے کے لئے تین گھنٹے تو چاہئیں۔

ڈریسنگ ٹیبل پر اس کی اور عشرت کی باتیں ہوئیں۔ راج لاکا کوئی گھٹی ہوئی لڑکی نہ تھی۔ وہ اکثر ایک انڈیا ر اور باڈی پہنے ہوئے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر میک آپ کرنے لگتی۔ یہ اس کی زندگی کے سنجیدہ ترین لمحے ہوتے۔ جب وہ خود سے اپنے حسن و جمال کا جائزہ لیتی۔ اور اپنی زندگی کے حریف پہلوؤں پر غور کرتی۔

”واہ نگ دو برس دینا راج نے عشرت سے کہا
عشرت نے برس اٹھا کے دیا۔

راج بولی : جو شی جی نے وعدہ کر لیا ہے۔ سیٹر باجڑا نے بھی وعدہ کر لیا ہے۔ میڈم سے بھی کہہ چکی ہوں۔ بلکہ کل تو دو سو روپے زمی میں جان بوجھ کے میں بارگئی، کہ کسی طرح میڈم خوش ہو جائیں تم جو شی جی کی اگلی بچہ میں بیڑ کا کام کر رہے ہو۔ مزاجی نے بھی ہاں کر دی ہے۔ چھیدی لال نے بھی منظور کر لیا ہے۔ میں نے اس سے کہا۔ اگر وہ تجھے بیڑ کا چانس دے تو میں اس سے دس ہزار روپے کم لوں گی۔ وہ بہت خوش ہوا۔ اگلے ہفتے اپنی نئی تصویر کا اعلان کر رہا ہے۔ جس میں تم بیڑ میں تباہی بیڑوں۔ ڈار فلک دو بچی کوٹ دیتا۔ یوں دھبے تو رات کو دس ہیں پروڈیوسروں نے کئے ہیں۔ مگر ان میں دو چار بھی نہیں چانس دے دیں۔ تو دو سالوں ہی میں تم وہاں اوپر نظر آؤ گے۔ راج نے زحمت کی طرف دیکھی، عشرت نے اسے گلے سے لگایا۔

”اے سے۔ میرا میک اپ مت خراب کر۔ جان!“

راج ذرا تنک کر بولی : کالی پہننا ہے۔ اتحاد دیکھو۔ ابھینو نے میرے لئے ایک تقریر تیار کر دی ہے
نور اتم دیکھو اسے۔ تم ذکر بحیث ہو۔ آئینہ میری تقریر بھی تم ہی لکھا کرتا۔ ٹھیک ہے نا پارے؟“
”ہاں ہاری؟“

عشرت قہر سے دیکھنے لگا۔ اسنے میں راج نے اس سے بڑے پیار سے کہا : جانی
رجنل کے ہاں تھے پیرس کا ڈاکے میں اور ایک بہت عمدہ بلو ظم بھی آئی ہے۔ کہہ رہی تھی بہت عمو
بلو ظم ہے۔

”بلو ظم کیا ہوتی ہے؟“

”تم پہو کے تو تمہیں بتائیں گے۔“

”اور کون کون ہو گا وہاں؟“

”زیادہ لوگ نہیں ہوں گے۔ زیادہ لوگوں میں بلوغت نہیں دیگی جاتی۔ بس تم اوزیں، خشتا اور اس کا۔
رہنا اور اس کا؟“

”خشتا کا اس کا کون ہے؟“ شرت نے پوچھا۔

”تم نہیں جانتے؟ اے سیٹھ، لوہو دمن داس جوہری کالا کا گلاب داس۔ دیکھنے میں بڑا حسین اور خوبصورت ہے۔ سچ سچ گلاب معلوم ہوتا ہے۔ مگر خشتا کو اس سے محبت نہیں ہے؟“

”کیوں؟“

”کیوں کہ وہ جی اسٹوارٹ پر مبنی ہے۔ گلاب بے چارہ ہر سال اسے ایک نئی کار اور ہزاروں کے جواہرات لے کے دیتا ہے۔ پھر بھی خشتا خوش نہیں ہے۔ اگر وادی کا دباؤ نہ ہوتا تو وہ کب کی اُسے دستا بیاہلی ہوتی۔ فوراً وہ سیٹھ ل تو دیتا؟“

سجنا ناکالچ کا بال باصل بھرا ہوا تھا۔ ادنیٰ مجلس کا افتتاح تھا۔ لیکن سائنس کے علماء نے بھی مہنی مہنی مانی تھی۔ اور سب کے سب ہاں میں جمع تھے۔ بلکہ بہت سے لڑکے تو بال کے باہر کھڑے تھے۔ انہیں بال میں کھڑے ہونے کو بھی جگہ نہ ملی تھی۔ پرنسپل صاحب جن کی منگھلیں برود زگری تھیں۔ وہ بھی آج اپنی سونگھوں کو ہل دے کے آئے تھے۔ ہروفیسروں کی جینکوں کے شیشے غیر معمولی طور پر صاف تھے۔ اور پتلونوں پر بھی استری کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ لڑکے تو غیر بہترین لباس پہن کے آئے ہی تھے۔ ٹی فرٹ اور نالی لان کے شرٹ جن سے اند کا ہم کا صدمان لگتا ہے۔ ٹخنوں سے اور تنگ مہی

کی چٹوئیں۔ کچھ عرصے کے بعد لڑکے نائی لان کی شفات چٹوئیں بھی پہنے لگیں گے بھرپور دھڑکتوں میں کوئی فرق نہیں رہ جائے گا۔ راج دل لے سوچا۔

راج لاہشرٹ ادا بھینو کو ساتھ لے کے آئی تھی۔ مگر وہ چونکہ لڑکوں کا کالج تھا۔ اس نے کسی نے ان دو خلیوں کی طرف توجہ نہ کی۔ عشرت بہت عرصہ باس پہن کے آیا تھا۔ مگر لڑکوں نے اُسے ایک نظر دیکھا۔ پھر سمجھ گئے۔ پھر انہوں نے اُسے واقعی نظر انداز کر دیا۔ جیسے وہ بال ہیں۔ ٹھیکانہ ہو۔ راج لڑکیاں تقریر بہت عرصہ تھی۔ ابھینو نے جگہ جگہ۔ اپنی فقرے ادا احوال پچرا کر جوڑ کر دے تھے۔ ان پر راج کو بے حد داولی۔ آخر میں جب اس نے اپنی تقریر اس شعر پر ختم کی۔

جو بے نشان چلتے تھے وہ پاگئے منزل

ہیں تو راہ کے نام و نشان نے ٹوٹ دیا

ماہرین متواثر نہ دست تک تمہاریاں بیٹھے رہے۔ راج لڑکی کی تقریر کا موضوع تھا "اخلاق اور ادب" صاحب صدر جو خود کالج کے پرنسپل تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اخلاق اور ادب پاس ہے بہتر تقریر آج تک نہیں کی گئی۔

تقریر کرنے کے بعد راج کو لڑکوں نے گھیر لیا۔ آؤ گرات کہئے۔ اس میں کالج میں جانے کا مقصد یہی ہوتا ہے۔ تقریر اور دعوت تو ایک ہی بات ہوتی ہے۔ اس چیز کو تو لہو ہوتا ہے جب تک کی مائے ناز ہر دین آپ کے سامنے باطل سامنے چندا پنوں کے غاصط پر کڑی آپ کی آؤ گرات ہم بدستور کر رہی ہوتی ہے۔ تم جنت میں پہنچ جاتے ہو۔

راج کو کئی لڑکوں نے گھیر رکھا تھا

شیخ کے ایک کونے میں ابھینو اور عشرت بے وقوفوں کی طرح بیٹھے کبھی انھیں پاؤں پٹھانے۔ کبھی پاؤں کھانے لگتے۔ عشرت کو بار بار پسینہ آتا تھا مالاں کے سر کے اوپر ہنسنے لگا رہا تھا۔

تاریخ کے پروفیسر نے جزئیے کے پروفیسر سے کہا "ہمارے وقتوں میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔ ہم لوگ ملک کے بڑے بڑے فلسفیوں، سیاست دانوں، عالموں اور اچیوں کو پالتے تھے، اور ان کی باتیں سنتے تھے۔ آج اگر فزکس سوسائٹی کے لئے چندہ اکٹھا کرنا ہو تو بھی کسی ظم اشار کو بلایا جاتا ہے۔ بھے ظم دانوں سے کوئی عطا نہیں ہے۔ مگر انکی پروفیسر نے راج کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ یہ ادب یا سائنس یا تاریخ یا جغرافیہ کس کے بارے میں کیا جانتی ہے۔ یہ غالباً صرف چیک بک یا انٹرکرافٹ بک پروفیسر کا دیکھ سکتی ہے۔"

جزئیے کے پروفیسر نے جس کر کہا "مائی ڈیرٹل گاؤں کو۔ آج کل تاریخ کا زمانہ نہیں ملتا۔ آج کل کے نئے نئے تاریخ کے بکلیے جزئیے میں زیادہ دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔ اب اس بہترین ناخیز جزئیے کو پروفیسر مل گاؤں کو پہنچنے لگا۔ اور جزئیے کے پروفیسر کو کھینچ کر بال سے باہر لے گیا۔

کئی بنے گزر گئے، مگر عشرت کو سیر کا پانس نہ ملا۔ راج لانے بے حد کوشش کی، مگر اسے کہیں کامیابی کی صورت نظر نہ آئی۔ سیٹھ جمیدی لال نے تو قہر کا اعلان ہی کر دیا تھا: "جمیدی ڈاکو، جس میں عشرت اللہ راج لانہ لوں گا کام تھا۔ مگر بعد میں ڈسٹری بیوٹروں کے کہنے پر اسے اس قصیدے کے بننے کا خیال ترک کر دینا پڑا۔ کیوں کہ ڈسٹری بیوٹران دونوں لڑکیوں کے اعزاز کے مطالب سرائے کی کسی کے باعث اور اس پر سود و سود کی زیادتی کے باعث زیادہ تصویریں بنانے کے حق میں نہیں تھے اور ان تصویروں میں قورہ باگل ہی کسی نئے چہرے کو لے کر کسی نئے فلم کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ جمیدی لال نے سب کچھ راج لانگو اچھی طرح سمجھایا، مگر تے چہرے نہیں آئیں گے تو نئے لوگوں کو پانس کیسے لے گا؟ ایک روز میں بھی تو دنیا چہرہ تھی؟ راج لانے پوچھا۔

لڑکیوں کی بات اور ہے: "جمیدی لال نے مسکرا کر کہا: "اُن کے لئے زیادہ گنجائش ہے۔"

سیٹھ باکھڑ دیا لے گیا۔ "آج کل منہ چل رہا ہے۔ ارے جب سے جنگ بند ہوئی ہے منہ چل رہا ہے۔ تمہیں معلوم نہیں راج غلوں کا حال کتنا بُرا ہے۔ جو فلم بناتے ہیں۔ ڈاکو سے پھر سکتے ہیں ہر جاتی ہے۔ پاس آفس نے تو ہمارے پوش گم کر دیے۔ کچھ معلوم نہیں۔ عام لوگ کیا چاہتے

ہیں۔ یہ سالے چوٹی والے۔

کسی زمانے میں کم سے کم ٹٹ چار آنے کا ہر اکڑا تھا۔ اور عوام اسی میں جاک بٹھا کرتے تھے درود
کاری گر چھوٹے چھوٹے دوکان دار، کلرک، طالب علم ب چوٹی میں غم دیکھتے تھے مگر جیوں جیوں گرائی
بڑھتی گئی، غم دیکھنے کے بھی دامن بڑھتے گئے۔ ابھی چوٹی اٹھ دس آنے میں خریدنا جاتا تھا۔ لوگ اب اس
کلاس میں ٹٹنے کے لئے چار آنے کے پیلے دس آنے دیتے تھے۔ مگر ان سے مدد یہ چور نے ملے حضرات
اب تک انہیں "سالے چوٹی والے" کہہ کر پکاراتے تھے۔

"نہیں کوہیں کو دیکھو۔ یہ سالے گھوڑوں کو کیا بولیگا۔ اس سال میرا ایک گھوڑا بھی نہیں بیٹا۔ بیٹھ بکلیا
راج کو جانے لگے۔

مگر میں تو عشرت —

بانکڑا نے راج کی بات کاٹ کے کہا "اھر شاک ابھیج کرلو۔ چارمیں سال سے شاک ابھیج کا دستا
کر رہا ہوں۔ ایسا بڑا زمانہ بھی نہیں دیکھا۔ وہ لاکھ توکل ہی ہار گیا۔ ایک دن میں؟
"مگر میں تو سوتی آپ سے شاک ابھیج نہیں عشرت کی بات کرنے لائی تھی۔ دونوں کا آپس میں کیا تعلق؟
"بہت گہرا تعلق ہے۔ تم نہیں جانتیں؟ بیٹھ چک کے بولے۔

شاک ابھیج ہارے سا ج کا پر ڈیو سر ہے۔ وہ اپنی جگر پر قائم ہے۔ تو ب کہو اپنی جگر پر قائم ہے؟
مگر تم نہیں جانتیں؟

راج سٹ پٹا گئی۔ بولی: "آپ عشرت کو سیر کا پاس دے رہے ہیں، مگر نہیں۔ صاف صاف بتائیے نا؟
"وہی تو بتا رہا ہوں؟ بانکڑا نے راج کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کے کہا "اور اس کی تبدیلی کی صورت
خود سے دیکھ کے بولا "بہت لگی ہو۔ تم بہت لگی ہو۔
راج نے ہانا ہاتھ بٹایا۔

باہر دینے سے روک دیا۔ اگر زمانہ اچھا ہوتا۔ تو ضرور میں عشرت کو چاہس دیتا۔ مگر اب تو میں نے سوچ لیا ہے۔ کہ آپ کو رسک دینا ہی نہیں۔ سال میں چار بچہ بناؤ۔ چنانچہ نیناؤ۔ مگر بڑی سستا کاٹ لیلی بچہ بناؤ۔ بچہ بننے سے پہلے۔ ڈوشری بیروں کو بچہ دو۔ نہ کھٹ کھٹ نہ پٹ پٹ :-
راج اٹھ کھڑی ہوئی۔

”بیشوڑا! باہر دینا ہی نہیں دے گا۔“ سیڈم ابھی آتی ہوئی تھی :-
راج جواب دے بغیر سیڈم کی کہیں سے نکل گئی۔

جوشی راج محل میں خوشگ کر رہا تھا۔ وہ راج کا کو۔ ساؤنڈر بکاؤنگ کے کمرے میں لے گیا۔ اور انجینیر سے کہنے لگا کہ وہ چندہ بیس منٹ کے لئے باہر چلا جائے۔ اُسے راج لٹا سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہے۔ جوشی راج کا کو بہت دیر تک اونٹنی بیچ بھانا رہا۔
”تم اتنی حق ہو۔ بے وقوف ہو۔ پاگل گدی ہو۔“ جوشی نے راج سے کہا :- آخر تم کیوں عشرت کو سیرد کا چاہس دلوانا چاہتی ہو :-

”کیوں کریں اُسے چاہتی ہوں :-“

”بس یہی تمہاری حماقت ہے کہ تم یہ سمجھتی ہو کہ تم اُسے چاہتی ہو۔ دراصل تم اُسے چاہتی ہو۔ نہ تو تمہیں چاہتا ہے :-“

”وہ! ————— وہ میرے لئے جان بھی دے سکتا ہے :-“ راج لٹا نے اپنے پس کوندے بند کرتے ہوئے کہا۔

”وٹھو۔ پیاری۔ کبھی تم باری بھی پیاری نہیں۔ اس لئے کم از کم اس خطہ کے برتے کا حق تو مجھے دیدو“ جوشی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ راج خدا سا مسکراتی اور غصے سے اس کی باتیں سنتے لگی۔ جوشی کہہ رہا تھا :- ”تم عورت ہو۔ بہت سی باتیں سمجھتی ہو۔ عشرت کو میں کل ہیسیر کا چاہس

وے سکتا ہوں۔ دوسکتا ہوں مگر ایسا بھی نہیں کر سکتا۔ مرث تہا ہے بھلے کی خاطر میں جانتا ہوں۔ تم اسے کتنا چاہتی ہو۔ مگر جس دن تم نے اسے بیرو کا چانس دلایا۔ وہ تمہارے ہاتھوں سے ضل جلتے گا آخر دوسری بیرو کینوں کے بھی تو عاشق ہیں۔ وہ بھی خوب مصرت ہیں۔ بلتے ہیں۔ بچھلے ہیں۔ نوجوان ہیں وہ لڑکیاں کیوں انہیں سنبھال سنبھال کے رکھتی ہیں۔ کیوں انہیں کسی غم میں بیرو کا ہلکا بیرو سے کم درجہ کا بدل بھی نہیں دلاتیں؟

راج لا جوشی ہی کا منہ دیکھنے لگی۔ واقعی یہ بات جڑی حبیب تھی۔ اُسے رحمتا اللہ اسس کا دوست سنتو شش کمار یا دایا۔

جوشی جی نے راج کا چہرہ دیکھا۔ اور اپنی آواز غبی کر کے بولا: ڈارنگ تمہارے بھلے کے لئے کہتا ہوں اگر عشرت کو اپنے قابو میں رکھنا چاہتی ہو تو اسے کسی غم میں چانس مت لینے دو۔ وہ نہ ایک ہی تصویر میں کام کرنے کے بعد وہ تمہارے کام کا نہیں رہے گا۔ تمہارے ہاتھ سے جلتے گا۔ دیکھو بیوند کمار کرب سے پہلے آٹھ سالے کام ہو لایا تھا۔ اب دونوں ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے۔

گل کر دانی بالے کام دلایا تھا۔ آج گل محمد نے ارشاد سے شادی رچائی ہے۔ اور دانی بالہ۔ منہ تکی رہ گئی۔ اگر تم عشرت کو اپنے ہاتھ سے کھونا چاہتی ہو۔ تو کل اُسے میرے پاس بیجو۔ میں اُسے کام دے دوں گا۔ جوشی جی نے سچی بکائی راج سوچنے لگی۔ بات تو ٹھیک کہتا ہے۔

جوشی جی نے کہا: ڈارنگ تم نے ہیں چھوڑ دیا۔ مگر اب بھی تمہارے بھلے کے لئے سوچتے ہیں تم؟ عشرت کو اس طرح بھی نہیں۔ اُسے تاج پائی۔ اپنے کپڑے۔ اور میں ایسا کم کر دو کہ مج سے شام تک اسے غم کا دھیان تک بھی نہ آئے۔ غم میں آیا۔ اور تمہارے ہاتھ سے گیا۔ کیوں؟ راج نے سوچتے ہوئے کہا: بات تو تم جیکے کتے ہو؟

جوشی جی نے خوش ہو کر اُسے گلے سے لگایا۔ اُس نے کہا کہ میں ہاتھ ڈال کے اس کا پید بچل کر کشش کرنے لگے۔ چند لمحوں کے لئے تو راج نے اُن کے بس کو برداشت کیا۔ پھر اپنے آپ کو جھٹاتے ہوئے بولی "اجتاب یہ کتوں کی طرح کیا کچ کچ کچ لگا رہی ہے۔ مجھ کو دبوچے"۔

اُس نے اپنے آپ کو جوشی جی کی گرفت سے چڑھایا۔ اور ریکارڈنگ روم سے باہر چل گئی۔ باہر انجینئر دیوار سے لگا سگریٹ پی رہا تھا۔ وہ راج کو دیکھ کر سکرا۔ راج جلدی سے اپنی ساڑی سنبھالتی ہوئی تیزی سے گزر گئی۔

"سال! انجینئر نے سگریٹ سہینک کر اُسے اپنے پاؤں تلے دالتے ہوئے کہا۔

ایک سال گزر گیا۔ عشرت کو کہیں بیرو کا چانس نہیں ملا۔ یہ سال عام لوگوں کے لئے بڑی مصیبتوں کا سال تھا۔ بہت سے سٹوڈیو میں لاسٹ میوز اور دوسرے خفہ مند کرتاواٹے چھپو ماہ ہو گئے تھے۔ میسور میں ایک سٹوڈیو بند ہوئے والا تھا۔ بہت کم تصویریں بن رہی تھیں۔ ایک کٹر لوگ نے بے کار رہتے ہی تھے۔ اب اس کا آخر دوسرے درجے کے اداکاروں پر بھی پڑ رہا تھا۔ جو کہ کیکڑوں کی طرح تھے۔ اُن میں سے بہت سے لوگوں کی گاڑیاں گر دی ہوئے کالہ دیوڑی منڈ کے جینوں کے پاس پہنچ چکی تھیں۔ یہی لوگ تھے جو انڈسٹری میں نہ یہ بھی نکلے تھے۔ جب اُن لوگوں نے یہ حالت دیکھی تو سراسیمگی کی شرم سو رہی بڑھادی۔ پہلے تیس بائیس فی صدی پر روپیہ مل جاتا تھا۔ اب پچھتر فی صدی پہنچے لگا۔ ایک لاکھ روپے پر پچھتر ہزار سو رو۔ تو تصویر بننا۔ اب ایسے میں کسی تصویر بننے کی اور کیا تیار ہوگی۔ ایک

ایک لاکھ روڈیوں پر مبنی بنے۔ تصویری شروع ہوئی تیس اور آدھی ایک ہوتی ہیں کے
وہ جاتی تھیں۔ ہر روڈیوں پر سچ میں روپیہ کما جاتے تھے۔ ایک لاکھ پر بیشتر ہزار سود کو دے گا؟

جوشی جی نے سینٹ کٹر چند سے ایک لاکھ روپیہ سود پر لے کر اپنی بیوی کے نام پر ایک مکان
بنایا تھا۔ میں ہزار نظم میں بھی لگا یا تھا۔ دو مہینے تیار ہو کے ڈبے میں پڑی تھیں۔ آگے کے لئے کام بند
تھا۔ جوشی جی باخود یا سینٹ کی تصویر بھل کر رہے تھے۔ اب سینٹ کٹر چند آگے بڑھے۔ مزید رقم دے تو
اس کی پھر بھی سکتی تھی۔ دودھ میں کسے جس طرح جوشی جی میں کر رہے تھے۔

مگر موت اُن پر کے چامیس پکاس یا سو آدمی مزے میں تھے یہی کی فلم اندیشی میں نکلی گئیں
ہزار آدمی کام کرتے تھے۔ اُن ایک سو کو چھوڑ کے باقی سب کی حالت بدتر سے بدتر ہوتی جا رہی تھی
مارج کی بانہوں کے باہر اندھیرا تھا۔ عشرت نے اُن خوب صورت بانہوں کے اُسے کو نشیت جاتا۔
میں عشرت نے اُسے کال اور صُست اور جود بنا دیا تھا۔ وہ پہلے سے دنگ مڑا اور بھاری ہو گیا
تھا۔ اُس کا پیٹ تھوڑا سا آگے کھل آیا تھا۔ اس کا چہرہ سخت ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں وہ خسر ملا ہے نہ
رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک طرح کی ملائیت چھا گئی تھی۔ جیسے پلے ہوئے شہر کے چہرے پر ہوتی
ہے۔ اب اُسے گندہ خاق پسند آتا تھا۔ اب اُسے بھنگ یا دھکی یا چرس سے نشہ نہ آتا تھا۔ وہ
مارج کے بھائی ابھینو کے ساتھ اُن تمام مراحل سے گزر کر ارفیا کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ جب تک وہ
لارینا کا بگبگشن نہ دے لے اُسے نشہ نہیں ہوتا تھا۔

ابھینو اس میدان کا پُرا نامکلاڑی تھا۔ وہ کہنے لگا "بھائی جے تو اب اس لارینا سے بھی
نشہ کم ہونے لگا ہے۔ میں تو اب سنسکیا چائنا شروع کر دیں گا۔"

"سنسکیا؟ عشرت حیرت سے بولا "سنسکیا سے تو آدمی مر جاتا ہے۔"

"ایک دہائی سے شروع کر دیں گا۔ ابھینو بولا "اب پھر خوراک بڑھانے بڑھانے بڑھانے جاؤں گا۔"

سنگی سب نشوں کا بادشاہ ہے۔ اور پھر پھر تو نشے کی سراج وہ مقام ہے جہاں آدمی سانپوں
 ڈسوا شروع کرتا ہے۔

”سانپوں سے ۱۰ عشرت کی انھیں حیرت سے چلی کی چلی رو گئیں جہنم مذاق کرتے ہو۔“
 ”مذاق نہیں ہے۔ خدا کم زہریلے سانپوں سے میں نے کئی سلاموں اور فیروں کو ڈسوانے دیکھا
 ہے۔ انہیں صرف سانپ کے زہر سے نشہ ہوتا ہے۔ بس اُس نشے کا جواب نہیں ہے۔ نشوں میں
 یہ عرفان کی آخری منزل ہے۔“ ”سانپ کا زہر ۱۰ عشرت کا پُٹھا نہیں اپنے لئے تو بس مار دیا
 کافی ہے۔ چوسات گھنٹے ایسا جہان نشہ ہوتا ہے کہ چٹو کیا چیز ہے۔“
 ”آپ کو تو اب اس سے بھی نشہ نہیں ہوتا۔“ ”ابھینو شیخی بھجار کے بولا۔
 اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ عشرت دھڑا دھڑا باہر گیا۔
 شمشاد ٹیلی فون کر رہی تھی۔

عشرت نے کہا ”راج تو کہیں باہر گئی ہے۔“

شمشاد بولی ”کل مید ہے۔ ہمارے ہاں آپ کی دعوت ہے۔ راج کی اور آپ کی۔ آئیں گے ہیں؟“
 عشرت نے کہا ”مزدرا آئیں گے۔ آپ بلائیں اور ہم نہ آئیں۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟“
 شمشاد نہیں بولی ”راج سے کہہ دیجئے گا۔ اُسے میں دوبارہ ٹیلی فون کروں گی۔ اور ہاں دیجئے۔“
 ٹیلی فون پر اپنی آواز سنی کرتے ہوئے بولی ”ابھینو شیخی کو نہ لایئے گا۔ میں نے بس بہت کم لوگوں کو
 بلوایا ہے۔“

”جی بہت اچھا۔“ عشرت نے رسیور رکھ دیا۔

شمشاد خود تو اس قدر چاؤک نہ تھی۔ لیکن اس کی دادی آماں بہت ہوشیار تھیں۔ وہ راج کا ایسی نٹ کھٹ لڑکی کی حرکتوں کو پسند نہ کرتی تھی۔ وہ مفت لال پارک کے چمے سوز سوزے میں ایک خوب صورت غیٹ میں رہتی تھی۔ اس کے ہاں ہمیشہ عید کی دعوت ہوتی تھی، مگر کبھی ایسا بھید نہ ہو سکتا تھا۔ جو راج کی دعوت میں ہوتا تھا۔ اس نے اس دعوت میں صرف دس جوڑے بلائے تھے۔ کوئی آدمی کیلا نہیں آیا تھا۔ اور کوئی آدمی اپنی بیوی کے ساتھ نہیں آیا تھا۔ شمشاد کی دادی اس کا خاص خیال رکھتی تھی۔ کہ کسی ایسے آدمی کو نہ بلایا جائے جو غلطی سے اس موقع پر اپنی بیوی کو لے کے چلا جائے۔ راج کے ہاں یہ بھی ہو جاتا تھا۔ جس سے دعوت کی گراگزی میں خاوند سے ایسی حرکتیں ہو جاتی تھیں جس کا خمیازہ اُسے بعد میں بیوی کے سامنے بھگتنا پڑتا تھا۔ ایسے موقعوں سے بے چاری بیویوں کو ڈور ہی رکھنا چاہیے۔

دادی آماں بہت کچھ دانتھیں۔ اُنہوں نے ریاستوں کا زمانہ دیکھا تھا۔ وہ محل کے آداب جانتی تھیں۔ آج کل کی لڑکیاں بسب گڈ ڈکرتی ہیں۔

اس دعوت میں فلم کے لوگ زیادہ تھے۔ مگر تین جوہری بھی تھے۔ ان کے ساتھ تین ہی کلاس کی بیرونیسی بھی تھیں۔ راج لکے نے یہ نہیں لوگوں سے اس طرح ملنا واقعی ایک اچھا بار۔ لیکن وہ ان لڑکیوں سے واقف تھیں۔ مگر راج سے پہلی بار یوں ملنا ہوا کیوں کہ بظاہر یہ لڑکیاں اپنے آپ کو بہت لے دے رہتی تھیں۔ ان کی آمدنی یعنی غصوں سے آمدنی بھی زیادہ نہ تھی۔ اس نے راج کچھ نہیں سنی تھی۔ کہ ان لڑکیوں کا شیش قیمت لباس قیمتی زیورات اور ہر سال نئی گاڑی کہاں سے آتی

ہے؟ پیاری راج کنتی جلدی تم اپنے اخی کو بھول گئی ہو۔ تلخ باتیں کون یاد رکھتا ہے۔ ایک دن یہ لوگیاں بھی بام شہرت پڑیچنگ کر بھول جائیں گی۔ آج یہ لوگ جدوجہد کر رہی ہیں۔ اور وہی ہتھیار استعمال کر رہی ہیں۔ جو کبھی تم نے کئے تھے۔ کتنا صدیوں پڑانا راستہ یہ ہے۔ کتنا آسان بھی ہے۔ ایک خوب صورت منجی انماؤں والی عورت کے لئے!

دعوت میں کسی طرح کا بھگسا بھی نہ ہوا۔ شراب کا اور بھی نہ پلا۔ جوہری لوگ اور دوسرے لوگ بھی ششاد کے لئے تھخے لائے تھے۔ ششاد کا دوست گلاب داس خود ایک جوہری کا لڑکا تھا۔ ظاہر ہے، کہ اس کے تھخے سب سے عمدہ تھے۔ مگر دوسرے جوہریوں کے تھخے بھی۔ کوئی کم ششاد نہ تھے کوئی چھب کرنے کے لئے۔ کوئی دقا قائم کرنے کے لئے۔ کوئی مستقبل کی طرف سجادہ رکھتے ہوئے ششاد کے لئے عمدہ سے عمدہ تھخے لائے تھے۔ اصلی بیروں کے زیورات۔ ان لوگوں کا تاج اور گرین میں کانٹ پلتا تھا لندن۔ شہر کا گورنر پارک میں ان لوگوں کے دفتر تھے۔ یہ لوگ بھی کے اعلیٰ مالک تھے۔ ان کے ہاتھوں میں گھڑیوں پر کوٹ اور فیس کے بیٹوں پر اتنے میرے گھے ہوئے تھے کہ ان کی قیمت ساموت میں خرید کر ہونے والی تمام میوینوں کے مجموعی بنک بلیٹس سے زیادہ ہوگی۔ وہ صوفے پر اس طرح بٹھے تھے۔ جیسے وہ اس صوفے کے مالک ہوں۔ جب وہ چائے پیتے تھے۔ تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی پراسان کر رہے ہیں۔ جب وہ لوگ کسی کی طرف دیکھتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ وہ اُس کے بھی مالک ہیں۔ جس کی طرف وہ دیکھ رہے ہیں۔ ان کے جسم کی ہر ادا کتنی تھی بہم مالک ہیں۔ ہم مالک ہیں:

ان لوگوں کی بہت اچھی بیویاں تھیں۔ جن کے ساتھ بہت پیاری پاکیزہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے بچے تھے۔ خوب صورت پیارے بچے جو آخر غری اسکولوں میں قلم پاتے تھے۔ یہ لوگ اُن سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان لوگوں کو اُن کے گھر میں اپنی پیدی جھولا جھولتی ہوئی بیویوں کے ساتھ دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ لوگ بھی ایسی دعوتوں میں شریک ہو سکتے ہیں یہ لوگ اپنے اچھے پر

چند لگے ہوئے اس قدر پوتر باطل گنگا جل کی طرح شفاف اور شہرے ہوئے نظر آتے تھے۔ یہ لوگ جو بیسویں صدی کے خدا تھے۔ مقدس تھے۔ اور ہر سوساٹی میں پرچہ جاتے تھے۔ یہ لوگ یہاں کیوں بٹے تھے جن کے پاس سب کچھ موجود تھا۔ پھر یہ زندگی سے کیا چاہتے تھے۔

سب کچھ کے بعد کچھ اور اس کے بعد کچھ اور ————— دیوتاؤں کا کیا اعتباری ہوس کبھی نہیں ملے گی؟ کیا تم کسی کو انسان نہیں بننے دو گے۔

ہندو دیوتا میں کتنے ہی ایسے دیوتا تھے جن کی سینکڑوں بیویاں تھیں۔ تو پھر آج کل کے لوگ کیوں شاپنا پرائیویٹ مرم رکھیں۔ گھر سے دود۔ گھر سے باہر۔ ایک مسافر اسٹریٹ۔ ایک بھی جہاں باندی۔ ان کے حکم کے منتظر کا بادیوی روڈ۔ اور حمام اسٹریٹ کے خداؤں کے ہاں یہ فیشن میں داخل تھا۔ ایک بیوی اور ایک دہشت۔ بہت سے بندھے سینٹو جی جی فم کے جنسی تعلقات درکار کر سکتے تھے۔ وہ بھی ایک دہشت چاہتے تھے

ششاد کی دادی بہت خوش تھی۔ اب کی بچہلی عید سے زیادہ تھے آئے تھے۔ زیور کی پاپس خمار کے ہوں گے۔ اکیلے سینٹو جنونٹ لال پارک بے پندہ ہزارے زیور دئے تھے۔ حالانکہ پچھلے سال اس نے صحت سات بزار کا ایک بار دیا تھا۔ جنونٹ لال پارک کی طرف ششاد کی دادی نے طور سے دیکھا مگر سینٹو جنونٹ لال پارک کو بڑے آرام سے چائے پی رہے تھے جیسے کچھ ہوا نہیں۔ مجھے اس سینٹو کو کسی دن ٹیل فون کرنا پڑے گا۔ دادی انہں نے دل میں سوچا۔ میری بے بی بڑی بڑے قوت ہے اسے کھانا کھانا نہیں ہیں دیکھو اس وقت بھی کیا فرے سے گلاب کاس سے باتیں کر رہی ہے۔ اسے گلاب کاس تو غالی ایک جوہری کا لاکا ہے۔ مگر جنونٹ لال پارک تو کرسٹل ایسی ڈیشن کے سکریٹری ہیں۔ بڑی احمق ہے۔ ایک اندر بھی توڑ کے نہیں دیکھتی سینٹو پارک کی طرف۔ بس گلاب کو دیکھ کر ہی ٹھکرائے جاتی ہے۔ اندر ہی!

دعوتِ خیر و خوبی ختم ہوئی۔ اب لوگ چلے گئے۔ شمشاد نے راج اور عشرت کو روک دیا۔ وہی ماں اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ شمشاد نے دیکھی کہ بوتل کھولی۔

اس جگہ ہوئے غلیٹ میں بڑا سکون ہے۔ رنگ مدیم ہیں۔ پردے نظر نواز ہیں۔ تصویریں آرٹ کے بہترین نمونے ہیں۔ کتابوں میں عمدہ مصنفوں کی کتابیں بھی ہوئی ہیں۔ گلاب داس خوش ذوق آدمی معلوم ہوتا ہے۔ عشرت نے سوچا۔ راج تلکے گھر میں۔ کتنی اناکار کی ہے۔ پڑھیں تو شروع۔ تصویریں ہیں تو ٹنگی۔ رنگ میں تو چھینے ہوئے۔ اس کم بہت راج کو کبھی عقل نہیں آئے گی۔

رات ۱۔

یہ رات کتنی صاف ستھری اور سکنت ہے۔ گویا ابھی ابھی لائڈری سے دُھل کے آئی ہے۔ اس کے سیاہ بادے سے کسی ٹپکی ٹپکی خوشبو کی لپٹیں آرہی ہیں۔ شمشاد نے صرف ایک ٹپکی سی روشنی رہنے کی پھر اس پر بھی سبک کا ایک مدال ڈال دیا۔ اب روشنی کتنی آہستہ سے چھپتی ہوئی آرہی تھی۔ عشرت کو گوانیچہ آنے لگی۔

شمشاد نے ریڈیو گرام پر مغربی ناچ کی ایک سسٹ ریڈارگٹ چھیڑ دی۔ شمشاد اور عشرت راج اور گلاب ہوئے ہوئے فاض کرنے لگے۔ کتنی خاموشی ہے۔ شمشاد کی آنکھوں میں کتنی بلاغت ہے۔ بڑی تپتی تپتی کوئیں ایک دوسرے کے جسم میں جھل جاتے تو کہہ رہی ہے۔

پیر گیت ختم ہو گیا۔ طلسم ٹوٹ گیا۔

شمشاد اور راج کو اپنی خواب گاہ میں لے گئی۔ بہر کرے میں صرف عشرت اور گلاب داس رہ گئے۔ دونوں ہوئے ہوئے دیکھی پتھر رہے۔ گلاب داس کے چہرے پر ایک عجیب طنز پر مسکراہٹ تھی۔ عشرت کی آنکھیں شے سے سُرخ تھیں۔ دونوں ہوئے ہوئے خاموشی سے دیکھی پتھر رہے۔ ایسے لوگوں میں کچھ کہنا بے کلام ہوتا ہے۔

تھوڑی دیر بعد ششاد اپنی خواب گاہ سے باہر آئی۔ مگر راج اس کے ساتھ باہر نہیں آئی ششاد اُن دونوں کے سامنے آ کے بیٹھ گئی۔ اُس کا گلاس خالی تھا۔ عشرت نے اس کے لئے گلاس بنایا۔ ششاد نے ایک گھونٹ پی کے کہا ”اندرا راج آپ کو بلاتی ہے۔ عشرت گلاس ہاتھ میں تھامے اُٹھا۔ اور ششاد کی خراب گاہ میں چلا گیا۔ اس نے سوچا، اب میرے فرائض سرانجام دینے کا وقت آگیا ہے فرض فرض ہے۔

راج ایک بیڈ پر نیم دراز حالت میں تھی اپنی جامنی رنگ کی ساڑی کے مٹلا پلو سے کیل رہی تھی عشرت اس کے قریب آ کے بیٹھ گیا۔ راج نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا اُس کے ہاتھ میں یا قوت کی ایک خوبصورت انگوٹھی چمک رہی تھی۔ جو عشرت نے اس سے پہلے نہ دیکھی تھی۔ یہ انگوٹھی بے عشرت نے پوچھا۔

”ششاد نے مجھے دی ہے۔ دی نہیں ہے۔ مجھ سے بدل لی ہے۔ میں نے اُس کی انگوٹھی۔ اور اس نے میری انگوٹھی پہن لی ہے۔ آج سے ہم دونوں بہنیں بن گئی ہیں پہلے ہم دوست تھیں، مگر آج سے بہنیں ہیں؟“

”مبارک ہو“

”کچھ عرصے تک خاموشی رہی۔ راج پھر اپنی ساڑی کے پلو سے کیٹنے لگی۔ آخر کوئی ”ششاد تمہیں جاہتی ہے۔“

”کیا مطلب؟“ عشرت کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”بس کج کی آج تم اس کے پاس رہ جاؤ؟“

”تمہارا مطلب ہے؟“ عشرت نے بڑی حیرت سے پوچھا۔ ”جس طرح تم نے انگوٹھیاں بدل لی ہیں اُسی طرح....“

”ہاں۔“ راج نے مسکرا کر کہا ”میں گلاب داس کے ساتھ جاؤں گی، تم یہاں رہو گے؟“

”عزیز کن ہوں۔ کیا ہوں۔ تم ————— کیسے بے غصے کے ارے عشرت کے منہ سے
 کچھ اور نہ نکلا۔“

زارنگ ایک رات میں کیا ہوتا ہے ؟ راج نے اپنے ہونے کیلئے ہونے کہا۔

یہی ہے کہ عشرت نے راج سے شادی نہ کی تھی۔ پھر بھی وہ اسی طرح رہتا تھا۔ جیسا کہ وہ
 اپنی بیوی کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ اسی طرح اس کا دفاع کرتا تھا۔ دل سے اور روح سے۔ اور حالات سے
 بھی۔ کسی طرح سے بھی اس نے کسی دوسرے طریقے سے نہ سوجھا تھا۔ وہ چاہتا تو اور مراد مرچا سکتا
 تھا۔ جیسے کہ اس کے ماحول میں دوسرے لوگ کرتے تھے۔ اور اُسے ہرگز بُرا نہیں سمجھتے تھے۔ مگر اس
 قدر بڑے کرپ کر اس گنہگار کا ایک حصہ بن کر بھی وہ اس حد تک گیا تھا۔ وہ مکرور تھا، بُرا تھا، بولبی تھا
 یہ بھی سچ ہے کہ وہ راج سے دلی محبت نہ کرتا تھا۔ وہ خود ہیروئن کر اس سے نجات پانا چاہتا تھا، مگر
 کچھ عرصے سے اس نے ہیروئن کے انتخاب بھی دیکھنا بند کر دیا تھا۔ کچھ عرصے سے وہ اپنی قسمت پر رونا
 تھا۔ راج پر رونا، شراب پر رونا، اپنے لباس پر رونا اور مارنے کے انجکشن پر رونا۔

پھر بھی وہ بدکار نہ تھا۔ اس وقت جب راج نے اس کے سامنے یہ تجویز کی تو کہیں کسی کو نے میں کبھی
 ہوئی ہرافت کے دو آنسو اس کی آنکھوں میں کھسک آئے۔

راج نے اس کے گلے میں بانیں ڈال کے کہا: ”دیکھو میں خدا کی بات کے لئے اپنی بہن کو کیسے بھلا
 کر سکتی ہوں۔“

عشرت اس قدر احمق تو نہ تھا کہ کچھ نہ بول سکتا۔ ایک چہرے پر ہونے لگے اس کے
 ارد گرد کے غول کوئی یں سے شق کر دیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے حقیقت اس کے سامنے آگئی تھی ایک
 لمحے میں گویا راج نے اپنے جیسے ہوئے پالش شدہ ناخنوں سے اس کی روح کے باوے کو
 تھمتا کر دیا تھا۔ اور اُس نے بالکل ٹھیک کر دیا تھا۔ اور وہ اپنے آپ کو اس طرح دیکھنے لگا کہ اسے اپنے



جہد سے نفرت ہو گئی۔ وہ کس لئے کرا تھا۔ کس ابر ہاؤں اور نقدوں کو لئے کر رہی تھی۔ مادہ ہوا تھا۔ جس کس طرح سے جہد جہد کرنا چاہتا تھا۔ اور پھر اس نے کس طرح جہد جہد کو ختم کرنے کے لئے ایک چھوٹا آرام دہ راستہ ڈھونڈ لیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے اُسے محسوس ہوا کہ جہد جہد کا کوئی آرام دہ چھوٹا راستہ نہیں ہے۔ جہد جہد محنت جانکا و طویل اور جاں گداز ہوتی ہے۔ اس میں غریبی بھی محسوس ہوتی ہے۔ اور محنت کبھی کبھی اتنا سہا ہوتا ہے۔ کہ نا اچھی تو نا اچھی نا اچھی اُسے دیکھتے ہوئے تھک جاتی ہیں۔

مگر صرف ایک لمحے کے لئے اس نے سوچا۔ دوسرے لمحے میں اس نے اپنی نا اچھی نا اچھی ایک رات ہی کی تو بات ہے۔ پھر یہ رات کتنی حسین ہے۔ کتنی نرم اور گداز۔ منہ نہیں سرگوشی کرتی۔ جتنی سوچاؤ۔ سوچاؤ۔ زندگی نام ہے سوچاؤ کا۔ نا اچھی بند کر لینے کا۔ کئی کئی غلو کی آئینہ رستہ سے کہ ہوں باہنوں کی گولائی میں اپنے آپ کو محسوس کر لینے کا۔ ایک نئے جسم کی پکار سننے کا۔۔۔ آج تو سوچاؤ۔ کل دیکھا جائے گا۔ یہ رات گزر جانے دو۔ کل سے وہ پھر جہد جہد شروع کرے گا۔ وہ رات کو اور تشاؤ کو اور اسی تم کے بے حد اپنے اور بے حد نیچے۔ احوال کو ہمیشہ کے لئے خیر یاد کر دے گا۔ پھر سے زندگی کا ایک نیا باب شروع کرے گا۔

مگر آج تو سوچاؤ۔ کل دیکھا جائے گا۔ ایک رات سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ایک دوسری بات تو ہے بھائی عشرت کو ارفیا کے الجھن کی محنت ضرورت محسوس ہوئی۔

جب آدمی محنت نہیں کرتا ہے تو وہ اپنی زندگی میں یہ جان چاہتا ہے۔ راج کا خیال ہوتا۔ وہ عشرت سے بے پناہ محنت کرتی ہے۔ لیکن جب تشاؤ اس کے سامنے یہ سوال رکھ دیا تو راج کو فیصلہ کرنے میں ایک منٹ نہیں لگا۔ کسی طرح کی اُداسی۔ گھٹن وہ پریشان کن استہباب ہوا سے اس موقع پر محسوس کرنا چاہئے تھا۔ اس نے کچھ کچھ محسوس نہ کیا۔ اس بات پر اُسے بڑی حیرت ہوئی۔ دوسرے لمحے میں اس کے سامنے ہم میں ایک سنسنی ہی دھڑکی۔ اور اس نے باطل نئی نگاہوں سے

گلاب داس کی طرف دیکھا اور مضی جذبے لگی پچکانی لہریں اس کے دگ وپے میں دوڑتی چلی گئیں۔ عشرت ٹھیک تھا۔ بہت عمدہ اور پیارا تھا۔ مگر یہ چیز بالکل نئی تھی۔ اس میں کتنا تعمر ہے! بوائے یہ تعمر! موٹر گلاب داس اور راج کو لئے جوہری پڑیج سڑک پر دوڑنے لگی۔

مگر جب ایک دن گزر گیا۔ دوسرا دن بھی گزر گیا۔ اور عشرت واپس نہ آیا تو راج کو تشویش سی محسوس ہوئی۔ اس نے شمشاد کو ٹیلی فون کیا۔

”کیا بات ہے۔ عشرت کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”ہاں بالکل ٹھیک ہے۔“

”تو پھر وہ آیا کیوں نہیں؟“

”یوں ہی۔ شمشاد بھی؟“

”یوں ہی کیا؟ راج نے فدا خفا ہو کے پوچھا۔

”میں نے سوچا۔ کیوں؟ مدہفتے بھر کے لئے یہاں ٹھہر جائے۔ اس میں ہرج ہی کیا ہے؟“

”ہفتے بھر کے لئے؟“ راج ٹیلی فون پر پھٹی۔

”چلاؤ نہیں بہن؟ شمشاد نے ٹیلی فون پر راج کو مشورہ دیا۔ عشرت کا بھی کبھی خیال ہے۔

”بھی خیال ہے؟ راج نے غصے میں دوہرایا۔ ”منو شمشاد تم وہیں ٹھہرو۔ میں ابھی آتی ہوں؟“

”مگر؟ شمشاد ہوئی۔

مگر راج نے یہی فون بند کر دیا تھا۔ اور اب وہ اپنے کمرے میں مدد سے چپ رہی تھی۔

”ابھینو ہشکر، چچا دودھ۔ تم سب کہاں مر گئے؟“

تھوڑی دیر میں غاندھائی کے آٹھ دس افراد، اور پانچ جو ٹکڑ اور نوکرانیاں راج کے گرد بٹنے لگیں۔

راج ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے غصے سے باڈل ہو رہی ہے۔

اس نے پاؤں فرش پر ند سے باز کر کہا۔

”جلدی سے گاڑی بنائو۔ سو رکے پور؟“

جب گاڑی ماہم کے کازوے پر سے گزر گئی۔ تو راج نے پھر پاؤں پٹخ کر اپنے خادمہ شکر سے کہا۔

”گاڑی تیز کیوں نہیں چلاتے؟“

”چالان ہو جائے گا۔“

”ہو جائے دو۔“

”کوئی آدمی نیچے آجائے گا۔“

”آجائے دو۔ مگر گاڑی تیز چلاؤ۔“

یہ دو دن راوی اماں کے لئے بڑی مصیبت کے دن تھے۔ اپنی پوتی کو وہ کیے بھلائے
 لکھاب۔ اس کی پہلے امد ہے۔ اور اس نئے تھنلو۔ ہلائی۔ روز عشرت کو گھر میں رکھنے کی بات باہل ہی
 ”ہر مہربانی ہے بھر لی ہوئے بلدا رہنما کو سمجھا۔ مگر شاد تو دے خوش تھی۔ جیسے اُسے کوئی نینا
 کھلونا لگ گیا ہو۔ وہ اپنے آپ سے بہت خوش تھی۔ اس نے راج کا ہیرہ مار لیا تھا جیسے شطرنج میں
 کوئی وزیر یا سلطان کو مارتا ہے۔ وہ جیتی ہوئی بازی کو اپنی جوتی بازی میں کیوں کر تبدیل کر سکتی تھی
 اور پھر مشرت نے رد رد کر اُسے بتایا تھا کہ کس طرح وہ اُسے چاہتا ہے۔ شرمندہ ہی سے چاہتا تھا۔
 مگر حالات نے اُسے ایسا مجبور کر دیا تھا کہ راج کے پاس رہتے ہوئے وہ محبت کا لفظ منہ پر نہیں لے سکتا

تھا۔ بس طرح عشرت نے اس کے قدم چھو لئے تھے۔ جیسے وہ زہرہ کی دیوی ہو۔ اور گلاب داس کیسے اکٹھے اس سے بات کرتا تھا۔ وہ اس کے روپے اور جواہرات کی بھونکی نہیں تھی۔ وہ سینے میں خود ستر اسی ہزار کمائی تھی۔

گلاب داس کیسے اس پرچم چلاتا تھا۔ جیسے شہزاد ہندوستان کی اول درجے کی بیروٹی نہ ہو۔ اس کی متوجہ باگیر ہو۔ نکلا۔ اب وہ اسے مزہ دکھا دے گی۔

لیکن راج کے آنے سے وہ ڈر بھی رہی تھی۔ بڑی تیز ہے۔ جالے کیا کیا کہے گی۔ مجھ۔ تو بات بھی نہیں کی جائے گی۔ اور وہ تو ایک سٹش میں بے ہزار مسلمانوں میں مٹا دے گی۔

اور راج کی حالت جب وہ شہزاد کے گھر پہنچی یہ تھی کہ اگر اس وقت شہزاد کی خوش قسمتی ہے اس کی دواوی اماں ڈرائنگ روم میں بیٹھی نہ ہوتی۔ تو وہ شہزاد سے بات کرنے کے لئے ان کے بجائے چلے سے کام لیتی۔ اس قدر اُسے غصہ تھا۔ اس کا لڑکا اور کوئی دوسرا بٹلے لڑکے اس ملکیت اب پوری طرح سے باگ چلی تھی۔ وہ عشرت کو بازو سے پھڑکرا اپنے گھر لے جائے گی۔ میں بھی نکلیں گی میری چیز کو کون مجھ سے چھین سکتا ہے۔ داد! ایک دن کے لئے اُدھار دیا۔ اور آپ ملک ہی بن نہیں۔ مسلم ہوتا ہے۔ اخلاق تو دنیا میں رہ ہی نہیں گیا ہے۔

راج اسی طرح جتنی بھنی کڑھنی کو سنتی ہوئی جب ڈرائنگ روم میں آئی تو دواوی اماں اُسے دیکھتے ہی اس کی بلایں مینے لگیں۔ اور اُسے گلے سے لگ کے روئے لگیں۔ دواوی اماں بڑی ہی ہلکے نمبر کی کشتی اور زمانہ ساز تھیں۔ زمانے نے انہیں اور انہوں نے زمانے کو بیت اچھی طرح سے دیکھا تھا۔ وہ تو توئی کو ایک نظر سے دیکھ کر بتا دیتیں کہ اس وقت اس کے دل میں کیا ہے۔ شہزاد راج کے آنے سے گہرائی ہوئی تھی۔ راج غصے سے اپنے نبڑش و دھاس میں نہ تھی۔ دواوی اماں کے دماغ میں یہ بات باطل صاف اٹھ تھی۔ جنگ کا نقشہ انہوں نے اپنے سامنے ذہن میں پھیلایا تھا۔ اور ایسا

وہ اس کے مطابق کام کرنے لگیں۔ کچھ ہی روز بعد۔ عشرت کو واپس راج کے ماں باا ہی پڑے گا
 کہاں عشرت؟ کہاں گلاب داس۔ ایسا امیر سرسٹے دار شیوا ب کہاں لے گا۔ ششاد کی عقل پر تو پونے
 بڑ گئے تھے۔ گروادی اماں نے دنیا ابھی طرح دیکھ رکھی تھی۔ وہ جانتی تھیں کہ اس دنیا میں کوئی محبت
 نہیں کرتا ہے۔ لوگ محبت سے کہیتے ہیں۔ جیسے باکی سے فٹیل سے کیلا جاتا ہے۔ اس کیل کے
 بھی اصول ہوتے ہیں۔ اور اب ششاد این اصولوں سے انحراف کر رہی تھی۔ ششاد کو بروں میں لگا ہی
 پڑے گا۔ سچی محبت میں لاکھوں کی کمائی کیسے ہو سکتی ہے۔ ہر سال نئی گاڑی کہاں سے آ سکتی ہے عرو
 سے عمدہ خلیٹ کیسے خریدے جاسکتے ہیں۔ آدمی کو محبت نہیں کرنی چاہئے۔ محبت سے کیلا پاپا ہے
 محبت کا کیل بہت عمدہ ہے۔ دل کا روگ بہت بُرا ہے۔ اور ششاد بڑی جذباتی لڑکی تھی۔ عشرت کے
 آنسوؤں نے اُسے رام کر لیا تھا۔ دادی اماں جانتی تھیں۔ مگر ششاد نہیں جانتی تھی۔ کہ عشرت کا کیل
 کیا ہے۔ وہ اپنا کیل کیل رہا تھا۔ دادی اماں ایک ہوشیار کھلاڑی کی طرح اُسے نظروں میں کئی
 تھیں وہ اگر عشرت کی حالت میں ہوتیں تو غالباً یہی کرتیں۔ ان کے ذہن میں عشرت کے لئے تفریق
 کے کوئی پہلو نہ تھی۔ مگر انہوں نے اُن دونوں میں عشرت پر باہل کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اُنہوں
 نے اس سے بات بھی نہیں کی۔ اس کا آداب بھی قبول نہیں کیا۔ بہت بُری بات تھی۔ لڑکا مسین
 تھا۔ خوب بُرا تھا۔ مسلمان تھا۔ اچھے گھر کے لڑکا تھا۔ مگر امیر متا تو دادی اماں کو کوئی اعتراض بھی
 نہ ہوتا۔ مگر ————— !

دادی اماں نے پہلے تو راج کی بلائیں میں۔ پھر رد نے لگیں۔ پھر آنسو پونچھ کر کہنے
 لگیں: یہ ششاد کی طرف اشارہ کر کے، یہ تو سچی ہے۔ اسے کیا معلوم کہ تم دونوں۔ تم دونوں
 سیلیوں کی چھ سال کی دوستی اور بہنا پاکیا ایک مرد نے کے تھے قربان کیا جاسکتا ہے؟
 اسی بات پر مجھے بھی حیرت ہوئی اماں۔ راج دادی اماں کو اپنا ہم خیال پاکے بہت خوش ہوئی

اس کا بوجھ بھی بدل گیا۔ ہماری دوستی پر تو ساری غم انڈسٹری رشک کرتی تھی۔ مکی بہنوں سے بھی زیادہ ہم میں محبت تھی۔ سدا کا ساتھ، اٹھنا بیٹھنا کھانا پینا سب اکٹھا، اور اب یہ بچا ایک... راج نے شخصیات آمیز چھا ہوں سے ششاد کی طرف دیکھا۔

”ششاد کی محبہ ہوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ بولی ”میں کب کہتی ہوں تمہاری یہ سبلی نہیں ہوں۔“
”عشرت کہاں ہے؟ راج نے ششاد سے ٹوٹ کے پوچھا۔

”اندر بیڈروم میں ہے۔“ ششاد نے ذرا گہرا لے کہا۔

”اے رہنے دو۔“ دادی آں نے بڑے میٹھے لہجے میں کہا ”بہدی آپس کی گفتگو میں اُسے رازدار بنانا مجھے ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ جو فیصلہ کریں گے وہ ہم لوگ آپس میں بات چیت کر کے طے کریں گے۔ اُسے چھ میں بولنے کا کیا حق ہے؟“

”بالکل ٹھیک ہے۔“ راج بولی۔

”تو تو اس کے لئے مجھے چھوڑ دے گی۔“ راج نے ششاد سے پوچھا۔

ششاد نے کہا ”یہ میں نے کب کہا ہے۔ میں نے ٹیلی فون پر یہی کہا تھا کہ ایک وین اور ایک مہنتے میں کیا فرق ہے۔ یوں پلک جھپکتے میں گزر جائے گا۔“

”مگر مجھے منظور نہیں ہے۔“ راج ذرا سختی سے بولی۔

”اور مجھے بھی ڈاؤی اماں نے کہا۔“

ششاد نے دھکی جو کہے کہا ”مگر میں زبان دے چکی ہوں۔“

ششاد نے بیڈروم کی طرف اشارہ کیا۔

”اُس سو کو میرے سامنے لاؤ۔“ راج غصے سے صوفے پر سے اُٹھتے ہوئے بولی۔ مگر دادی آں نے ہاتھ پیر کر اُسے واپس بلا لیا۔

”اُس پر غصہ نہ کرو۔ یہ مردوسے ہوتے ہی ایسے ہیں۔ انہیں بہت نمی مٹی رہے۔ یہ بہت خوش رہتے ہیں۔ عشرت کی بات جانے دو راج۔ یہ ہمارے آپس کی بات ہے۔“
 ششاد نے سر ہلایا۔ ”ہاں۔ یہ ہمارے آپس کی بات ہے۔“
 ”تو عشرت کو میرے حوالے کر دو۔ ہیں۔“

”مگر میں وعدہ کر چکی ہوں۔ اور پھر مجھے اس سے محبت بھی ہو گئی ہے۔“ ششاد بولی۔
 ”مگر تم تو جی اسٹوارٹ! —————“ راج نے فقرہ ناتمام رہنے دیا۔
 ”ہاں۔ مگر ————— یہ بھی چلے گا؟“ ششاد آنکھوں میں آنسو لاکے بولی۔

”محبت وغیرہ کچھ نہیں ہوتی اسے۔“ دادی اماں نے راج سے کہا۔ ”میں کسی وقت میری دلچسپی کی ضد آجاتی ہے اسے۔ میں تو اسے خوب جانتی ہوں۔ اچھی طرح سے۔۔۔۔۔ لے اب دونوں سیلیاں گلے لے لے جاؤ۔ مل جاؤ۔“

دادی اماں نے راج اور ششاد دونوں کو پکڑ کر ایک دوسرے کے گلے سے لگا دیا۔

گلے لگتے ہی دونوں سیلیاں خوب پھوٹ پھوٹ کر روئیں۔ ایک دوسرے کے آنسو پونچھنے لگیں۔ ایک دوسرے سے پیار کرنے لگیں۔ روتے روتے ششاد نے کہا ”جائیاں میں نے تیرے ساتھ بڑا دھوکہ کیا، بائے اپنی سیلی کے ساتھ دھوکہ کیا؟“

راج سکتے ہوئے بولی ”تو تو میری جان ہے ششاد۔ میں تو عشرت کے بغیر رہ سکتی ہوں۔ مگر تیرے بغیر نہیں۔“
 ششاد نے ایک سگریٹ سٹکا کے راج کے منہ میں رکھا۔ بولی ”اے جاہ لے جا۔ تو اب عشرت کو لے جا۔“

راج ششاد کی بلائیں لے کے بولی ”نہیں جائیاں۔ تجھے اگر اچھا لگتا ہے۔ تو تو رکھ لے۔ میں کیا اتنی گنتی گری ہوں کہ اپنی سیلی کے لئے خلا ہی قربانی ہو نہ لے سکوں۔“

گھوڑی دیر کے بعد داوی آاں نے عشرت کا سوٹ کیس بند کر کے اسے رنجنکے ہمراہ کر دیا۔ اس سے پہلے ہی وہ راج کو کہہ چکی تھی چپکے سے کہ وہ رنجنکے آنے سے پہلے ہی شمشاد کو اپنے گھر لے جائے تاکہ معاملت میں آسانی رہے۔ چنانچہ جب رنجنہ عشرت کو لے کے گئی۔ اس وقت گھر میں داوی آاں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ عشرت سے نہ راج ٹی۔ نہ شمشاد عشرت کے پاؤں تلے جتنی زمین تھی وہ سب کی سب داوی آاں نے لے کر کھائی تھی۔ اب اب عشرت کو سہارا لینے کی عادت چڑھ چکی تھی۔ اس نے رنجنہ کا ہاتھ پکڑ لیا رنجنہ کا اپنا دوست ستوش کمار چندہ میں رنجنہ کے لئے پرتا گیا ہوا تھا۔ جب اسے داوی آاں نے بتایا کہ عشرت اور راج کی آپس میں چل گئی ہے۔ تو اس نے اس موقع سے فائدہ اٹھانا مناسب سمجھا۔ اور پھر عشرت کس قدر حسین تھا۔ کئی دفعہ پارٹیوں میں رنجنہ نے راج کے ساتھ اسے دکھایا تھا۔ یونانی دیوتا کی طرح مضبوط اور گھٹا ہوا۔ اس نے کبھی رنجنہ کی طرف آنکھ اٹھا کے دیکھا بھی نہ تھا۔

اس لئے اب ————— اب ۹ —————

رنجنہ کے بھائی پراطیناں اور استقام کی منگواہٹ آئی۔ اس نے عشرت کی طرف ہاتھ بڑھا کے کہا کہ آؤ۔ مگر جب وہ عشرت کو لے کے اپنے گھر پہنچی تو اس کی خادمہ نے اسے بتایا۔ کہ اس کے جانے کے بعد پرتا سے ٹرک کال آیا تھا۔ اس کا دوست آج رات کی گاڑی سے واپس آ رہا تھا۔ خادمہ نے ٹیلیفون کا پیغام لے لیا تھا۔

اب رنجنہ کیا کرے۔ پسینہ اس کے ماتھے سے چوٹے نکلا۔ ستوش کمار بڑا ظالم تھا۔ وہ اس سے بہت ڈرتی تھی۔ رنجنہ نے عشرت کو بتایا۔

عشرت نے کہا : ”آگے دو سالے کا سر پھوڑ کے رکھ دوں گا۔“

”نا، نا، بنیاد، رنجنا بڑی بڑول تھی۔ ٹھکے بولی : ”جے کوئی لڑائی جھگڑا نہیں چاہئے جے بہت نفیسی ہے۔ مگر تم اب یہاں نہیں رہ سکتے۔“

عشرت خاموش ہو گیا۔ اب وہ کہاں جائے۔

رنجنے راج کو ٹیلیفون کیا : ”راج : ”رنجنے جھوٹ بولتے ہوئے کہا : ”تہا راجشرت شاید تم سے رنکر گیا آگیا ہے۔ اپنا سوٹ کیس اٹھائے ہوئے۔ مگر میں ڈارنگ اسے اپنے پاس کیے رکھ سکتی ہوں بنتی ہو۔“

”ہاں۔ ہاں سخی ہوں : ”راج جو سارے واسے سے واقف تھی۔ اچھاں میں کے بولی۔

”تو بہنا تم اسے آگے لے جاؤ۔“

”اسی بھی کیا جلدی ہے۔ آج ہی تو ہماری لڑائی ہوئی ہے اسے ہفتہ بھر اپنے پاس رکھو۔ میں آگے لے جاؤں گی، اور تم بھی تو آج کل۔۔۔۔۔۔“

”نہیں نہیں : ”رنجنہ چلا کے بولی : ”وہ آج شام کو آگے والے ہیں۔ بہنا۔ میں باز آئی۔ تم آگے اسے لگی لے جاؤ۔“

اس وقت فریڈا اور راج دونوں راج کے کمرے میں دھنسی ٹپتی تھیں۔ بلکہ نرم واز حالت میں۔

ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے لپٹی تھیں۔ جب یہ ٹیلیفون آیا۔ راج نے بڑی بے دلی سے کہا : ”اسے بھیج دو۔“

”کہاں بھیجوں؟“

”جہاں اُس کا جی چاہے : ”اناکہ کہ راج نے ٹیلی فون رکھ دیا۔ مگر پھر فوراً ہی ٹیلی فون کی گنتی یہ عشرت بول رہا تھا۔

”راج میں آجاؤں : ”عشرت نے بڑی خصل سے کہا۔

”نہیں۔“

”تو پھر میں کہاں جاؤں؟“ عشرت نے بڑی بالہی سے پوچھا۔

”جہنم میں جاؤ۔“

راج نے ٹہلی زون رکھ دیا۔ یہاں تک اُسے محسوس ہوا کہ وہ ایک عرصہ ہوا عشرت سے اگست ہو چکی تھی۔ وہ اُسے فوراً بھی نہ چاہتی تھی۔ اس کے دل میں اور داغ میں محبت تو کیا، ندامت کا ایک مشابہہ تک نہ تھا۔

عشرت نے اپنا سوٹ کھین اُٹھایا۔ ڈرائنگ روم سے باہر رآمدے میں آیا۔ برآمدے سے پورچ میں آیا۔ پورچ سے باہر سڑک پر آیا۔ سڑک سسٹنٹ تھی۔ تاریکی گہری تھی۔ وہ دیر تک چلتا رہا، اتنے اس کے بردگر کوئی فاصلہ نہ تھا۔ کوئی منزل نہ تھی۔ اور جب راتے میں راہ گیروں نے اُسے دیکھا، تو ڈر کے مارے پیچھے ہٹ گئے۔ کیوں کہ آج عشرت کے پاس کوئی چہرہ بھی نہ تھا۔ آج وہ موت کی طرح چلی رہا تھا۔

کتنے ہی مہینے گز گئے۔ اکرم کو کوئی ایسا کام نہ ملا جسے وہ اپنے خیر کو بڑی طرح مجروح نہ کر سکے۔ یہ خیر، یہ منہ اس کے لئے اس قدر تحفیت وہ کیوں ہے۔ بہت سے لوگ بلکہ اکثر و بیشتر لوگ اس کی تعلیم اندیشی میں اس طرح گھومتے تھے جیسے انہوں نے اپنے لئے سالی ٹس کی طرح اپنے خیر کو بھی آپریشن کر دے کے بھکھوایا ہو اور کسی دوسرے طریقے سے ان کا بدن ترو کا چلن اس کی جگہ میں نہیں آسکتا تھا۔ وہ خود بھی کیوں نہیں اپنے خیر کا آپریشن کروا دیتا۔ ایسے تو وہ بھوکا مر جائے گا۔

اور اب تک وہ بھوکا مر گیا ہوتا مگر وہ اپنی بہن کے پاس دہانہ ہوتا۔ رشید بھی طرح اتنی دوپے میں پورے مگر کو چلاتی تھی، اسے بھلاؤقات چہرہ ہوتی تھی۔ یہ سب کچھ ہے کہ اب نفیس اور صیب رشید کے دونوں بڑے لڑکے اخبار بیچنے کا کام کرتے تھے۔ مگر زندگی گویا موت کی مدد کو چمکو کر گزرتی تھی اس کی زندگی کی کسی تیز و مار ہے۔ خدا بھلا تو چکی، قدم بھلا چند ماہ کی عیالیت یا چند ماہ کی بے روزگاری اور آدمی غائب۔

پرل میں آج دیوالی کی بھارتی۔ قہوں کی عجیبی نظر آسان پر سب بڑوں کی اڑتی ہوئی ڈیڑا لادوں کی بھارتی اچلتے کودتے، پٹانے چھوڑتے ہوئے بچوں کی چیر و پھارتا بی دید تھی۔ اسے دیوالی بہت پسند

نہی مگر آج تو ایک سو مچی خریدنے کے لئے اس کی جیب میں پیسے نہ تھے۔ نفیس ایک عرصے سے بیمار تھا۔ کسانہی اور بیمار ہو جاتے ہی نہ تھے۔ ڈاکٹر نے بہت سے انجکشن اور دوائیاں تجویز کی تھیں، اور شدید کئی دواؤں سے اکرم بے کمر ہو چکی تھی۔ کبھی ایک فترے سے، ایک ٹنڈے سے، ایک طاعت۔ کیوں کہ وہ بہت کم برہنہ تھی، لڑکھرائے جہان سے نہ کہہ سکتی تھی۔ اسے زندگی سے لڑا تو خوب آتا تھا مگر وہ اپنے جہان سے ایس طرح نہ لڑ سکتی تھی۔ نفیس کو بہت تیز بخار تھا، اور وہ بخار میں دوا ہی تباہی یک رہا تھا۔ ڈاکٹر کا پیلا بلی پاس روپے کا ہو گیا تھا۔ اس نے رشیدہ کی ہمت نہ پڑی تھی کہ ڈاکٹر کو بلائے، اور پھر دوا دیاں اور انجکشن اس نے بلکہ کر دئے تھے وہ کہاں سے لائے گی۔ لیکن بے ڈاکٹر صاحب خود کسی طرح سے آیا تھا مگر غرض ڈاکٹر کے آہانے سے قراں کا لالہ اچھا نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے دوا بھی تو پڑا ہے۔ اکرم بھی خوب بہتا تھا۔ مگر بے میں تھا۔ اتنے روزوں تک وہ کوشش کرتا رہا مگر کہیں سے اسے کام نہ ملا۔ نہ کوئی رقم اور جاری ملی۔ آج دیوالی کے روز سینہ باخڑا نے اندازہ غایت اسے کہہ کر رقم دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اور اسے یہ بھی کہا تھا کہ وہ بہت جلد کوئی اس کے ڈمگ کی تصویر شروع کرنے والے ہیں، اکرم کو بھی ڈانٹ کر رکھے گا۔

اکرم بہت خوش ہوا تھا۔ سینہ باخڑا نے دیوالی کی خوشی میں سارے شات کو بوس بانا تھا اور شام کے وقت چند خاص خاص لوگوں کو اپنے آفس میں دھکی پینے کے لئے بلایا تھا۔ اکرم بھی انہیں خوش قسمت لوگوں میں سے تھا۔ سینہ باخڑا اپنا پراہنگ تھا۔ سینہ بگت لال، چمک لڑے، خوشی جی۔ میڈم باج، شملہ، سینہ کٹر چند، بھی رت، اور باہنٹاس اسٹر۔

وزنگ دھکی چلی رہی۔ وزنگ ساتھ چلی رہی۔ وزنگ جس سماجوں ہی سماجوں میں اڑتی رہی، ایک بیہوشی ہوئی تھی کہ طرح وہ اس دُخلد سے اُس رفیق اور اس جام ہے اُس جامہ و اسس آسم سے اُس آئینہ آئینہ ہی۔ اکرم ہار پیارا۔ ضرورت سے زیادہ پیارا۔ چھینے سے زیادہ پیکارا۔ مگر وہ بے نہیں انہی کا اندہ بکارتا۔ اس کے گھٹن میں ایک منہ تھا۔ ایک ساحل تھا۔ ساحل پر نکلے ہم تھے

کسی نے دائیں رکہ دی۔ دائیں کے تاروں سے ٹرنسپس سوسکے نوٹ بھٹتے تھے اور ای جوں پر پکے جاتے تھے
 خٹے کو وہ جسمان نوٹوں سے باہر چپ گئے۔ پھر وہ نوٹ لوہا خٹے اٹھتے ایک نیز بن گئے۔ نیز کے اوپر چڑھا تو
 ہشس کیلئے لگے۔ تاش میں کوئی ٹچم، ابوشاہ، یکہ نہ تھا۔ ہر تاش کے پتے پر عجیب سے لوگوں کی تصویریں تھیں۔
 کوئی پہاڑ اچلا رہا تھا۔ کوئی سڑک کھٹ رہا تھا۔ کوئی کپڑا نہیں رہا تھا۔ کوئی انجن چل رہا تھا۔ کوئی کپڑے سی رہا تھا۔
 کوئی سیٹ بنا رہا تھا۔ کوئی پہول آکا رہا تھا۔ کسی کے ہاتھوں میں ہتھکڑی تھی۔ کسی کی آنکھیں غائب تھیں۔ کوئی
 ہسپتال میں پڑا بیسٹا رہا تھا۔ کوئی مرگٹ کر جا رہا تھا۔

مگر جو کیلئے والے ہاتھ تھوڑے خوبصورت، مخروطی اور حنائی پدیں تھے ہوئے تھے۔ کسی
 کی انجی میں دوڑے سونے کی مروانی انگوٹھی میں نعل کمال شہر تھا۔ کسی کی سلائی میں سونے کی زنجیر تھی یا یہ
 کھنگن تھا۔ کسی کی ٹیبلٹیا میں ہیروں سے جڑی ہوئی انگوٹھی تھی جس کے درمیان میں ایک گڑی لگی ہوئی تھی۔
 وہ ہاتھ تاش کو اٹھاتے۔ زور سے نیز پر دیکھتے

کٹ !

ٹوہ !

چلو۔

پتے اور مرے اُدھر پہنچے جاتے اور کوئی ہسپتال چلا جاتا۔ کوئی پام خانے۔ کوئی مرگٹ کو
 کوئی کارخانے کو، اور کوئی ڈاک خانے کو۔ کوئی پتہ سڑک پر کھڑا ہو کے بیک مانگے لگتا۔ کچھ کسی کوئی فوجی
 انگوٹھیوں سے مزین ہاتھات، ٹاکرا ایک طرف ڈال دیتا، اور برنس کر اپنے ساتھی۔ کتنا میرے پاس ایک
 ہو کر آگیا ہے۔

بکرم نے بیت پئی تھی اس نے پیاسہ دیا۔ اپنی "نکس پیکائیں" جب اسے ہوش آیا تو اس نے دجیا
 کو وہ نیز کے دفتر میں لکھا ہے۔ اس کے سامنے جوشی جی کا سسٹنٹ بننا چاہو جیسا ہوا اس کی طرف تک

اپنی بہن کے گھر جا رہا ہے۔ آج وہ ہر کیلکے کا اے۔ کیا کچے کا اے۔ کیا کچے کا اے۔ . . .

گر رشید بہت کچھ جانتی تھی۔ نہ صرف اپنے بھائی کو بلکہ اپنے بھائی کے بڑے گرو کی زندگی کو۔ اسے انا کچھ معلوم تھا۔ جب ہی وہ خاموش رہتی تھی۔ بہت سے لوگ بہت سی باتیں کرتے ہیں اور کچھ نہیں جانتے۔ بہت سے لوگ کچھ نہیں کہتے اور سب کچھ جانتے ہیں۔ ان کی خاموشی حماقت نہیں ہوتی ہے۔ اس نے جب اپنے بھائی کو اس طرح لاکھڑاتے ہوئے زمین سے جڑ کے آتے ہوئے دیکھا اس نے جب اُس کے سوتے ہوئے چہرے اور اس چہرے پر شستی ہوئی آنکھوں کو دیکھا تو وہ خاموش رہ گئی۔

اکرم نفیس کے سرانے آکے فرش پر بیٹھ گیا۔ نفیس کپڑا لٹھ سے اور سر پہ نہ دھانچے بیٹھا تھا۔ اکرم نے اپنے بالوں میں اٹھلیاں پھیر کے بڑی تلی سے کہا: "بیٹو نے مجھے اتنی دھکی چلائی کہ اس سے بچنے کے لئے ماری دوائیں اور سانے ابکاشی آسکتے تھے۔ مگر اس نے مجھے دھکی چلائی اور پے نہیں دئے۔ رشید میں کیا کروں؟"

رشید نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے نفیس کے سر پر سے کپڑا ہٹا لیا۔ نفیس مردہ پڑا تھا۔

اکرم نفیس کی طرف دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا۔ اور اس کے دل میں صرف یہ خیال آیا کہ اگر وہ رشید کے سر پر بار نہ ہوتا۔ اگر وہ خود کھانا ہوتا تو آج نفیس نہ مرنے لگا۔ وہ رقم جو اس کے کمانے پہنچے اور روز ترقی کی ٹرام کے کمانے پر خرچ ہوتی تھی وہ رقم نفیس کی بیماری پر رشید خرچ کر سکتی تھی۔ تو کبھی رشید نے ایک نظر ان سے نہیں سجا۔ ایک مرد پر۔ ایک اٹھتی۔ ایک چوٹی۔ ایک دھاتی کرکر کے رشید نے نفیس کی ساری زندگی اکرم پر خرچ کر دی۔ ہر لمحہ اس نے نفیس کو جاتے ہوئے دیکھا۔ اور ایک دفعہ ہی اس نے

اکرم کو اس گھر میں آنے ہونے نہیں دیا۔ کسی یا کسی کی بیہوشی؟ اگر کم سہارا بن سہے پائے تک
 پہنچ چکی ہیں اس کا بھائی تھا؟ اگر کسی طرف سے وہ اس گھر سے چلا گیا ہوتا۔ اگر اس نے کھانا نکالا یا ہوتا
 ظام اور پانی۔ کڑاؤ نہ پیا ہوتا، تو آج نفیس زندہ ہوتا۔ کبھی کبھی قور شدیدہ کے سامنے باہل واضح طور پر یہ
 کیفیت آتی ہوگی۔ یہ تباہی کیفیت یعنی ایک طرف اکرم ہے۔ دوسری طرف نفیس ہے۔
 ہائے جلاواں ! ہائے جلاوہائی۔ ہائے جلاوہ زندگی ! تم دونوں کو زندہ کیوں نہ رکھ سکیں؟ یہ کیسی
 زندگی ہے۔ خوراک۔ کڑاؤ۔ بجلی۔ پانی۔ چیزوں سے چیزوں سے چیزوں کی طرف واپس آ جانا
 اور بچ میں انسان کو غائب کر دینا۔ ایسے جیسے وہ کبھی نہ رہا ہی نہیں۔ اس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا جیسے جیسے
 اس کے لئے نہیں تھیں۔ وہ چیزوں کے لئے تھا۔

یہ ایک اکرم کی زبان پر تک سناؤ آئے۔ ہاں۔ یہ ایک آسمان تھا جو اس کے رخسار سے بہ کر
 اس کے بوڑھوں کی راہ سے زبان پر آ گیا تھا۔ مگر کس قدر تلخ اور تنگین ! اکرم نے سختی سے اسے جھٹک دیا
 نفیس کے سر پر چادر اڑھا دی اور خود باگنی میں جاکے کھڑا ہو گیا۔

دوسرے دن جب وہ اور رشیدہ صیب اور میل۔ نفیس کو دفن کر کے لوٹے تو اکرم نے اپنا
 سوٹ کیس بند کیا اور اپنا بستر باندھنے لگا۔ اس کی بین خاموشی سے کھڑی دیکھتی رہی۔ بستر باندھ کر اکرم نے
 ہاتھ میں سوٹ کیس اٹھایا۔ بستر باندھ کر پڑا لیا۔

اس کی بھی نے اسے روکا نہیں۔ وہ اس کے ساتھ دروازے تک گئی۔ دونوں خاموش تھے۔
 میرا بھائی جا رہا ہے۔ کل میرا بیٹا گیا۔ آج میرا بھائی جا رہا ہے۔ میں اسے روک نہ سکی۔ میں اسے
 بھی روک نہ سکیں گی۔ روکنے کے لئے بھی انسان کے پاس کچھ چاہیئے۔ رشیدہ نے سوچا۔ تمہارے پاس
 اگر کچھ ہے تو بھائی بھی کچھ ہے۔ وہ ایک خوب صورت بندہ ہے۔ ایک پایاؤنشہ ہے۔ اور اگر کچھ نہ ہو تو بھائی
 ایک بہت بُری عادت ہے۔

اکرم نے سوچا۔ کچھ ہر تو بہن ایک بھول ہے۔ نہ ہر تو ایک آنسو ہے۔

دونوں بھائی بہن خاموشی سے دروازے تک گئے۔ جب اکرم دروازے سے باہر نکلے گا تو رشیدہ نے اسے روک کر اس کے ہاتھ پر ایک روپیہ رکھ دیا۔ اور جلدی سے اندر آ کے دروازہ بند کر لیا۔ اکرم نے بہت کوشش کی کہ وہ اپنے آنسو روک سکے، مگر نہ روک سکا۔ وہ وہیں بند دروازے کے باہر کھٹکھٹ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ دروازے کے ادھر اکرم رو رہا تھا۔ دروازے کے ادھر رشیدہ رو رہی تھی۔ دونوں کے بیچ میں زندگی سفید کنن کی طرح کھڑی تھی۔

ہارون بی روڈ کے مرکزی ایپلائمنٹ پیچنگ کے باہر چنے والے کے پاس اپنا سوٹ کیس اور سترنگ کر
 کرم دفتر میں داخل ہوا۔ اب اس نے اپنے دل میں طے کر لیا تھا کہ وہ فلم کا کام نہیں کرے گا بلکہ کوئی دوسری
 نوکری اختیار کرے گا۔ کوئی چھوٹی موٹی نوکری تو بکالت سے مل جائے گی وہ اُسے کر لے گا۔ یہی سوچ کر وہ ایپلائمنٹ
 پیچنگ میں عرضی گزارنے آیا تھا۔ یہاں ایک کلرک اس کا پہلے سے واقف تھا۔ اس نے کام آسانی سے ہو گیا وہ
 جانے کتنے دن گئے ایک عرضی گزارنے میں۔ کلرک سے دفتر کے بڑے باپ سے ملا کے کہیں میں چلا گیا بڑا باپ
 ان لوگوں میں سے تھا جنہیں اپنی اہمیت کا احساس ضرورت سے زیادہ ہو گیا ہے اور جس سے حکومت کے سیکرٹریٹ کے
 سیکرٹریٹ بھرے پڑے ہوتے ہیں۔

بڑے بڑے اپنے گھنے سر پر ہاتھ پیرا۔ اپنی بوتل کی سی گونجیوں کو سنو لایا۔ اپنی منیہ قیس کی سیاہ
 بڑوٹیک کیا اور کھانسی کڑکڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "بیٹھ جائے" بڑے باپ کے لیے سے صاف
 ظاہر ہوتا تھا کہ انہیں اس نے بلایا ہے کہ تم میرے اسسٹنٹ کے واقف کار ہو۔ وہ... بڑے بڑے
 دو چار غلام کھائے۔ دو ایک پکپ اٹے پیے کئے۔ ہمدردی سے اظہار کر دینے کی سی آواز میں کہا "آپ

”میرا مطلب ہے، وہ کوئی ایسا کام نہیں ہے جس سے ساج کو فائدہ پہنچتا ہو۔ جیسے بڑھائی ہے،
 یکنگ ہے، سندس ہے، کرک ہے، انجیر ہے۔“
 ”میں بھی ایک انجیر ہوں مدحوں کا، ایک سندس ہوں اخلاق کا، ایک یکنگ ہوں ساج کا۔
 ایک بڑھئی ہوں تخلیق کا۔“

بڑے باور نے سزلا کے اس طرح کہا جیسے کسی دیوانے سے ان کا واسطہ پڑا ہو۔ مشترکاً باگرم
 برے سنسٹ کی معرفت نہ آئے ہوتے تو میں تمہیں ابھی کھڑے کھڑے علو دیتا، تم خواہ کرنا میرا دوست
 خاتم کر رہے ہو۔ میں کہہ چکا ہوں، نہا سے ہاں شاعر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں اگر تم اس کے
 علاوہ کوئی ڈھنگ کا کام چاہتے ہو تو بولو۔ میں بھی تمہاری عرضی داخل کرنے کو تیار ہوں۔“
 باگرم نے میز پر ٹنگار کے کہا ”میں شاعر ہوں۔ میں بطور شاعر اور ادیب کے اس ملک سے اپنی
 مددی طلب کرتا ہوں۔“

”تو بڑے طلب کرتے رہو۔ میں تمہاری ضرورت نہیں ہے۔“
 ”اگر ضرورت نہیں ہے تو سہی اس کا نام کیوں پتے ہو؟ لیکن غالب کی تحفیں کیوں چاہتے ہو؟
 ٹیکسٹ اور پیم چند کا نام فرمے کیوں پتے ہو؟ لٹائے اندر کر کے سامنے سرکوں جھکاتے ہو۔ تم بچے
 بتاؤ۔ یہ تمہارا ساج کیا ہے؟ یعنی جب تک غالب زندہ رہا، تم نے اُسے سمجھا ملا جیل میں سٹرا لیگیں جب
 وہ مر گیا، اُس کے بعد تم نے اس کی تصویر اٹھا کے ڈاک کے ٹکٹوں پر چھاپ دی۔ اگر تمہیں اس کی ضرورت نہیں
 تھی۔ مگر اس بے کوئی مفید کام نہیں کیا تھا تو کیوں چھاپا؟ جواب دو۔“
 بڑا باگرم سے آنکھ کھڑا ہوا۔ اُس نے تندہ سے گھنٹی بجائی کہ ایک کے بجائے دو تین چہرے اسی اور
 وہ ایک کلرک اندر دھڑے دھڑے آئے۔

ٹہسے باہر نے باگرم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”اے باگرم! دو“ پھر اس نے باگرم

سے کہا۔ اے مہر-تم پاگل خانے میں جا کر اپنے داغ کا علاج کراؤ۔ پھر یہاں آنا تمہاری مرضی نے من کر لیا۔ جب وہ دفتر سے باہر نکلا، بلکہ جب اُسے نکال دیا گیا، تو اکرم کو احساس ہوا کہ اس نے کسی غلطی کی تھی۔ وہ گیا تھا کام کی تلاش میں، خواہ مخواہ بڑے بابو سے اجازت لے کر اکرم نے سوچا۔ یہ نکتہ ہے جسے کے لئے دور کرنے کے لئے۔ یہ شاعروں اور ادیبوں والی بات۔ آخر ہم لوگ کہاں جائیں۔

اکرم نے ابو حزام کو دیکھا۔ اُسے وہ چنے والا کہیں نظر نہ آیا جس کے پاس وہ اپنا سوٹ کیس اور بستر رکھا گیا تھا۔ اُس نے ابو حزام کو نظر ڈالی، بڑی مشکل کے بعد اُسے چنے والا دو پولیس کے آفیسروں میں بگڑا ہوا سر پرچے کی فوٹری اور ہاتھ میں سوٹ کیس اور کندھے پر بستر اٹھاتے جاتا ہوا دکھائی دیا۔ اکرم بھاگ کر اس کی جانب گیا اور مڑ پر اسے پکڑ لیا۔

چنے والے نے اکرم کو دیکھ کر بڑے اطمینان کا سانس لیا۔ بولا۔ ”یہ پولیس والے مجھے چھری کے الزام میں پکڑ کر لے جا رہے تھے۔ میں نے لاکھ کہا، آپ اندھ گئے ہیں دفتر میں۔ مگر یہ انے نہیں۔ بولے چلو تمہانے اب میں تمہانے جا رہا تھا۔ جگہوں کی کرپا سے تم آگئے۔ لو سننا لا اپنا سوٹ کیس اور بستر اور اب ۲۴ بج رہا ہوں۔ آگے کسی کی مدد نہیں کروں گا۔ بیٹائی کا زمانہ نہیں ہے بابو۔“

اکرم نے اپنا سوٹ کیس اور بستر سنبھالا اور دھڑکی طوفان برپا کیا۔ آج رات تک اسے رہنے کے لئے کہیں نہ کہیں جگہ ڈھونڈنا پڑے گی۔

شام کے پانچ بجے وہ لال باغ میں تھا۔ لال باغ سے وہ غیر راہروی طوعہ پر پرہیز کی طرف روانہ ہوا۔ پرہیز پہنچ کر اس نے فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر سامنے کی بلڈنگ کی طرف دیکھا جس کے ایک کمرے میں اُس کی بڑی بہن رہتی تھی۔ اس کے دل میں بڑی شقت سے یہ خیال ابھرا۔ کیوں نہ وہ واپس چلا جائے اپنی بڑی بہن کے پاس۔ پھر اسی شقت اور سختی سے اس نے اس خیال کو اپنے دل میں دبا دیا۔ نہیں وہ واپس نہیں چلا سکا۔ اب وہ آگے جائے گا۔ کہیں پر خود اپنے لئے جگہ تلاش کرے گا۔ وہ اپنی بہن کی غریب

ہنگن سے کہہ دے کہ بخش کے گنہگار و مہر و عزائم ہو پرانی دھرم شلہ کے باہر بگد کے پڑ کے نیچے سوجی گاتے
میں اُن کی جلا کے دو بال بچکے۔“

”اے کے ۲؟“ اکرم نے دل چسپی سے پوچھا۔

”تم کو دنا، نہیں کیا؟“ دھوہن نے پراسرار طریقے سے بولی۔

”میرا بیٹا بھیروی سیدہ کر رہا ہے۔“

”اے کے ۱؟“

دھوہن نے ادا و مرد و کیا۔ پھر وہ پاس کے پڑ کے نیچے اکرم کے بائیں قریب بیٹھ گئی اور بولی
”کئی کو بتانا است۔ میرا بیٹا بھیروی کو بقتہ کرے گا تو اس پاس کی سب لاندہ یوں کے پڑے اس کے
پاس دھوہنے کو آویں گے۔“

”ہوں۔“ اکرم نے کہا۔

”ہوں!“ دھوہن نے سر ہٹ کے کہا۔ ”بس بابا دھرم و عزائم کی جلا کے دباں ہل جاویں تو سب

ٹیک ہر جاوے گا۔“

”مگر“ اکرم نے کہا۔ ”اس خط میں تو اب کھنے کے لئے کوئی بکری باقی نہیں رہی۔“ اکرم نے خط

اٹھ پٹ کے دونوں طرف سے دکھایا۔

”یہاں کون نہیں کھو دیتے؟“ دھوہن نے ایک خالی جگہ پر اشارہ کیا۔

”یہ پتہ کھنے کی جگہ ہے؟“ اکرم بولا۔

دھوہن بڑی مایوس ہوئی۔ بولی ”نئے آئے معلوم ہوئے ہر حدہ تم سے پہلے اس بائیں کے

پڑ کے نیچے جو خط کھنے والا بیٹا تھا اُسے تو میں جو پہلے اور بتانا چاہے ہوں وہاں سب کھو دیتا تھا۔

تم بہت کھلا کھلا کھتے ہو۔“

اکرم نے کہا "آئندہ احتیاط کروں گا"

دوبارہ نے اسے اپنی دھرتی کے فلوے ایک آنہ محال کے اُسے دیا۔ اپنی "میسے حساب سے دو پیسے ہونے تھے مگر تم اپنے دس کے مسلم ہوتے ہو اس نے دیا آگئی۔ رام رام"۔
 "رام رام" اکرم نے جواب دیا۔

اکرم نے اپنی کئی طرف دیکھا مگر اس نے ٹاک خانے کے باہر لوہے کا جھگڑا تھا جس کے نیچے دیوار سے لگے ہوئے بانگ کے بیڑوں کی ٹالیاں لوہے کے جھگڑے پر لٹائے ہوئے تھیں۔ جھگڑے کے باہر دیوار پر سائے کے نیچے ایک ٹائپسٹ اپنے سر کے اوپر چھتری کو لے بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے سامنے ایک ٹول پر ٹائپ رائٹر رکھا ہوا تھا۔ ٹول پر اوپر بھی دوسرے کاغذ تھے۔ پوسٹ کارڈ۔ مٹی آنڈر نام۔ درجہ بڑی کے نام پارسل کے نام اور اسی طرح کا ٹاک خانے سے مطلق سامان۔ اکثر و بیشتر ٹاک خانے میں آنے والے لوگ آن پڑے ہوتے تھے۔ اس نے ٹاک خانے کے باہر ہی قسم کے لوگوں کی آمد و رفت دیکھی تھی۔ اس نے ان لوگوں کا رخ اندھا چھا پٹا تھا۔

ٹاک خانہ بند ہونے والا تھا۔ ٹائپسٹ کے پاس اس وقت کوئی کام بھی نہ تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر باس کے بیڑے کے نیچے آیا۔ اکرم کی طرف خود سے دیکھ کر بولا "تم اپنے موٹے پر گئے؟"
 "کیا مطلب؟" اکرم نے چونک کر کہا۔

"زیادہ ہوشیار بنو" ٹائپسٹ نے کہا "میرا تھلا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ میں ٹائپسٹ ہوں۔ تم خطا کھنے والے ہو۔ مگر یہ بتاؤ تمہیں پتہ کیسے چاکر رام بھروسے مر گیا اسباب اس کی جگہ خالی ہے؟"
 "رام بھروسے؟ جگہ خالی؟ میں سمجھتا ہوں" اکرم نے بڑے غلصے سے پوچھا۔

ٹائپسٹ نے مذاکرات اکرم کی آنکھوں میں دیکھا۔ پھر اُسے تعین ہو گیا کہ اکرم رام بھروسے کو بائیں نہیں جانتا ہے۔ براہِ نمونہ خلی ہوئی۔ میں نے سمجھا تھا کہ کسی نے یہاں بھیجا ہے۔ بات یہ ہے کہ اس بائیں کے

پڑ کے بچے رام بھروسے بیٹھا تھا۔ وہ کہتی مر گیا۔

”کیا ہوائے اکرم نے پوچھا

”ناقہ سے مر گیا۔ اکیلا ہوتا تو ناقہ سے کہی نہ مڑتا۔ یہاں خط لکھے گا جو کام ہے اس

میں آپ ایک بڑے کنبے کا فرخ نہیں چلا سکتے۔ ایک دوہوں تو رام چل جاتا ہے۔ رام بھروسے کی بیٹی

تھی۔ سات بچے تھے۔ ناقہ سے تو مڑنا ہی تھا اے۔ غلوہا نوئیس اتنے پیسے کہاں سے کما سکتا ہے

تم اکیلے ہونا؟“

”ہاں!“

”کہاں ٹھہرے ہو؟“

”ٹھہرنے والا بھی کوئی ٹھکانہ نہیں۔“

”تو پلہ میرے ساتھ باقی کھڑے ہیں۔“

”کہاں؟“

”وہاں جھونپڑیاں ہیں۔ ہم لوگ دس بارہ آدمی ہیں۔ تین جھونپڑیوں میں رہتے ہیں۔ سب

ہم کے فرخ چلاتے ہیں۔ مڑے میں رہتے ہیں۔ تھالا نام کیا ہے؟“

”اکرم“

”مسلمان ہو؟“

”ہاں۔“

”کوئی بات نہیں۔ میرا نام جسونت ہے۔“ تاہم بٹلے ہاتھ دھو کر اپنے اتر آگے بڑھایا۔

اکرم نے مصافحہ کیا۔

جسونت نے کہا: میں گجراتی ہوں۔ مگر ہماری جھونپڑیوں میں ہندو، مسلمان، سیک، پشوان

یہ ساری فضا بلور تاریکی، سیلین، گمشدہ خود بخود فنا ہو جائے گی۔ ایک وفد پولیس نے کوشش بھی کی تھی۔
 دو ایک بار یہ آٹے خود بھی مل گئے تھے۔ مسلسل برساتوں میں مڑتی ہوئی پرانی کھڑی کو خود بخود آگ
 لگ گئی تھی۔ اور صوبہ نپالوں میں جب آگ لگ جائے تو کچھ نہیں بچتا۔ جتنے پٹے پڑنے بستر اور چیمبرے
 کھڑی کے صندوق ہوتے ہیں وہ جل جاتے ہیں۔ نیم کے درخت بھی محفوظ نہیں رہتے۔ لوگ کہتے ہیں
 کہ فرش کی مٹی اللہ زمین کی چست تک جل جاتی ہے۔ کچھ نہیں بچتا۔ اللہ کوئی کچھ اپنی جان بچانے کے سوا
 کچھ بچانے کی کوشش بھی نہیں کرتا۔ کیوں کہ کسی کے پاس ہوتا ہی کیا ہے جو بچایا جائے۔ لہذا تو ایسے
 موقعوں پہنا کر ریگڑا نہیں نہ تو بلایا جاتا ہے۔ نہ خود آتا ہے۔ اگر آبی جائے تو اسے اس پاس کی بچی
 مارتوں کو محفوظ کرنے کا کام میں لگا دیا جاتا ہے۔ ٹھیک بھی ہے۔ مناسب بھی ہے۔ رواج بھی ہے۔
 دستور بھی ہے۔ مگر ایک بات جو ان بتیوں کے جتنے بھر میں نہیں آتی وہ یہ کہ اگر فرش کریچے باقی کلا
 کی مٹی جلادی جائے تو دو تین دنوں میں یہ مٹی یہاں سے ہٹ کر لٹاکا کے قریب نمودار ہو جائے گی۔
 لٹاکا سے جلادیجئے تو یہ پلٹ کر کلابے میں نمودار ہو جائے گی۔ وہاں سے جلادیجئے تو اہم میں غلغلہ
 آ جائے گی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ مٹی شہر نہ ہوا ایک بہت بڑا جسم ہو جس میں جگہ جگہ پوٹے پنیاں
 دکھائی دیتے ہیں۔ آپ ایک جگہ کے پوٹے کو دوا لگا کر جلادیجئے پھر پوٹا کسی دوسری جگہ نمودار ہو جائے
 گا۔ وہاں سے جلادیجئے کسی تیسری جگہ سے رہنے لگے گا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قصور پوٹے کا نہیں
 ہے، اندھا کا خون خراب ہے۔ اللہ جب تک اندھا کا خون صاف نہیں ہوگا، گے شرے پوٹے یہ ساری
 میلی پنیاں اٹھتی رہیں گی۔

اکرم جب مٹی میں داخل ہوا تو اسے یہ سب باتیں ایک دم دھیان میں نہیں آتی تھیں۔ یہ
 تو وہاں مسلسل رہنے سے آہستہ آہستہ اس کے دماغ میں گھس گھس گئیں۔ لیکن تاریکی اللہ گمشدہ کے احساس کے
 ساتھ ساتھ سب سے بڑی بات جو اس نے اس وقت ملاحظہ کی وہ اس کی ناک کی تیز حس تھی۔ اسے

بڑی حیرت ہوئی کہ اس بستی میں بد بوؤں کا ایسا مختلف انواع و اقسام کا جو اس سرسے سے اُس سرسے تک گندگی کی قوس و قزح کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ اُس نے اپنی پوری زندگی میں اتنی بد بوئیں کبھی نہ سونگی تھیں۔ اپنی حس پر اس طرح اس کا جذبہ بدرجہ مضاعف بھی نہ کیا تھا۔ دیواروں اور چھتوں پر کیڑوں کی طرح رینگتی ہوئی یہ بد بوئیں اس قدر صحیح ثابت ہوئی تھیں کہ وہی مسلسل اور متواتر ہوتی تھیں کہ گوارہ انہیں اپنے ہاتھ سے چھو سکتا تھا۔

اُس وقت جھنڈا سا چورہا تھا جب جسوت اکرم کو لئے بستی میں داخل ہوا سب سے پہلے جسوت پرے کے باہر ایک کھاٹ پر شہباز خاں چٹان جو متحدہ پردہ پہے کا لائن دین کرنا تھا بیٹھا ہوا تھیں پھر سب سے آخر اس نے جسوت کو سلام علیکم کہا اور پھر ایک گہری جھلک کر پڑا ہوا چھتی تھا۔ جسوت اکرم کو لئے آگے چلا گیا۔ جہاں ایک نیم کے پٹر کے ارد گرد مٹی کے ایک اونچے چبوترے پر بہت سی ڈھنڈی صندلیاں رکھائی گئی تھیں۔ نیم کے پٹے سے ایک لائٹنگ ٹی تھی۔ چبوترے پر بیٹھے ہوئے لوگوں نے جسوت کو ایک ادنیٰ کساتہ آتے ہوئے دیکھ لیا۔ اور اس نے خاموش ہو گئے۔ اور جب جسوت چبوترے پر آ کے اکرم کے ساتھ بیٹھ گیا تب بھی وہ خاموش رہے اور خاموشی سے اجنبی کو گھورتے رہے۔

میں بیت سنگھ کیسے ڈھانچہ شہباز خاں چٹان کے بعد سب میں سے تیز انداز سے نکلا اٹھا۔ اس وقت اس نے پچھڑی آٹار کے اندر جسوت پرے میں رکھ دی تھی۔ ٹوڑا اچھی طرح سے بانو کے سر کے اوپر لٹکا تھا اور گلے میں ایک پٹی سی بیاٹھ اور کپتا پہنے ہوئے اپنے مائے اور دھندلے رنگ میں بڑا بھیاگ دکھائی دے رہا تھا۔ اُس نے اپنی سرخسوں پٹاؤں دیتے ہوئے جسوت سے پوچھا: "یہ کون ہے؟ یہاں کیوں آیا ہے؟"

جسوت نے کہا: "یہ اکرم ہے۔ یہاں رہنے کے لئے آیا ہے۔"

"کیا کرتا ہے یہ؟ پولیس میں تو نوکری نہیں ہے؟ ہم پہلے ہی پولیس والوں کے ہاتھوں سے بہت

وہ ہیں۔ "فضل رام ہر دینے یا نہ دینے کی ٹھانڈ تھا؟"

جسوت نے کہا "نہیں۔ یہ بے چارہ تو دلورڈاک خانے کے باہر غلط گھستا ہے۔"

"تو ٹھیک ہے۔" ایک بڑھیا جس نے اپنی منجی ہوئی آواز میں چلائی "اس بچی میں ایک اللہ پڑے گا۔ آری کی ضرورت بھی تھی؟"

یہ لہڑھی صورت بننا تھی۔ اپنے زمانے میں ایک شہر طوائف تھی۔ اب گوشہ نشینی اختیار کر کے اس بستی میں زندگی کے آخری دن پورے کر رہی تھی۔ اس کی جھوپڑی، جیسا کہ گرم کوہد میں مسلم ہوا بستی میں سب سے عمدہ تھی۔ فرش سینٹ کا تھا اور ساری بستی میں ہی ایک جھوپڑی کا فرش سینٹ کا تھا۔ مگر جب لے کر جس تھی اور لوگوں کا خیال تھا کہ اس نے اپنی جھوپڑی میں اپنے اچھے وقتوں کا دوسرا حصہ لکھا ہے۔ اس نے فرش پر سینٹ کر رکھا ہے۔ تاکہ کوئی فرش آسانی سے کھود نہ سکے۔

"اس کی ضمانت کون دے گا؟" پتہ قدمو سے کہا جو ملاحظہ تھا کہ قریب کی جہاں میں کام کرنا تھا۔

جسوت بولا "میں دیتا ہوں۔ ابھی تو اس کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ تم میرے حساب میں گھوڑا آج شام سے تو اس نے کام شروع کیا ہے۔ دس باہر اند میں سے دے گا۔ ابی میرے حساب میں گھوڑا" ایک موٹی بھاری گرتی ہوئی آواز نے بند بانگ پر میں پتہ کے کہا۔ اور سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔ جو مرے آواز آئی تھی۔ اکرم بھی اُدھر دیکھنے لگا۔ ایک نوا آوی چوٹ سے اونچا تھا ہوا۔ بڑے بڑے ٹھنڈے ٹھنڈے سیاہ بال اسے پر جب کائے ہوئے کمر تک نکلا۔ کمر سے نیچے ایک دم حوتی پنپے ہوئے۔ ہاتھیں پانی کی باقی نے اس کے قریب کھڑا اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا۔

"اے تم ستیہ ملے؟" اکرم اپنی جگہ سے اٹھا۔

ستیہ ملے نے اُسے گلے سے لگایا۔ اللہ پانی کی باقی زمین پر رکھ کر اس طرف غائب ہوا

جیسے اُس کے سامنے بستی کے دو چار آدمی نہ ہوں۔ دس بارہ ہزار کا مجمع ہو۔ ” دوستو! یہ سارا عرصہ کئی ہے۔ ہندوستان کا سب سے بڑا سارا عرصہ۔ ہندوستان کا سب سے بڑا کوی ہے۔ یہ غم ڈانڈ کڑی ہے۔ آں کیا بکھے؟ ہندوستان کا سب سے بڑا غم ڈانڈ کڑی ہے۔ سب سے چٹا۔ سب سے عمو۔ سب سے نیک۔ سب سے پیارا۔ غریبوں کی مدد کرنے والا۔ غریبوں کی بچی، صحیح زندگی دکھانے والا غم ڈانڈ کڑی آپ کے درمیان کھڑا ہے۔ دوستو! شرم کا مقام ہے۔ ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ یہ دلش۔ یہ ہمارا راجہ رام موہن دئے اور سوامی بدھ بھاندکار لیش۔ ہانا تھانڈی اور جواہر لال نہرو کا دلش اور محمد علی جناح کا کرم سلطان ہے، یہ ہمارا محمد علی اور شوکت علی کا دلش ہے۔ لغت ہے ہم پر۔ ایس کہ ہم ایسی بستی کی تعداد نہیں کر سکتے آں؟“

ستیا دئے نے اس طرح گفتگو کرتے ہوئے چلا کر چہرہ کا زلیں تک شروع کر کے چاروں طرف دیکھا۔ جیسے کسی کو کچا پیاجانے کا۔ اس کے بعد اس نے تمام چاروں طرف گھما کر اکرم پر ڈال دی۔ گویا سپر ڈال دی اور بڑی زلی سے اس سے مخاطب ہوا ”مگر تم نگہ نہ کرو۔ میرے بھائی تم یہاں شوق سے رہو جب تک قبلہ ہی چاہے۔ میں سب نیک کردوں گا۔ ان حرام زادوں کو۔ یہ جو غم ڈانڈ کڑی پر اس وقت قبضہ کے بیٹھے ہیں۔ ان سب کو شکنجہ بن کر باہر نکال دوں گا۔ مگر میرا طریقہ دوسرا ہے۔“

اس کے بعد ستیا دئے رک گیا اور اپنا ایک ہاتھ ہوا میں اونچا کر کے بولا ”بکھے۔ بکھے۔ دو کیا سمجھتے ہیں۔ آج میں اس گندی بستی میں ہوں۔ مگر ایک دن دکھاؤں گا کہ میں ستیا دئے بھائی نہیں رہتا۔ پتھر پتھر کا تیسرا کیا ہوتا ہے۔“

”ارے بھائی“ باہرام لڑک نے جو دھوے کے ساتھ میں بیٹھا تھا اور دھوے میں ہی اس کی اسٹیشن میں ٹوک تھا احتجاج کرتے ہوئے کہا ”خود کو تو بھائی دیتے ہو۔ میں بھی تو تھانڈی ہوں۔“

”اے! آئی ایم دیری ساری“ ستیہ رائے نے بڑی لاپرواہی سے کہا اور پھر اکرم کی طرف متوجہ ہو کے کہنے لگا ”دیکھتے جاؤ۔ میری ٹینک دوسری ہے۔ میں تو آہستہ آہستہ چنگ اڑاتا ہوں۔ پہلے رکھا، پھر باندھا، پھر تانا۔ پھر کھینچا۔ اے گنجی کے چھوڑ دیا۔ کہ جاؤ بیٹا گلے رہو“ یہ اس کی تقریر آخری حلقہ تھا جسے اکرم کو بعد میں پتہ چلے۔ اس وقت آستیہ رائے نے اُسے اپنے گلے سے لگایا اور اس کے بعد پانی کی باٹھی اٹھاتے ایک جھونپڑی میں گھس گیا۔

ستیہ رائے کے اکرم کی ملاقات سرسری تھی۔ ایک مرتبہ اس نے ستیہ رائے کو سینہ بائٹھ کر کے تسلیم شہزادوں میں دیکھا۔ دو تین بار محلات غلی و غفران میں پتھر کھاتے ہوئے۔ اُسے اتنا سلوک تھا کہ ستیہ رائے ایک غلی مال ہے جو پر ویزو سول کی غلیں بکوانے کا مضامین کرتا ہے۔ ایسے آدمی کو چرب زبان ہر ناجی چاہئے ستیہ رائے کی زبان بھی موڑ کے پہنے کی طرح پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گومتی تھی۔ اس کی ماسیانی کا لڑی ہوئی تھا کہ کوئی دوسرا اس کے سامنے زبان گول نہیں سکنا تھا۔ ستیہ رائے کے جانے کے بعد محلات میں بڑی دیر تک تا ۱۳ ماہ خود محنت کو اکرم نے ابھی تک نہیں بتایا تھا کہ وہ اس سے پہلے کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ آہستہ آہستہ اُسے بتائے گا۔ اب اس وقت جو اس نے دیکھا تو بے لگ اسے ایک نئی ہمدردی کی چھان پڑا سے لگ رہے تھے۔ اوندھ بہت پریشان ہوا۔ وہ کسی کی ہمدردی نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو ان میں اُن صباہ کے رہنا چاہتا تھا۔

نعل خاموشی سے سر جو ہٹے عقد پتیارہ تموڑی دیر کے بعد اس نے صوبت سے کہا ”اے میری جھونپڑی میں سونے دو وہاں جگہ زیادہ ہے“

”بہت اچھا“ صوبت بولا۔

اور اس نے دیکھا کہ صوبت اس کے ہاں کرنے سے بہت خوش ہوا جس جگہ نے قریب آ کے اکرم کی ہنسی پرندہ سے ہاتھ مار کے کہا ”دائو رو ب ٹھیک کر دیں گے۔ تو باکل۔ جگہ۔ میں تجھے

اپنے چھوٹے بھائی کو کسے ملاؤں گا۔ کنارا میرا چھوٹا بھائی ہے۔ اور جب میں جیت گیا کہہ رہا تھا۔ اگر مرنے
مسموم کیا کہ چھوٹے بھائی کے ذکر سے میں جیت گیا آواز میں غم نہ آیا تھا۔ ”کنارا یہاں میڈیکل کالج
میں پڑھتا ہے۔ دو سال میں ڈاکٹر بن جائے گا۔ بڑا ڈاکٹر! میرا کنارا۔ میرا چھوٹا بھائی۔ میں اُسے کبھی
یہاں آنے نہیں دیتا۔ تو اگر کو اس سے ملنے کے لئے ہوشل میں جاتا ہوں۔ اگلے اتوار کو تمہیں لے چلوں گا“
جیسے میں جیت گیا کہہ رہا ہوں۔ تو کبھی میرا چھوٹا بھائی ہے۔

میں جیت گیا کہہ رہا تھا۔ خود اس گندی جی میں رہتا تھا۔ مگر اس کی ساری کمائی اپنے چھوٹے
بھائی کو لے کر کوڑھلے میں صرف ہوتی تھی۔ اپنے اوپر وہ بہت کم صرف کرتا تھا۔ اکثر کہا کرتا۔ میرا اب
دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ میری بچے تو اب میرے ہیں۔ اب میرا صرف ایک چھوٹا بھائی ہے۔
مگر کالج پرانے۔ یہ ڈاکٹر بن جائے تو کبھی میں نے کہا کیا۔ وہ گروہ کی بکواس اب دو سالہ گئے ہیں۔
جیسے میں جیت گیا کہہ رہا ہوں۔ میں آن پڑھ ہوں۔ جاہل ہوں۔ غیر تہذیب یافتہ ہوں۔ تمہاری محبت کے لائق
نہیں ہوں۔ مگر میرا ایک بھائی ہے۔ میں نے اُسے پڑھا یا ہے۔ اُسے ہوشل میں رکھا ہے۔ وہ ڈاکٹر
ہونے والا ہے۔ وہ تمہاری محبت کے لائق ہے۔ میں تو اس سے ملاؤں گا۔

اگر وہ جی بھرا آیا اس نے میں جیت گیا کہہ رہا تھا کہ کہا ”نہیں جیتا میں جیت میں تم
سے بھی مل کر بہت خوش ہوا ہوں۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں تم کے بھائیوں میں
آیا ہوں“

رات آدھ گھنٹہ پہلے فریڈ پر کھڑے۔ جو میں دوجا ادا کھل رہی تھی۔ دفنا میں
پھر بننے لگے تھے۔ میری جھونپڑوں کے اندر وہ جھونپڑوں کے باہر کی میں اندر کے جھونپڑوں کے
فرش پر انسانی جسم بند میں مدھوش پڑے تھے۔ ایک دوسرے کے قریب قریب کھڑی کے ہتھکڑیوں کی طرح
کے پیر کے اوپر اٹھیں میری دھڑکیں میری دھڑکیں۔ اب میرے نے مگر اگر م باگ رہا تھا۔ ادا جھونپڑا میں اپنے

دل ان اصدائیں ہمنوں میں تبدیل ہوتی گئیں۔ غلی سنت کا بحران کم نہ ہوا، بڑھتا ہی گیا۔
 اکرم کی خطوط نویسی کا بہت سے لوگوں نے مذاق اڑایا تھا۔ یہاں تک کہ ایک سڑ بھائی لوگوں کے لئے بھی
 ہنسی مذاق کا موضوع بن گیا تھا۔ شروع شروع میں اکرم کے اس کام کے شروع کرنے کا چرچا بھی ہوا
 تھا۔ ایوننگ ورلڈ نے اس کی تصویر بھی چھاپی تھی۔ اس سے پہلے بھی یہ اخبار ایک بی اے پاس پائٹ کرنے
 والے کی تصویر چھاپ چکا تھا۔ مگر کسی ہمدردی کی محامہ سے نہیں، صرف سنی پھیلانے کے نکتہ جھ سے، مگر
 اس بات کو بھی اب چودہ سارے ہر گئے تھے۔ غلی لوگ اکرم کو بھول گئے تھے ان کے لئے پتی ہی پڑھیں
 کیا کم تھیں۔ اُپر میں کم ہمدردی تھیں۔ مختلف سٹوڈیو میں لائٹ جیوں نے اپنی یونین بنالی تھی۔ کئی برس سٹوڈیو
 میں جڑ تھیں ہوتی تھیں۔ جڑے بڑے سرمایہ داروں نے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ بہت سی قادی پر غلی کی تصویر
 ڈالنے میں بندھ چکی تھیں۔ نئی تصویریں بہت کم شروع ہمدردی تھیں۔ بہت بہت کم ہوتے تھے۔ ہمدردوں کو جاکے
 وقت خانے لگ رہے تھے۔ داد میں مغل پرانے دھواں دھواں کی کیفیت کا منتظر تھا۔ کبھی یہ سناٹا جیسے سب
 ادھمک رہے ہوں۔ کبھی ایک نکتہ ایسی طرائق کہ ان کی کہن میں سرکل جاتے۔ ایک سڑ لوگوں کو سب سٹوڈیو ٹرکیز میں
 کو جاکے کئی سفید پرشورڈا ٹرکیز میں کو خانے لگ رہے تھے۔ میں نے دیکھا ہوا کہ ان پر میرے برائے ہی سکو بہت

کوناقم رکنا بڑا مشکل معلوم ہوتا تھا۔

بھٹا چاندیہ نے پہلے پہل اکرم صاحبت خاقا ٹٹایا تھا۔ پھر ڈی بھیدگی سے اسے اس ہم کو چھڑ کر پھرے
نہروں میں آئے کہ کیا تھا۔ یہاں تک کہا تھا کہ اس کے اس حقیر کام کرنے سے نعم دلوں کی تعمیر ہوتی ہے مگر اکرم
نہیں ملا۔ اب وہی بھٹا چاندیہ تھا کہ اکرم کی ناش مندی کو سراہ رہا تھا۔

”سبح سے ملت کے باہر بجے تک کام کرتا ہوں۔ پھر کبھی کوئی پیسہ نہیں دیتا۔ تین پچھوڑوں کی سسٹنٹ
ڈائریکٹر ہوں۔ ایک کچر کے پورے پیسے نہیں ملتے۔ بیٹھ باکڑا لے لے لے میں بیس لاکھ ہارے ہیں۔ بڑے بڑے
حالت تکی ہے فدا مبر کرو۔ اسے جب حالت موٹی تھی جب تم نے کون سی تیلیاں کھول دی تھیں۔“

اکرم خانوش رہا

”تم بہت اچھے رہے“ بھٹا نے کہا ”دن میں کتنا کھا لیتے ہو؟“

”دو ڈھائی روپے۔ کسی دن تین بھی ہو جاتے ہیں“

”یہاں تین بھی نہیں جے“ بھٹا نے اکرم کی طرف رشک سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”اچھا میں یہ خانا ڈال آؤں۔ بھائی سے سو روپیہ مل گیا ہے“ بھٹا نے خانا اکرم کے سامنے ہلایا۔

ابھ پھر ڈاک خانے کے اندر گھس گیا۔

ایک دن اکرم نے کسی صاحب کو ڈاک خانے میں گھستے ہوئے دیکھا۔ جانا چھاپا انداز معلوم ہوا

مگر چونکہ اس آدمی کی پشت اکرم کی طرف تھی اور اکرم اس وقت ایک خدا کھنے میں مصروف تھا۔ اس نے اس نے
زبان توجہ نہ دی۔ تھوڑی دیر کے بعد جب وہ کوئی ڈاک خانے کے باہر نکلا تو اکرم نے جھٹ پھان یا مینز رات
خسین تھے۔ مگر کس قدر گھبراہٹ سے گھستے تھے۔ ان کے سرخ و سفید تھے اندر کو دھس گئے تھے اور ذرا بے بسی

ساتھ اڈسوں ڈسوں ساہمہ ہوتا۔

”اے مرزا بی؟“ اکرم کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

مرزا بی نے بھی حیرت سے اکرم کی طرف دیکھا۔ حیرت دونوں کو ایک دوسرے کو اس حالت میں پاکر ہدیٰ تھی۔ مگر اکرم اپنی حالت پر زبانِ مطلق نظر آتا تھا۔ مرزا بی نے اپنی آنکھیں چھائییں۔ گہرا کے بولنے میں تم یہاں کیا کرتے ہو؟“

”مظلوم ازبکی کرتا ہوں“

مرزا بی خاموش ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد بولے ”دیکھا۔ اچھے پڑے کئے مسلمانوں کو بھی یہاں کام نہیں دیتا۔ میں تو پاکستان چاہتا ہوں“

”کیوں؟“

”کیا کروں۔ یہاں ایک سال سے بے کار بیٹھا ہوں۔ اب تو قاتلوں پر زور پڑنے لگی“

”پاکستان میں کیا کمانے نہیں ہوں گے یہاں کیا بے کاری، غریبی، جہالت اور اس قسم کے مسائل نہ ہوں گے۔ یہ بیلاری ہر جگہ ہے مرزا بی“

مرزا بی اپنے شانے ہاتھ سے ہوتے بولے ”کراچی میں میرا کام زلف ہے۔ وہ ایک اونچے سبکی چم پرانے ہے۔ اس نے مجھے کھانا ہے کہ اگر میں پاکستان آ جاؤں تو وہ مجھے پلیٹی ڈپارٹمنٹ میں جو سکا پوسٹ ملائے گا ٹھیک ہے!“

”مگر قہار ملک تو یہ تھا۔ تیس گھنٹوں سے قند پند تھا۔ مرزا بی سال میں دو مرتبہ تم اپنے وطن جاتے تھے

گھنٹوں کے پان۔ اس کا کچھ اس کا خصوص اب دیکھو۔ وہ گنگا بلا تھک زمین کی سی سونڈی سونڈی خوشبو ہے...“

مرزا بی نے اپنی نظریں اکرم سے پھیریں۔ آہستہ سے بولے ”میں نے سب ٹھیک کر لیا ہے“

اور اکرم نے مرزا بی کے گہرے چہرے، ان کے شفاف چہرے کے کرتے اور سفید پانچالے کی طرف

دیکھ کر سوچا اسے کسی وسیع منہ نظر میں رہنے والے خوب صورت لوگو! اب تہلہ لے کر آئی ہوں نہیں ہے؟
 اللہ کوئی انتہا نہیں ہے۔ کوئی جڑا نہیں ہے اللہ کوئی سزا نہیں ہے۔ کیوں کہ تم نے اپنے سب کچھ منفقہ کر دیا
 ہے۔ تمہیں گھٹو کے بجائے کچی لایا، اس کے بجائے جانور حلالہ تم نے اسے منفقہ کر دیا۔ اللہ کے بجائے تمہیں
 عشرت حلالہ تم نے اسے منفقہ کر دیا۔ ایک دن تمہیں زندگی کے بجائے پتھر کی گولی ملے گی اللہ تم اسے بھی
 منفقہ کر دے گا کیوں کہ تمہاری روح کا طوفان مچ چکا ہے۔ اللہ تہلہ لے سائل کا سیلاب ترچکا ہے۔ اللہ تمہاری
 کاوش نے تمہیں کامیاب کر دیا۔ اس نے اب تہلہ لے کر کوئی پتہ نہیں کر سکتا۔ اللہ کوئی شاخ
 نہیں لٹکے گی۔ اللہ کوئی پہاڑ تہلے سے دوڑنے پر تھک دینے کے لیے نہیں آئے گی۔ اللہ تم اپنے ہوش
 میں داخلہ میں سر دی سے فخر کرتے ہوئے مر جائے گا۔ اے میرے خالی فونی خوبصورت نئے لوگو!
 مرزا ہی نے اس سے کہا "تم یہاں اپنی زندگی برباد کر رہے ہو پاکستان چلے جاؤ پڑے کسے
 مسلمان کے لیے اب بھی وہاں بہت قند ہے"

"اگر بھئی پڑے کسے مسلمان چلتے بنے تو ان پڑے مسلمانوں کا یہاں کیا ہوگا؟"

اکرم کی آنکھیں فٹے سے چمک رہی تھیں اس نے ذرا بلند ہونے میں کہا "تم میرے مرزا ہی۔
 میں ایک نہیں ہوں۔ بے کاری، منظمی، نامداری مسلمانوں ہی میں نہیں ہے۔ ہندوؤں، سکھوں، عیسویوں
 اللہ پارسیوں میں بھی ہے۔ غریب کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ لیکن اگر تم مسلمانوں ہی کی بات کرتے ہو تو یہ بھی
 تم کو کہ اس ملک میں ساڑھے چار کروڑ مسلمان بستے ہیں۔ کوئی اللہ ملک بنا ڈالیں ہے کہ انہیں ہمسایا
 دے سکے۔ یہی ان کا ملک ہے۔ یہی ان کا وطن ہے۔ اسی وطن سے پیدا کرتے رہے اس کی مٹی کے
 گیت گاتے رہے۔ اسی کے سوا کچھ ایک فرد ہی جیتی اللہ بہترین حق ہے کہ ان کے آگے بڑھنا ہوگا۔ اللہ کوئی
 بد سزا دے نہیں ہے۔ میرے داغ میں یہ بات بالکل واضح اور صاف صاف ہے"

مرزا ہی ایک عجیبی شخص تھے۔ بڑی احتیاط سے انہیں لے جانے بھی پاکستان میں سے ایک یا ان

”کالا۔ اسے تلے میں دیا یا اسے بغیر کسی سلام کے اکرم سے سونہر پیر کے چلے گئے۔ جیسے انہوں نے کسی سلطان نہیں کسی کافر کا چہرہ دیکھ لیا ہو اکرم دیکھ عزاجی کی غائب ہوتی ہوئی پشت کی طرف دیکھتا رہا۔ یکایک اس کے کانوں میں آواز آئی۔ سلام۔ . . . اے!“ اودھ چونک کے کھڑا اس کے سامنے ولایت یگم کھڑی تھی مگر وہ سنی وہ ادا، وہ مجروح مصیبت اب جانے کہ غرائب ہو گئی تھی۔ ولایت یگم نے اپنے خوب موتا ہوا سترے سے سات کروڑ اڑائے تھے۔ اور ٹھیل سے نقلی امیر و کمان کی طرح خمیدہ بنائے تھے۔ اس کی آنکھوں کے نیچے گہرے گتے تھے۔ جیسے چھپانے کے لئے اس نے اپنے رخساروں پر دو گ دو دفنِ مروت سے زیادہ تھوپا تھا۔ ہونٹوں پر لپ ٹک اس قدر زیادہ تھی کہ دونوں ہونٹ پٹے ہوئے زخمِ معوم ہوتے تھے۔ اس قدر شوخ ہو کا ستا رنگ تھا وہ! ولایت یگم نے اس کے کہا ”مجھے نصیب نے بنایا کہ اب تم یہاں بیٹھتے ہو“

”مگر نصیب؟“

”اسے نصیب کہ تم نہیں جانتے ہو۔ کمال ہے۔ اسے وہ اپنی ہے اپنے ساتھ جسم بہت اچھا ہے اس کا۔ وہ تو تہذیب اتنی تعریف کرتی ہے کہ میں بھی وہ تم پر عاشق ہے اہ تم ضرور اسے جانتے ہو گے“ اکرم کو یاد آیا۔ اس نے سر ہلا کر کہا ”ہاں اُسے دو تین بار دیکھا ضرور ہے۔ مگر آج تک

نہیں۔۔۔“

ولایت یگم ہنسی بولی ”کسی دن عہدوں گی۔ اس رت ایک مئی آؤدھ کو رو“

”کتنے کا ہے؟“

”پچتر روپے کا“

”کسے سیر ہو گی؟“

”اسے میری طرف سے مت پیچھے۔ وہ کمال کا غضب ہو جائے گا۔ حضرت کے نام

سے بچو“

اُس روز بارش برس کے خم گئی تھی۔ شام کا وقت تھا اور بستی کے لوگ آسمان میں شفق کو
 بادلوں کی جھالیں جھانے لگزی تھی۔ بستی کے آس پاس اور بستی کی گلی میں چھوٹے چھوٹے بوڑھوں میں ہانی
 بھر گیا تھا۔ اور اس وقت شفق کے کس سے ایسا سلوم ہوتا تھا اگر پانی کی سطح پر بڑا دل محراب قریب ہی
 آسمان کے اس چھوٹے سے کونے میں اس وقت آنا شفق تھا اگر اوپر دیکھتے ہوئے بحیثیت ہوتی تھی۔

مگر بستی کے لوگ اوپر نہیں دیکھتے تھے۔ ایک عرصہ بعد وہ آسمان کو بھلا چکے تھے اس وقت
 نیم کے چڑ کے نیچے بڑے زور شور سے بوٹ جاری تھی دھوے جو عموماً غامض رہتا تھا۔ اس وقت بہت
 ہی بے چین اور مضطرب انداز میں باتیں کر رہا تھا۔

وہ کہہ رہا تھا "بیٹھنے جیسے بٹایا۔ کاغذ کا پرندہ جو میں نے بوائے میں کو دیا تھا۔ اور بوائے میں
 نے انہیں کو دیا تھا۔ وہ اس وقت اس کے سامنے تھا۔ وہ بہت بے چین اور پریشان نظر آتا تھا۔ مجھے
 اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر کہنے لگا۔ "کب سے تم ہماری جلی میں کام کرتے ہو؟"

"دس سال سے"

"اس کاغذ پر تم دستخط کر رہے تھے؟"

”ہاں“

”تم جانتے ہو اس کاغذ پر کیا لکھا ہے“

”جی۔ لکھا ہے کہ دنیا میں جنگ بند ہونی چاہیے“

سیٹھ نے کاغذ دہرا کیا۔ تہرا کیا۔ چہرہ کیا۔ اس نے اُسے پھر آہستہ سے کھولا اور اتنے عرصے

تک وہ بالکل خاموش رہا۔ پھر اُس نے مجھ سے کہد

”کیا تم کو کبھی شانتی سماج کے ممبر ہو؟“

”ممبر تو نہیں ہوں۔ واسطیٰ ضرور ہوں“

”دنیا میں امن ہو یا جنگ ہو، تمہیں اس سے کیا۔ تم مزے سے اپنا کپڑا بیٹھے جاؤ“

میں نے سیٹھ کو بہرہوشیہ کے بارے میں بتایا۔ اُس نے میری گوی بات سن کر ہی کہد

”سیاست؟ سیاست۔ تم مزدور لوگ اگر سیاست کم کرو اور کام زیادہ کرو تو دنیا میں کسی

قسم کی صحیفت باقی نہ رہے۔“

میں نے کہا ”میرے پچھلے دس سال کا ریکارڈ دیکھو۔ کیسا کام میں نے کیا ہے۔“

سیٹھ ہوا ”اہی نے تو تمہیں بھلا سنا ہوں۔ کوئی دوسرا جوتا تو اُسے غرا کمال دیتا۔“ آٹا کہہ کر اس

نے بچے خیر سے دیکھا۔ بلکہ گھوڑا۔ جیسے پلٹیں دل نے کسی لازم کو گھومتے ہیں۔ سیٹھ بسند ہوا ”تم بہت چالاک

ہو۔ اچھا جانو اب کی تمہیں سامان کر دیتا ہوں۔ مگر آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا“ اس کے بعد اس نے وہ دستلوں

والا آئینہ لے کے پھاڑ دیا اور مجھے اشارے سے کہا کہ اب بچے چھٹی ہے۔

”پھر“ مجھ نے اپنی ناک اٹھی سے دو تین بار منہ تے مجھ سے پوچھا ”تم نے دستا نہیں

کر دیا؟“

مجھ نے ہوا ”ایسا ہی کیا؟ مگر میں اب محتاط ہو گیا۔ میں نے جا کھا اپنے مزدور بھائیوں سے

کہا کہ سچ کیا کہتا تھا۔ کئی مزدور جہاں جراس سے پہلے شانتی سماجی اپیل پر دستخط کرتے تھے انہوں نے فوراً دستخط کر دیے۔

”میں“

وہ بولے ”بھئی کراس اپیل کی مخالفت کرتا ہے اس میں ضرور کوئی ایسی چیز ہوگی۔“

اس پر ایک قبضہ چلا۔ من بیت سنگھ اور فضل خٹہ نے دھم دے دی۔ کرم جوب سنگھ اس کو کہہ کر بھجنا تھا، مگر کراس کو سختی محسوس ہوئی سے دیکر رہا تھا اور بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دوسرے نے اپنی ٹیکر کی جیب سے ساقدوں کا ایک پلندہ نکالا۔ کہنے لگا ”پہلا ساقدور بیٹھو نے پاڑ دیا اس پر بڑی شکل سے دوسرا دستخط ہوتے ہیں گے بیٹھ کے سنا کرنے کے بعد آٹھ سو لوگوں نے اس پر دستخط کر دیے۔ تم نے مگر اس وقت ان لوگوں کے ہیرے دیکھے ہوتے!“ دوسرے ایک خاموش ہو گیا۔ اس نے دستکوں ملنے کاقدوں کا پلندہ مبرنت کے ہاتھوں میں دے دیا۔

جواب دیا ”اس جنگ کی تو میں بات نہیں کرتی لیکن پھل جنگ میں بچے یا رہے یا نہیں بچے ہوئے مانگے نام دے جاتے تھے“

من بیت نے کہا ”اور اس کے بعد وہ خندق پر جا کے گولی کما کے فرماتے تھے۔ اسی طرح میرا چچا مر گیا تھا۔ بچے یا رہے ہمارے گاؤں میں دیوانی کا میل تھا۔ اس مذہب لوگوں نے نئے کپڑے پہنے تھے ہمارے دونوں ہاتھ مشائیوں سے بھرے ہوئے تھے اور جیبوں میں آتش بازی کا سامان تھا اور ہم پہلے سے خرید کے لے جا رہے تھے۔ اتنے میں ایک ڈاکٹر میرے والد کو مرنے لگا ہوا آیا۔ اور وہ مار چڑھ کے میرے والد پر ہاتھوں مار کے روئے لگ چکے۔“ وہ چپ ہو گیا۔ پھر من بیت نے سر ہل کر کہا ”یقیناً زندگی بہت اچھی چیز ہے۔ بچے اپنا چچا ابھی تک یا رہے۔ لام پر جانے سے پہلے وہ کس قدر خوب صورت اور تندرست دکھائی دیتا تھا۔ اس کی دواڑھی سرخ تھی، اور سرخ اس کے بال تھے، اور سرخ اس کے

مال تھے۔ اور وہ ایک بڑے لڑاکیلی بچے کی پوز کر رہا تھا۔ اگر وہ آج زندہ ہوتا تو شاید میں اپنی پڑھائی جاری رکھ سکتا۔ من جیت نے اس زندگی سے سر ملایا۔

فصل نے کہا: ”پہلی جنگ کی بات تو میں نہیں کرتا لیکن اس جنگ کے دنوں میں، مہینے بہت ملتے تھے۔ میری ٹینکی بھی صبح سے شام تک چلتی تھی۔ ان سے زیادہ رات میں کھانا تھا۔ کوئی دن ہی ایسا ہوتا تھا جس میں صاف شہر دے نہ کھایا ہوتا۔ اب؟“ فصل سے باتیں کرتے ہوئے کہتے ہیں:

”جسوت نے کہا: ”جنگ میں دشمن کتنا تھا۔ شہر دے پر دس تم خرید کیا سکتے تھے۔ جنگل میں جنگ کے دنوں میں کیا ہوا۔ تیس لاکھ آدمی فلقے سے کیوں مر گئے کیوں کہ سالانا آج کا جنگ پر جا رہا تھا اس نے ہمیں اور بچے فلقے کرنے پڑے۔ صرف دھوپوں پر کوئی نہیں ہی سکتا ہے اور آدمی کی زندگی ایک ٹینکی کی کمانی سے بڑا درد ہے۔ ہنسنے ہو کہ نہیں۔“

فصل نے ان بات میں سر ملایا۔ تھوڑی دیر کے بعد رنگ کے بول: ”ایک اپیل بچے بھی دے دو میں ٹینکی لڑاؤ میں یونین کے سامنے اے رکھوں گا۔“

جسوت نے اپیل کا ایک چھاپا ہوا نڈلے دیا۔ پھر اس نے اکرم سے مڑ کے کہا تم خاندان مڑی میں اتنے بڑے بڑے نامور اور اکادمی، داریت کاروں، تقسیم کاروں کو جانتے ہو اگر تم ان لوگوں سے دستخط کرا سکو تو ہمارے کام کو بہت فائدہ پہنچ سکتا ہے۔“

اکرم نے کاغذ اٹھائے اور لے کے کہا: ”مگر اس میں ہے کیا۔ میں تو سمجھتا ہی نہیں۔ کون ایسا آدمی ہو گا جو اپنے ہوش و حواس میں ہو اور اس اپیل پر دستخط نہ کر دے۔“

جسوت نے کہا: ”یہ چیز اس قدر آسان نہیں ہے۔ تم چھان بین کے سیٹھ کی باتیں تو سن چکے ہو۔“

”وہ سب تو پاگل معلوم ہوتا ہے۔ ساری دنیا تھوڑی پاگل ہے۔“ اکرم نے ہنس کے کہا۔

”دنیا میں کئی خطرناک پالم موجود ہیں، جو پالم خانے میں موجود نہیں ہیں۔ جگہ اونچے اونچے اور
جھڑوں پر اونٹناتے ہیں اور دن رات جنگ جنگ چلتے ہیں۔“
”ہوں گے! دوسرے ملکوں میں ہوں گے۔“ اکرم نے ذرا جلد لہجے میں کہا ”مگر ہمارے
ملک میں نہیں ہیں۔ خود ہمارے ہر وہاں مستری کی پالیسی ہی ہے کہ دنیا میں کہیں جنگ
نہ ہو۔“

”اس میں کوئی شک نہیں“ جسوت ہوا ”پنڈت نہرو کی مخلصانہ کوششوں نے امن کی
سہولت میں ہندوستان کو ایک تاریخی مقام بخشا ہے۔ مگر یہ قسمتی سے خود ہمارے ملک میں ایسے لوگ موجود
ہیں جو طرح طرح سے پنڈت نہرو کی صلح کوئی کی پالیسی کی مخالفت کرتے ہیں۔ ان کا موہنہ بند کرنا ضروری
ہے۔ لہذا پنڈت نہرو کی امن پسند پالیسی کو آگے بڑھانے کے لئے عام کا تعاون دینا بھی بہت ضروری ہے۔“
دھرم نے بابرام کی طرف مسکرا کر کہا ”اپنے بابرام نے اپیل پر دستخط نہیں کئے۔“
”کیوں بابرام؟“ جسوت نے پوچھا۔

اب ہر شخص بابرام کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بابرام کے لئے ان کی محابوں سے پہنچا جانے میں ہر گھبراہٹ
پہلے تو اس نے اپنے ہاتھ اپنی جیب کی طرف کرتے گویا وہ خود نہیں اس کے ہاتھ مجرم تھے۔ جنہوں نے اس
پر دستخط نہیں کئے تھے۔ پھر اس نے دایاں پاؤں اٹھا کر انہیں پاؤں پر رکھا اور جب اس سے کبھی کام
نہ بنا تو یکایک نکتے میں ہوا ”میری بھئی میں نہیں آتا کہ انہیں کرک کو جنگ یا امن کے سوال سے کیا حق ہے
میرے لئے آنا جانا ہی کافی ہے کہ وہ اندوہ چار روپے ہوتے ہیں۔“

دھرم نے کہا ”کبھی کبھی وہ اندوہ چار روپے پاکی بھی ہوتے ہیں۔“ اس جیت سنگھ نے بابرام کے
لہجے میں بائیں اس کی نقل کرتے اس طرح کہا کہ سب کو سنہی آگئی۔

جسوت ہوا ”اندوہ اندوہ چار روپے بھی ہوتے ہیں۔ اور اگر ان چار روپوں میں سے ایک روپہ ایشم یا

بائیں دو من بم کا ہوا تو تم اور تمہارا یہ کارخانہ اور چراغ اور غصہ سے شہر کبھی ایک لمحہ میں ناپا ہو جائے گا۔

بابر نام نے فستے سے کہا "ہو جائے مجھے کیا۔ میں تو اس کی مٹری بدبو دار سبزی میں۔"

مگر وہ اپنا فقرہ پورا نہ کر سکا۔ اس کی آنکھیں بچا اختیار گی کے سوسے پر گھوم گئیں اور اس نے زندہ سے سانس اندھ کھینی کو چبوترے پر بیٹھے ہوئے دوسرے رنگ بھی اسی طرت دیکھنے لگے بعد میں بابر نام دیکھ رہا تھا۔

گی کے سوسے پر سے دو لڑکیاں چلی آ رہی تھیں۔ ابن جستم، بک خوام، شفق کے قاتل بلوروں کے پرے کے پرے ان کے پس منظر میں تھے جن سے ان کی ساڑیوں کے رنگ اور بھی بکھر گئے تھے اور ان کے سر کے گرد سرخ روشنی کے ہالے سے گھومتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ وہ اس دنیا، کم از کم اس سبزی کی مخلوق معلوم نہ ہوتی تھیں۔ ان کے روشن چہرے۔ ان کی سفید بھری ہنسی نضا میں ایک، سفید ناخت کی طرح ڈھونڈی ہوتی۔ اور جب وہ چبوترے کے قریب آتے آدمیوں کو دیکھ کر خشک گئیں تو گی کے چھوٹے چھوٹے جوڑوں میں ان کی ساڑیوں کے رنگ قوس و قزح کی طرح پھیل گئے۔ بچا ایک ایک لے کے تھے وہ ہم ہی گئیں۔ پھر ان میں سے ایک نے جھومری سے زیادہ ہر شیداء معلوم ہوتی تھی اپنی داغی داغی ہلکیں چپے کے پرچا "جو نمبر کی جھونپڑی کون سی ہے؟"

ایک لمحے کے لئے اٹا ہر ایک صدی کے لئے کسی نے جواب نہ دیا۔ پھر منانے آہستہ سے کہا کہ میری جھونپڑی ہے چار نمبر کی۔ اس سے آگے دانی کا نمبر ہانکا ہے۔ اس سے آگے کی جھونپڑی جو نمبر کی ہے۔

مورے ہوئے قدم بڑھاتے ہوئے چبوترے کے قریب سے بدن چراتے ہوئے وہ دو لڑکیاں ساڑی بٹھلاتے ہوئے آگے چلی گئیں۔

وہ لڑکی جس نے سوال پر چپا تھا اس کے بالوں میں بابر نام نے دیکھا گلاب کا ایک پھول نکلا ہوا تھا۔ کتنا عرصہ۔ کتنا عرصہ ہوا اس نے گلاب کا پھول نہیں دیکھا تھا۔ ایک بے نام ہی ہیک

اس کے خنوں میں بھر گئی اور وہ سر سے پاؤں تک کانپ اٹھا۔

جسوت نے اپنی سخا میں لڑکیوں کی طرف سے پھر لیں اور بابو رام کے چہرے پر لاد دیں۔ وہ
لہا لہاں صان رہتا ہے وہاں خوب صورتی بھی ہوتی ہے۔ چاہے وہ یہ کی سڑی تھی کیوں نہ ہو۔

بابو رام لا جواب ہو گیا۔ اس نے جسوت کی طرف ہاتھ بڑھا کے کہا ”وہ کاغذ بچے دو۔ میں
دھنسا کر دیتا ہوں۔“

اور کسی نے نہیں پہچانا تھا لیکن حکم نے پہچان لیا تھا۔ ان میں ایک رضیہ تھی، اور دوسری
جس نے سوال پر چپا تھا وہ رضیہ تھی۔ جیسا کہ بعد میں اکرم کو معلوم ہوا رضیہ کی حالت اچھی نہ تھی۔ رضیہ
اس کی مدد کر رہی تھی۔ مگر پھر بھی کب تک کوئی کسی کی مدد کر سکتا ہے اس زمانے میں؟ رضیہ نے ہنسنے لگا
کا کرو چھوڑ کر ساں بستی میں چھ نمبر کی جھونپڑی کو لے کر پہننے لگی تھی، اور اب یہاں اپنی اماں اور اپنی مرحوم
بہن کے پانچ بچوں کو لے کر آئی ہوئی تھی۔ اس وقت وہ رضیہ کو ساتھ لے کے جھونپڑی دیکھنے کے لئے
آئی تھی۔

بستی میں ایسی خوب صحبت عورتیں، ایسی خوب صحبت ساڑیاں، ایسے خوبصورت رنگ کاغذ کو
کسی نے دیکھے تھے۔ وہ لڑکیاں صدیوں کے پہلے خواب کی طرح اچانک اس بستی میں نمودار ہو گئی تھیں۔
اور کسی کو تھیں نہیں آتا تھا۔ وہ لوگ دہرا، سڑاند، بدھوتی، کینگلی، جنگ نظری اور جیو دھاسے اس قدر
انوس ہو چکے تھے کہ ایک مکشن چہرہ، ایک صاف تھری سازی، گلاب کا ہنکا ہوا پھول بھی ان کے
لئے اجنبی تھا۔ ایک ایسا خوبصورت لہو تھا جو شاید پریوں کی دنیا سے آیا تھا۔

جنگ دھولنگ بچے، غلیظہ اور شہر پہاتے ہوئے بچے، لانے لانے بال کھولی ہوئی عورتیں،
لٹکے ہوئے پٹاؤں سے رہیں رہیں کرتے ہوئے بچوں کو درود دیتی ہوئی جوق جوق چوبیس بج رہی تھی
کے سامنے آ کے کھڑی ہوئی گئیں۔

یہ خوب موردی ناکا ہوا یقین تھی۔ یہ لوگ اس زمین کا نہیں شفق کے عجیب آسمان کا کھڑا تھا۔

بہت دیر تک لوگ کھڑے دیکھتے رہے۔ دیر تک رضیہ اندھیری جھونپڑی میں رضیہ کے ساتھ کھڑی اس کی دیواروں اور چیمبروں کو دیکھتی رہی۔ مگر وہاں دیکھنے کی چیز ہی کیا تھی۔ یہاں آٹھ روپے کرایہ تھا۔ بھنڈی بازلی کی کھولی کا شائیس روپے کرایہ تھا۔ فیصل پہلے ہو چکا تھا۔ تھوڑی دیر دیکھنے اور سوچنے کے بعد رضیہ اور رضیہ ہولے ہولے جھونپڑی سے علی گئی میں سے آہستہ آہستہ چلتی ہوئیں، ساڑی اٹا کر جوڑوں سے بچتی ہوئیں، اپنے خوشنایندوں سے ٹپ ٹپ کرتی ہوئیں گی کے سرے پر جدھر سے آئی تھیں اودھر غائب ہو گئیں۔

یہ سب کچھ اٹا چانک، اٹا عجیب اور غری طریقے سے ہوا کہ سب کو بارہنہ ہوتا تھا کہ ابھی یہاں چند لمبے پہلے خوب موردی آئی تھی۔ جس نے اُترنا تھا، گلاب بھاتا تھا، نسا جگمگاتی تھی۔ یہاں تو کوئی نہ آیا تھا۔

دی تنگ و تاریک گلی تھی۔ وہی اس کے بد نما جوڑے تھے۔ وہی رنگ آلود دیواریں۔ وہی بد نما دیوے پڑا ہوا سناٹا۔ بچا یک گلی کے دوسرے سرے پر ایک آدمی اپنی بڑی کندھ زدہ سے بیٹھنے لگا۔ اکرم کے سارے بدن میں غبر غبری آئی۔ اس نے گھبرا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ مگر آسمان پر بھی شفق غائب ہو چکی تھی۔ آسمان پر صرف باران کی سیاہ رنگہ باقی رہ گئی تھی۔ اتنے میں جتنا اپنے کاچنے چوتے اتھوں کی لاطین روشن کئے آئی اور فضل نے لائیں اس کے اتھ سے لے کے نیم کے پیر پر لٹا دی۔ روشنی کا ایک ادا جھونپڑے پر پڑنے لگا۔ جو لوگ اب تک خاموش تھے۔ دیرے دیرے باتیں کرنے لگے۔ آؤ۔ روشنی آؤ۔ کہیں سے آؤ۔

اتوار کو غم سٹوڈیو تو بند نہیں ہوتے تھے لیکن فلم کمپنیوں کے دفتر ضرور بند ہوتے تھے۔ اداکار
 نہیں ہوتے تھے تو ان کمپنیوں کے جن کی شروعات میں روز کسی مشورہ میں جادی ہوتی لیکن ذمہ داری ہر وقت کٹھن
 سہانہ شونگ ہر نہ ہو میرے کھارہتا تھا۔ صرف باہر کا وہاں فطرت ساجد کھایا جاتا۔ اندھا دل میں وہ بڑی بڑی
 بیڑوں پر بڑے زبردستی ہوتی تھی۔ میڈم کو ذیل الگ تھا۔ بیڑہ باغیچہ کا لگ تھا۔ میڈم کی ٹیبل پر آنا
 پرائیٹ کی گیم ہوتی تھی۔ بیڑہ باغیچہ کے ٹیبل پر شہر کے بڑے بڑے سٹا باز آتے تھے۔ مکان آنا پرائیٹ کر
 کیا خاطر میں لاتے۔ وہ وہاں پرائیٹ تک تو وہ کرکٹ کلب کہنا انڈیا میں کھیل سکتے تھے۔ اس کے بیڑہ
 پہنچانے اپنی ٹیبل پر پانچ عدد پر پرائیٹ کی گیم رکھی تھی۔ بلکہ کہ تو فرم آتے۔ اس کا کوئی نتیجہ ہر اتوار
 حرمیں چلے وہ لاکھوں کھانے والی میرٹھیں کیوں نہ ہوں۔ کبھی بیڑہ کے ٹیبل پر نہ کھیتی تھیں۔ وہ میڈم
 کے ٹیبل پر ہاتھ لے کے بیٹھ جاتیں اداکار کے ساتھ دوسرے بیڑے بڑے اداکار اسٹوڈیو جاتی مٹانے والے
 داریت کار کبھی کبھار شاہی ہر جاتے۔ دلی گیادہ جگہ دن سے شروع ہوتی اصطلاحات کے گیارہ بجے سے پہلے
 ختم نہ ہوتی۔ نیچے میں وہ ہر پر کا کھانا شام کی چائے۔ رات کی دہائی اداکار کا سب ہی کہہ پلا۔ ساری خاندان حرمیں
 کے سگرٹوں اداکار کی بڑے سسر ہر باقی۔ آج بھی صرف تاش کے چرن پگڑی نہیں۔ کھانا ہاتھ دہائی

مگر بے صبرت انہوں کے خدیجے ہونٹوں تک پہنچتے تھے۔ انہیں اس وقت ایسے سالوں میں باطل ہے کہ انہیں وہ شراب ہانگ دیکھ سکتی تھیں۔ مگر بے صبرت کا بلائے نہ چاتی کی صورت وہ صحت آتش کے پتے دیکھ سکتی تھیں۔

ایسے موقع پر اکرم کا شافی ہسٹا کی اہل لے کر پہنچا جانا ایک اذیت نگ بہت سے کم نہ تھا۔ بہت سے لوگوں نے بڑا انا۔ مگر وہ تاش کے تھریں میں اس قدر دھک تھے کہ اس وقت انہوں نے غامضی سے اس اہل پر دستا کر دینا ہی سب سے اچھا سمجھا۔ مگر کوئی دوسرا وقت ہوتا تو وہ خوب اکرم پر جرح کرتے۔ اس سے سوال پر چھتے۔ اور اکرم خود ہی سوچ کے آیا تھا۔ اور چاہتا ہی تھا کہ سوال جواب ہوں، مگر گھبراہٹ میں نہ گئے۔ بہت میں موصوفہ کھل کر سامنے آئے۔ اہل طرح ہوش کے بعد وہ لوگ دستا کریں۔ اس قدر دیکھ کر اس مسئلہ پر روشنی ڈالنے کی کوشش بھی کی۔ مگر تاش کھیلنے والے دی کے رہا کہیں اس وقت یا سب کی بات نئے والے تھے۔ ہاں۔ ہاں! ٹھیک ہے کہ کردہ جلدی سے دستا کر کے اپنا پیچھا بڑھاتے گئے۔ اکرم بہت افسوس ہوا۔ اسے اس بات کی امید تھی کہ حالات یہ صورت اختیار کریں گے۔ یہ ایک اس کا بھی چاہا کہ وہ مزید دستا حاصل کرنا بند کر دے اور اس معاملے کو بھر کسی دوسرے ہدف کے لئے ٹال دے۔ مگر مصیبت تو یہ تھی کہ اسے اتوار کے ہدف کے طوائف اور کسی دن پہنچی نہ ملتی تھی۔ صحت اتوار کو ڈاک فنانڈ ہوتا تھا۔ اور اتوار کو یہاں ہر روز سیٹھ باکڑیا کے دفتر میں دی ہوتی تھی۔ اور یہی ایک جگہ تھی جہاں انڈسٹری کے تقریباً سب بڑے بڑے اداکار اکٹھے مل جاتے تھے۔ وہ دایوس ہوس کے اہل کردہ کر کے اپنی جیب میں رکھنے کا سوچ رہا تھا کہ اتنے میں حالات نے پٹا لگایا اور سیٹھ باکڑیا نے تاش کے پتے میز پر نہ دے پیسنگ کر اہل پر دستا کرنے سے انکار کر دیا۔

”میں کہتا ہوں۔“ سیٹھ باکڑیا میز پر نکال دے کہ بولے میں سے جگہ ہر انداز میں ہے۔“

ہر شخص سیٹھ باکڑیا کی طرف دیکھنے لگا۔ نظم انداز میں اکابر ترین سیٹھ اس وقت یا سب مامور پر اپنی رائے سے دنیا کو سرسبز کر رہا تھا۔ ہر شخص نے اپنے پتے میز پر ہد کہ دے اور فور سے سیٹھ باکڑیا کی طرف

۱
دیجنگ

اکرم نے پوچھا "کیوں؟ جنگ سے کون بچ رہا ہے؟"

"جن۔ میرے بچے جن۔" بکڑا نے اکرم کی طرف ششکانہ نظار اختیار کرتے ہوئے کہا جو اکرم بہت کھلا گرن چپ ہر کے بیٹھ کی باتیں سننے لگا۔

"جنگ سے پہلے میں کیا تھا۔ تم سب جانتے ہو جنگ کے دنوں میں مجھے بااں لائنیں تصویریں بنانا کئے تھے۔ ہوائی فوج کے کام لکھتے میں سولہ گھنٹہ روزہ لگا کر دوپہر کے کم نہیں تھے جب تک جنگ لپکتی ہوئی تھی تو کموں سے میرا کیا۔ اب جب جنگ بند ہوئی حکومت نے لائنیں دینے بند کر دیں۔ جنگ کے دنوں میں میں نے تین ٹھوڑے خریدے۔ جنگ کے بعد میں نے ایک نئی گاڑی بھی نہیں خریدی۔ چیلنک میرا تعلق ہے مجھے جنگ نے بہت نامہ پہنچایا ہے۔ میں جانتا ہوں دنیا میں پھر سے جنگ ہو۔ جہاز بڑھیں۔ لائنیں چلیں۔ میری سبب ہزار ہو۔ میں بزنس میں ہوں بزنس کی بات کرتا ہوں بیٹا۔ بروکیر کیا کہتے ہو؟" اکرم نے کہا "سیٹھ صاحب آپ ایسے کتنے لوگ ہیں جنہوں نے جنگ میں لاکھوں کما لئے ہیں۔ انھیں پھر گینے ہا سکتے ہیں"

بکڑا نے کہا "ایک بھری پر کیا سوتوں ہے۔ ان کا ماروں سے پر ہو۔ تھامے سامنے بیٹھے بیٹھے ہیں۔ راج نا جنگ سے پہلے پانچ ہزار ایک غم میں کام کرنے کا بچہ تھی۔ اب پچاس ہزار سے کم میں نہیں آتی مثلاً سے پر ہو۔ سات ہزار بچی تھی۔ اب شہر سے کم کی بات نکل سے کرتی ہے۔ دلیپ کے کادے پر ہو۔ دیکھتے سے پر ہو۔ راج کچھ سے پر ہو۔ سب لوگ تھامے سامنے بیٹھے ہیں۔ ہنسی سے پر ہو۔ یہ بھی میری طرح غم پہنچا رہے ہیں۔ جنگ سے پہلے میں تھے ساتیس ہزار دوپہر ایک غم کا تھا اب اسی غم سے جنگ کے زمانے میں پچتر ہزار تھے۔ اس پر تو پھر تیس ہزار جب کہیں ہزار ہی تھے گئے۔ بتاؤ اس ملک ہے کہ جنگ؟

ہنسی نے سکر کر کہا "اس صاحب سے تو جنگ ہی اچھی تھی۔ یہی میں بھی جانتا ہوں"

اکرم نے کہا "آپ کی طرح سوچنے والے کتنے آدمی ہیں۔ ان پر بھی انھیں ہ گئے ہا سکتے ہیں"

میڈ بگت لال نے کہا " اس سلسلے میں میں کرم کا ہم خیال ہوں۔ جنگ کے نائنے میں لپٹا ہوا ہوں۔
 نے ہم ڈسٹری پر ٹروں کا خون پڑا ہے۔ کتنے ہی ڈسٹری پر جنگ میں دھلائے ہو گئے۔

میڈ ٹرنپنڈ نے کہا " ہاں یہ تو جیسے ہے۔

کرم نے کہا " روکے مخالف رو۔

راجہ بولی " کرم بھی ہر جنگ بڑی چیز ہے۔ میں نے وہ طوائف تو نہیں دیکھی لیکن میرا خاندان بہت جلا ہے
 ہر ہندو کبھی۔ کبھی سر نہیں چل رہا ہوتا ہے۔ بڑی طاہیات چیز ہے یہ لڑائی۔

شٹار بولی " بچے ناخوش زندگی پسند ہے۔ مجھ یاد ہے جب جاپانیوں کے کم نکلتے پر گئے تھے
 تو میں بچی سے بھاگنے کی سوجھ بوجھ تھی۔ یہ سچ ہے۔ جنگ میں میری ملاکاری کی قیمت بہت بڑی تھی۔ میں نے بچی
 میں کئی ہفتے بھی خریدے ہیں۔ مگر میں دونوں نکلتے میں کم پڑے۔ ان دنوں میں سوتی تھی۔ میری اس بات کو دیکھا
 سنتی ہوں، آج کل ایسا ایسے کم ہوتے ہیں۔ راجہ ٹوپی بتا رہی تھی مجھے ایک ٹیم سے ملا شہر تک سے
 اڑتا ہے۔ ان ناں باگلو میڈ لاکھوں روپیہ کمانے کا کیا نامہ اگر آزادی زندہ ہی نہ ہے۔
 " پادہ کرم ہے کہا۔

پیر کرم حدوازے پر کھڑے ہو کر چوڑی کی طرف مڑا اور اس سے کہنے لگا " ہٹو کے؟ تم بھی
 یکو کمرے۔

ہٹو کے نے اپنے بڑے بڑے دانت باہر نکال دیے۔ بولا " میں غریب آدمی ہوں۔ میں کیا
 ہوں گا۔

" نہیں۔ نہیں۔ " کرم نے کہا " ایسے موقعوں پر غریب آدمی ہی کو زیادہ بولنا چاہئے۔

ہٹو کے چپ رہا اور خاموشی سے باگلو میڈ میں اپنے ہاتھ کی طرف دیکھنے لگا۔

میڈ باگلو نے سکوڑ کے کہا " ہاں ہاں! ابھی۔ آج کل اشتراکیت کا زمانہ ہے۔ ہندی حکومت بھی

اشترک ہو رہی ہے۔ تم بھی کمرہ نشین پڑھو کے !

پڑھ کے کامیاب اس منزے سُرخ ہو گیا مگر اس نے اپنے آپ پر تباہی پائی کہتے ہوئے اب آپ اتنے عقل مندری بیٹھے ہیں میں ایک ماہل گنہگار کی کیا کہوں۔ جنگ میں وہ لوگ میرے وطن بڑے بہانوں کو فرج میں مذبحِ سستی بھرتی کر کے لے گئے۔ بلا بہائی تو لدا گیا۔ جھوٹا بہائی ادا ہو گیا۔ میں مگر گنہگار نے باگ کر رہا ہوں نہ آقا تو شاید اس وقت یہ بات کہنے کے لئے زندہ بھی نہ ہوتا ؟

”کون سی بات ؟“ سیٹھ پاگل نے پوچھا۔

”آدمی مدھے کے بغیر زندہ نہ نکلتا ہے۔ زندگی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔“

پڑھ کے آٹھ گھنٹے کے غامض ہرگیا۔ سادے ہل میں مٹا لاسا ہوا گیا۔ ہل میں بیٹھے ہوئے آتش کیلئے دلے تاحولہ لوگوں نے سر ہا بھی نہ تھا کہ سولہ آن پڑا، گانٹ سے آیا ہوا چرائی ایسی موجود ہو کر ہاتھ کرے گا۔

اکرم نے کہا : ”پانچ ! اللہ کوئی بات کرے گا ؟“

میڈم بلی : ”تم نے سیٹھ کی دو کھوں مدھے والی بات کا جواب نہیں دیا ہے۔“

اکرم نے کہا : ”پڑھ کے نہ جواب دے دیا ہے۔ میں اس سے بہتر جواب نہیں دے سکتا لیکن میں ایک سوال ضرور سیٹھ سے پوچھنا چاہوں گا۔ یہ جوا کھوں مدھے بیٹھنے لکھے تھے میں کیا یہ آسمان سے اتارے گئے ہیں ؟ کیا سیٹھ نے کوئی عمل کھول رکھی ہے ؟ کہاں سے آئے ہیں ؟ آخر کسی نے محنت کی ہو گی کسی نے کسیت میں ہی بدایا ہو گا۔ کسی نے گھر خانے میں کھڑا بنا ہو گا۔ کسی نے بیٹے میں لٹس لٹائی ہو گی۔ کسی نے دفتر میں صبح سے شام تک کام کیا ہو گا اور پھر دس دس آنے کر کے نیوا گنٹ خریدا ہو گا۔ کیا یہ صحیح ہے کہ پبلک کا آٹھ گھنٹوں مدھیہ ایک آدمی کی تمدنی میں آکے بند ہو جائے۔ ایک لاکھ آدمی بھر کے رہیں اور ایک آدمی کے پاس ایک لاکھ مدھیہ لکھا ہو جائے۔ میڈم کیا آپ نہیں دیکھ سکتیں کہ سیٹھ اس نے جنگ

پاتے میں جاگڑا مامے ٹانھ لے کے اکھوں آدمیوں کی دھڑکی کی ایک لڑکیٹ کر کہیں
 میڈم بولی " تو تم لانتے ہر کو سیڑ کو جنگل نے فائدہ پہنچایا ہے "
 " ہاں ! " اکرم نے اقرار کیا ۔

میڈم فتح خندانہ بچے میں بولی " قلاؤ۔ میرے دستخط دلو۔ میں نے اس وقت دی کے رش میں
 دستخط کر کے تھے۔ میرا دبیان پتروں میں تھا۔ "

اکرم نے میڈم کے دستخط پر سیاہی کی کیر میری پیراس نے میز پر پٹھے ہوئے دوسرے لوگوں سے
 سکرانے کہا " اس کوئی اپنا دستخط واپس لینا چاہتا ہے "
 کوئی نہیں بولا ۔

اکرم نے ساخنہ کر کے صیب میں رکھ لیا۔ پھر سیڑ کی طرف درجہ کے بولا " میڈم میں پھر آؤں گا تہا سے پاس
 کہوں کہ مجھے یقین ہے کہ تم میرے ساخنہ پر دستخط کرو گے "
 " کیوں ؟ "

" کیوں کہ مجھے یقین ہے کہ یہ وہ ساخنہ کا کھلا ہے جو امیر اور غریب۔ نیک اور بد فرشتے اور شیطان
 دونوں کو اپنی زندگی گزارنے۔ اپنی قسمت آزانے اور اپنے اپنے انجام تک پہنچنے کا موقع دیتا ہے۔ جس طرح
 کامی اور انجام ہو۔ اس سے بھی غرض نہیں۔ لیکن جو جنگل سامنے نظر آ رہی ہے۔ اور جیسے دکائی ہے وہ
 امیر اور غریب۔ نیک اور بد فرشتے اور شیطان میں کوئی امتیاز نظر نہیں رکھے گی۔ ہم سب قریب آئیں گے۔ مجھے
 س بات کامی یقین ہے کہ اگلی جنگ میں تم اکھوں بھی کاٹ سکو گے۔ جگر پھل دھڑکوں میں جو اکھوں تم نے کٹائے
 ہیں وہ بھی ہاتھ سے کھود گے۔ یا کہ وہ اس کی ہیر و شیا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا ہوا مارچ کہ مرے ہوئے۔ کوئی
 نہیں کہہ سکتا سیڑ۔ ایک دن یہ سبھی بھی انسا کی پیر و شیا سے ڈال دیے جانے۔ ایک ہمارے تہا دی ساری
 بڑھیں اور سارے شہزادوں ایک لمحے میں ختم ! "

”اللہ ان کے ساتھ رحم بھی“

”اس نے میں تم سے کہتا ہوں سیٹھ۔ میں پھر آؤں گا۔ اور پھر آؤں گا۔ کیوں کہ اس جیل پر مجھے تھامے ایسے جو، بد معاش، ایک مار کئے اور تنگ کے بھی دستخط نظر میں“

باکڑیا نے ہنستے ہوئے سیٹھ بگت لال کو کہنی مار کے کہا ”ہنستے ہو۔ سلا بجے کیسے کیسے غلاب سے نوازنا ہے۔ بس ایک اس کو میں نے چھوٹ دے رکھی ہے“

”کیوں“ سیٹھ بگت لال نے آندوہ ہو کے پوچھا۔

”مسلم نہیں کیوں؟ شاید کبھی کبھی دوسرے کے سونہ سے اپنے متعلق کچھ سنا اچھا مسلم ہوتا ہے“

”باکڑیا نے اقرار کیا اور پھر اس نے نوا کر جاتے ہوئے اکرم کو آواز دے کے کہا ”اکرم! دھڑاکم بہت شاید تو ٹھیک کہتا ہے۔ اگلی جنگ میں کچھ نہیں بچے گا میرے بھائی۔ جانا کہاں دستخط کروں؟“

جب اکرم کا غریب میں ڈال کے باہر کی طرف چلا تو خشنا نے راج کے کمان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا ”اے مجھے بڑا چھانگتا ہے یہ اکرم جب بات کرنا تھا تو کیسے معصوم بھولا سا لگا رہا تھا اسکا پتلا پیلا بالکل کسی آئرش پوڈل کی طرح — آئرش کتے کیسے بہت پیارے لگتے ہیں نا!“

راج نے دے لے لے لے لے میں اسے جواب دیا ”کہو تو اسے پیغام بھیج دوں کہ تم کسی کو بہت پیارے مسلم ہوتے ہو“

خشنا نے آہ بھر کے کہا ”بھئی۔ بانی۔ وہ اس مشرت کے واقعے کے بعد دلاوی اماں بہت محتاط ہو گئی ہیں۔ میرا خیال ہے میں ایک آئرش پوڈل ہی خرید لوں گی“

مرد جب اکرم ہال سے باہر آیا تو اسے ڈھونڈتا ہوا دروازے کے پیچھے کھڑا کھڑا یہ سب تنگوشی رہا تھا اس نے بڑی جبر سے اکرم کی طرف دیکھ کے کہا ”تم نے اسے ایسی کھری کھری سنائی کہ میرا تو خیال تھا، وہ تمہیں کھڑے کھڑے کھلا دے گا“

اکرم نے کہا: ”اگر میں اے کمری کمری زُشنا تو وہ کبھی دستخط نہ کرتا۔ میں اے خوب جانتا ہوں۔“
 ستیا رائے نے اس کی پیڑ پر چھکی دے کے کہا: ”واہ اے میرے شیر، جھنڈے گاڑ دے تو نے
 آج۔ تو نے جھنڈا ہالیسے اٹھایا اور ایشیا پر گاڑ دیا۔ کیسے تو نے اس سیٹھ کو روکا، باندھا، تانا بکینا اور
 ہمرکینج کے ہموڑ دیا کہ جاڑ بیٹا نکلے رہو۔“

من بیت سنگھ نے پوچھا: ”اچھا اب کہاں چلیں گے؟“
 اکرم نے کہا: ”قرب ہی راج محل ملو ڈیو ہے۔ دیکھیں وہاں اگر کسی کی شوٹنگ ہو رہی ہوگی تو
 دستخط کرالیں گے۔“

اکرم جس وقت راج محل سٹوڈیو میں اپنے ساتھیوں کو لے کر پہنچا، اُس وقت جوشی جی کی کچر کی ٹرنگ بھڑکی تھی۔ مگر اُس وقت اتفاق سے ٹرنگ بند تھی۔ کیوں کہ جوشی جی اللہ سوڈیش پرانچے ایک لائٹ میں کے درمیان جھکڑا چل رہا تھا۔ بڑی معمولی سی بات تھی۔ جوشی جی نے سیٹ پر ایک ناچنے والی لڑکی روفی کا بوسہ لے لیا تھا اور اس قسم کی چھوٹی موٹی حرکتیں سٹوڈیو میں اکثر ہو جایا کرتی تھیں اللہ لوگ عام طور سے اس طرف سے آنکھ بند کر کے کام کرتے تھے مگر آج سوڈیش پرانچے بگڑ بیٹھا تھا۔ ایک معمولی لائٹ میں تھا۔ روفی کا عاشق بھی نہ تھا۔ پھر اُسے نیچے میں بولنے کا کیا حق تھا۔

جوشی جی برہم ہو رہے تھے ”سلاؤ دنگے کا آدمی۔ ہم پر رباب کرتا ہے“ جوشی جی نے بھیتا زبان میں کہا۔

سوڈیش پرانچے نے کہا ”سلاؤ دنگے کا ہر پادریکے کام کا اس سے کیا۔ ہم تم کو بتا رہے۔ تم ناگزیر رہے۔ آؤ سیٹ پر شرف سے کام کرو۔ سلاؤ دنگے کوئی ہان پل کا کرتا نہیں ہے۔“

”یہ روفی تمہاری ماں گنتی ہے؟“ جوشی جی نے غصے سے پوچھا۔

سوڈیش پرانچے بولا ”یہ نہ ہماری ماں ہے۔ نہ بہن نہ دوست۔ ہماری کچر بھی نہیں ہے۔ کچر کی عورت

تو ہے۔ موت کی جنت کتنا سنگنا ہم کو۔

”بڑا آیا قریح کرنے والا۔ سارے گریہ جیسے بوسہ دیتی ہے توڑنے میں بڑم مارنے والا کون ہوتا ہے۔“
 ”سوال مری کا نہیں ہے۔ سوال سوال کا ہے؟ کل کو یہ قہارے ماسٹریٹ پر سونے کے تے تیار
 ہو جانے لگی تھیں ہم اس کی اجازت دیں گے؟ کبھی نہیں۔“ سوڈیش پرائیجے نے بڑی مضبوطی سے اشار
 میں سر ہلایا۔

”تم کون ہوتے ہو حکم دینے والے؟“ جوشی جی نے اپنی ٹھوڑی آگے بڑھا کر رہا۔ اس کی نیوٹے
 کی سی آنکھوں میں غصے کی ہری دھند گئیں۔ ”میں اس سیٹ کا ڈائریکٹر ہوں جو پاہوں کر سکتا ہوں، جیسے پاہوں
 کان سے پکڑ کر باہر نکال سکتا ہوں۔ گٹ آؤٹ ٹو بیڈی سوانن!“ جوشی جی نے انگریزی میں کہا۔
 ”یو بیڈی ڈنگ!“ سوڈیش پرائیجے نے بھی اسی جیسے میں رنگ بترکی جواب دیا۔

جوشی جی امدان کا اسٹنٹ ہٹا پلیر اور دوسرے رنگ حیرت میں رہ گئے۔ ایک لائنٹ بین انگریزی
 بول رہا تھا ان کے بار کی انگریزی۔ جوشی جی نے ایک نئی نظر سے سوڈیش پرائیجے کی طرف دیکھا۔ سوڈیش پرائیجے
 ایک ننگی نیکر خاکی قمیض پہنے اپنی جگہ پر غاصحش کھڑا تھا۔ اگر نہ اس کی گھنی سموزوں کے نیچے کی مٹھی آنکھوں
 کو دیکھا۔ اُس کے اُچھے ہوئے موٹھی رخساروں کے نیچے کے مضبوط جڑے کو دیکھا۔ گردن کے نیچے کے مضبوط
 صفائی جنم کو دیکھا۔ سوڈیش پرائیجے کا رنگ کھڑا ہو گا نڈی تھا جواب غصے سے گرا سر نہ ہٹا تھا۔ مگر کرم دیکھو رہا
 تھا کہ سوڈیش اپنے آپ پر تار پانے کی بہت کوشش کر رہا تھا۔

جوشی جی بولے ”میں بلور ایک ڈائریکٹر کے نہیں حکم دیتا ہوں۔ سیٹ سے باہر چلے جاؤ۔“

سوڈیش پرائیجے ایک لمبے کے تے رہا۔ پورے گروم کر سینے سے باہر نکلیا۔

جوشی جی نے کیو میں سے کہا ”وائٹ ٹکس کو جلدی سے۔“

کیو میں نڈ سے چٹایا۔ وہ سولہ ادھر لڑا۔ بے بی اور کمر کا تو۔ جانتے ہیں وہاں ٹکس کو۔“

مگر کسی لائٹ میں نے کرومین کی ہدایات پر عمل نہیں کیا اور سب لوگ سر جھکائے دشتیوں کے پاس سے کھٹک آنے اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے سیٹ کے باہر چلے گئے۔ شوٹنگ بند ہو گئی۔

رضیہ اور رضیہ، رضی، سلوچا، ماریا، ولزبا اور دوسری نانچنے والی لڑکیاں اور ان کا استاد ابراہام سب حیرت سے کٹھڑے کے کٹھڑے رہ گئے۔ ————— بجایک رضیہ کو معلوم ہوا کہ شوٹاری میں مرکزی فرد خود ڈاکٹر کٹر نہیں ہوتا ہے۔ ایک معمولی لائٹ میں ہوتا ہے جو دن رات شوٹاری کی دشتیاں اور حرے اور ابراہام حرے اور حرے جاتا ہے۔ وہ اگر چاہے تو ایک منٹ میں شوٹاری بند کر سکتا ہے۔

دوسرے خود مزدور تھا اس نے آئے اس واقعے میں بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی۔ ————— ملے جبر ایک کے باہر جہاں سولشیں پانچپہلے اور دوسرے اس کے لائٹ میں ساتھی کٹھڑے تھے، خود اپنا قاتل کرانے کے لئے پہلا گیا اور ان سب سے باتیں تفصیل سے پوچھنے لگا۔

سولشیں پانچپہلے کہنے لگا: "ایک تو قریباً ایک چھار نہیں مٹی ہے۔ دوسرے ہم لوگ ان کی رنڈی جہی بھی رکھیں۔ نہیں چلیگا!" سولشیں پانچپہلے نے بڑی مضبوطی سے سر ہلایا۔ "ہم کو ان کی پرائیویٹ لائف سے کوئی گرت نہیں ہے۔ مگر یہ اور سیٹ پر آم کراپی پرائیویٹ لائف نہیں دکھائی گئے۔ نہیں چلیگا" اس نے پرائیویٹ سے سر ہلایا۔

"سارہ بکٹ!" دوسرا لائٹ میں ہوا۔ "میں مائے کا سر تو قہر دتا، بڑا آیا کہیں کا ڈاکٹر کٹر" سولشیں نری سے ہوا۔ "سر قہر نے سے کام نہیں چلیگا۔ سیٹ پر یہ گندہ، زحمتا بند ہونا چاہئے۔ میں آ!"

دوسرے نے پوچھا "کیا تمہاری یونین ہے؟" "ہاں" دوسرا لائٹ میں ہوا۔ "آگیا۔ جی کی یونین ہے۔ پہلا سولشیں اشس کا داس پرائیویٹ ہے۔"

دوسرے انٹ میں نے بڑے فخر سے سودیش کی طرٹ دیکھ کے کہا۔ اکرم نے سودیش سے ہاتھ ہٹا دیا۔
 ”تم نے بہت اچھا کام کیا۔ ان لڑکیوں کی بہت بڑی حالت تھی۔“
 سودیش ذرا سا سکڑا دیا۔

لٹنے میں ان لوگوں نے دیکھا کہ کرنے کے ایک اپ درم سے بہت سی لڑکیاں بچھیں اور دوسرے
 دوسرے ان کی طرٹ آئی تھیں۔ ہر مرد لڑکیوں کو کھڑے تھے۔ بہت سی لڑکیاں جواب سمجھ کر رہی تھیں اور ایک
 دوسرے کو فہرہ کا دے کے آگے چلنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ یا ایک دوسرے کے پیچھے ہو کے ہنسنے کی کوشش
 کر رہی تھیں۔ جیسے لڑکیاں ایسے موقعوں پر اکثر کیا کرتی ہیں۔ رضیاء رضیہ ان سب میں گئے تھیں۔ رضیہ
 بولی ”آپ نے اس وقت بہت اچھا کیا۔“

رضیہ بولی ”آپ ہمارے لئے کھڑے ہو گئے ملا کر ہیں خود یہ لڑائی لڑائی چاہئے تھی میں تو ان لڑکیوں
 کو دکھ بھاتی مہل گرا ہی ہرمل ہیں۔!“

معدی محبوب ہی ایک کرنے میں لکڑی تھی اب وہ ہت کر کے آگے آئی۔ اس نے سودیش سے ہاتھ ہٹا دیا
 مگر کچھ کہا نہیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

سودیش نے کہا ”تم جاری رہیں ہر جاری ہی طرٹ منہ ہو۔ ہماری ہی طرٹ دلہنات خزا پسینہ
 ایک کر کے نکھارینے والے اچوں میں کام کر کے اپنی مدلی کاتی ہو اس کا اوپر سے اگر کوئی تہا رہی ہے جتنی کہے
 تو تم کو خود مس کرنا چاہئے۔ ایسا بھی کیا؟“ سودیش کے لہجے میں بڑی شکایت تھی۔

رضیہ نے اس کے بازو کو ہٹو کا سے کہا ”اب کے ایسا ہی ہوگا۔ ہماری آنکھیں کل گئی ہیں۔ ہم
 نے دیکھ دیا کہ اکیلی اکیلی الگ رہنے سے دوسروں کی شرارت پر مجبور کرنے سے کچھ نہ ہوگا۔ ہم نے ابھی
 میک آپ نام میں اپنی یونین بنائی ہے اور رضیہ کو اپنا سرٹری بھی بن دیا ہے۔ اور اب ہم میاں کوئی ایسی شرارت
 ہوگ سب کی سب کھانڈ کر جائیں گی۔“

”بس!“

سوریش مسکرانے لگا۔ اس نے رضیہ سے کہا ”جس سٹوڈیو میں تم سے کوئی گلا بڑھ کرنے کی کوشش کرے، مجھ سے کہو۔ وہاں کے کسی بھی لائٹ مین سے کہو۔ سالے ہم سٹوڈیو میں پڑتال کرادیں گے مگر یہ بد ساشی نہیں چنے دیں گے! نہیں چلیگا! کتم!!“

اکرم کو سوریش کا ”کتم“ بہت پسند آیا۔ اس نے سوریش سے پوچھا ”تم کہاں رہتے ہو؟“
 ”ہم کاندے کی جھونپڑیوں میں۔ سوریش نے اسے بتایا۔

”پڑے کئے سلوم ہوتے ہو۔“

سوریش پُپ ہوا۔

اس کے ایک ساتھی نے ٹوٹے فخر سے اکرم کو بتایا ”ہلا سوریش بڑی تک پڑ ملے ہے۔“

اتنے میں رضیہ نے کہا ”ہلو لڑکیو بیک آپ! درد۔ مگر میں۔ توڑے دوسے میں یہ خبر دارے سٹوڈیو میں پہیل گئی کہ صرف لائٹ مینوں نے بلکہ ناچنے والی لڑکیوں نے بھی پڑتال کر دی ہے۔ جوشی جی کا اسٹنڈ بننا چاہیہ دوتہ تادوتہ! ان کے پاس آیا۔ اپنے ہوئے ہوا۔“ رضیہ ہائی۔ رضیہ ہائی۔ کیا گب کر ہی ہو۔ سیٹ کا پڑا ہے۔ آج ہم ختم۔ ہوا تو میرا گونا پڑے گا۔ دس بجنا کارفتان ہو جائے گا۔“

”ہم سے کیا کہتے ہو۔ اپنے اس باڈی مائی بے جوشی گئے کہو۔ آپ کو ہلدی لڑکی کو پیڑا تھا۔“

”رضیہ ہائی۔ آپ کی جانے دو۔ جوشی دل میں بہت شرمندہ ہیں۔“

رضیہ نے اپنی ہچکیاں نہاتے ہوئے کہا ”دل میں شرمندہ، جو نے سے کلام نہیں چلے گا۔ سب کے سامنے سمانی اٹھنی پڑے گی۔ سیٹ پر جتنے آدمی موجود تھے جن کے سامنے جوشی جی نے یہ بڑی حرکت کی ان سب کے سامنے انہیں روزی کے پاؤں چھو کر سمانی اٹھنی پڑے گی۔ باز اپنے نارنگڑے کہو دو۔“

بننا چاہو مرنہ ملاکے ہوئے جوشی جی کے پاس چلا گیا۔ ان کے ہانے کے بعد لڑکیوں نے نصے

تالی بجائی جو اپنی نئی ملاقات کو محسوس کر کے بہت خوش تھیں۔ بچوں کی طرح شروع اندیشی سے سمجھنے لگی تھیں۔
تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے تالی بجا بجا کر گانا ادا کرنا شروع کیا۔ شیخ خیر ایک کے لہان میں سامے لائٹ مین
اندھ دوسرے بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ سلام ہوتا تھا سٹوڈنٹس میں سٹرائیک نہیں ملے ہے
کوئی ایک گھنٹے کے بعد بیٹا چارو ٹرا بنجید، سامونہر بنائے اس محلے کے قریب آیا "اندھ چلے۔ جوشی
جی سامانی اچھنے کے لئے تیار ہیں۔"

محلے میں جوشی کے گھر سے بلند جوتے۔ ٹریاں نکالیں اچھلیں۔ لڑکیوں نے ناچ کا آخری پھرنڈ سے
ختم کیا۔ پھر سب لوگ اندھ سیٹ کی طرف بھاگے۔

اندھ سیٹ پر جوشی جی گرٹ پر گرٹ پڑ رہے تھے۔ ان کے قریب کیرو مین اور اس کا اسسٹنٹ
کھڑے تھے۔ اندھا بھل ڈانس اسٹرا، تمام لائٹ مین اندھا چنے والی لڑکیاں اندھ دوسرے بھی کئی تماشائی اندھ
آگئے اور سب فائوش سے کھڑے ہو گئے۔ دیکھیں اب جوشی جی کیا کرتے ہیں جوشی جی کی جھوٹی تہی بڑی تھیں
ان کے ماتھے پر پینے کے قطرے خود بہہ گئے تھے۔ انہوں نے گرٹ کو زندہ سے فرش پر پھینک کر اُسے زہر
سے اپنے جوتے سے شل دیا۔ وہاں کمال کر اپنے ماتھے سے پینہ صاف کیا۔ پھر کہا "اے میری غلطی تھی۔
مجھے صاف کر دیا جائے" پھر وہ بیک آگے بڑھے اور انہوں نے روزی کے پاؤں چھوئے "اب زندگی
بہتر کبھی ایسی حرکت نہیں کریں گا"

جوشی جی کی آواز پر غصہ نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ سوزش کی طرف مڑا اور اس
نے کہا "میں نے تمہیں گالی دی۔ اور میں نے تمہیں"۔ سوزش نے انہوں کا انکار کرتے ہوئے کہا "باتو
حاذ" جوشی جی نے اتنا آگے بڑھایا۔ سوزش نے بڑی مضبوطی سے مصافحہ کیا۔ سارے سیٹ پر تالیوں
کی گونج نائی دے گئی۔

کیرو مین نے چلا کے کہا: "اے! وہ رائیل اور حاذو۔ اُس پچھڑے پر بھانڈو پڑا۔ وہ وہ سپاٹ

کہہ رہے!

لائٹ مین روشنیاں ادا کرے اور مرے جانے لگے۔ سائنڈ نے ناچ کے گیت سنا دیے۔

شروع کیا۔

وکیاں پاؤں سے تل اپنے گیس۔

کام شروع ہو گیا۔

شوٹو لیسے باہر کے تیرے نے اتھا اور نکا کر کے زور سے چٹکے کہا "جینڈا لاڑو یا۔ ہمارے

دشمن کی استروں نے۔ ہالیوے اٹھا یا اور یا پر جینڈا لاڑو!"

"آٹا شہرہ کرو۔ اکرم نے جینڈہ مدھو کے تیرے رائے سے کہا۔ "تم نہیں جانتے آج ہمساری

انڈسٹری میں کتنی عظیم تحریک نے جنم لیا ہے۔"

یہ ایک اکرم کو رزائی یاد آئے وہ جہانستان چلے گئے تھے۔ ان کی سب باتیں۔ ان کی ٹھنک۔

گھبراہٹ۔ تاریکی۔ خداس کا اقصوں میں سرخچ کے بیٹے ہانا۔ راستہ ہاں ہے۔ یہ ایک اکرم کے

دل میں بہت سی باتیں سامنے ہو گئیں۔ اب اسے یہ ایک معلوم ہو گیا کہ راستہ کدھر سے جاتا ہے۔ پہلے اس کا

خیال تھا کہ راستہ شاید شاتادرام۔ محبوب۔ کادور۔ مگر جی۔ اور ایسے بڑے بڑے لوگ اُسے بتائیں گے۔

یہ ایک اسے معلوم ہو گیا کہ یہ راستہ تو نظم کے بہت معمولی افراد کے دلوں اور ذہن نگہوں سے ہو کے گزرتا ہے۔ ایک

لائٹ مین۔ ایک تلپنے والی۔ ایک نظم ایکسٹرا۔ جھانکے پر کھڑا ہوا چپڑسی۔

زور سے فاس سے کہا "یہ فضا میں ہے۔ یہ فضا میں ہے!"

ہمیا؟ "اکرم نے پوچھا۔

"یہ سب کچھ جو ہوتا ہے کس نے انہیں بتایا تھا؟ ہم لوگ تو الگ الگ ان سے رہے۔

کبھی ان لوگوں سے بات بھی نہیں کی۔ مقرر ہی نہیں بنا۔ مگر یہ تو فضا میں ہے۔ تم اس طرح کے خیال

کہنے والوں کو قید کر سکتے ہو۔ اس پوری فضا کو، بڑا کو کیسے قید کر دے؟“ پچھتے ہوئے فولاد کی بجلی سی جھلک
 دھوے کی آنکھوں میں تھی۔

پیدل چلتے ہوئے وہ لوگ ابجا بیت ڈونڈ گئے ہوں گے کہ ایک ٹکی ان کے قریب آ کے رکے۔
 اور کسی نسوانی آواز نے کہا "سٹراکرم!" اکرم نے سر اٹھا کر دیکھا۔ رضیہ اس سے مخاطب ہوئی "سٹراکرم! رضیہ
 بول "ولایت یکم کو آپ جانتے ہوں گے۔ وہ آپ کی پھر میں کام کر رہی تھی وہ شہر کے آپسٹل میں بہت بُری
 حالت میں بیمار پڑی ہے۔ اُسے دیکھنے چئے؟"

اکرم نے ٹکی کے اندر جھانکا۔ پیچھے کی سیٹ پر رضیہ کے ساتھ رضیہ احمدی بیٹھی تھیں۔ اکرم
 نے اپنے ساتھیوں سے اجازت مانگی اور پٹ کول کر آگے کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔
 ٹکی چل دی!

اکرم نے فخر کے پر مچا "کیا ہوا تھا اُسے؟"

ٹکیوں نے شرم سے سونہ پھیر دیا۔ کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اکرم کچھ تو بھر گیا۔ پھر اس کے ذہن
 میں ولایت یکم کے اس کی آخری ملاقات اُبھر آئی۔ اس اس نے انہیں وہ دعوہ سنایا۔ کس طرح وہ عشرت
 کی انہں کے پیچھے رہ پے مئی آئندہ کرنے کے لئے آئی تھی۔ عشرت کا ہم سننے ہی اکرم نے دیکھا کہ رضیہ زنا
 ہوئی۔ پھر اس کا رنگ فق ہو گیا۔ گردہ کچھ بھونکا۔ اُسے یہ بات عجیب کی معلوم ہوئی مگر اُس نے اس کی بات
 نہ مانا تو ہم نہیں دی۔

رندی بولی "وہ دل کی بڑی نیک ہے۔ مگر! —" رندی چپ ہو گئی۔

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر رندی بولی "آپ آج کل کوئی پتھر نہیں بنا رہے ہیں؟" سب جانتی تھی پھر بھی اُس نے یہ سوال پوچھا۔

"نہیں"

"کیوں؟"

"وہ جن لوگوں کے ہاتھ میں خسیاں ہیں۔ وہ مجھے میری مرضی کا موضوع نہیں بننے دیتے۔

اس نے "— اکرم نے جنس کر کہا" اس نے ب میں دھند پوسٹ آفس کے باہر غلط فہمی کر کہاں " رندی نے حیرت سے پوچھا "آپ خوش ہیں اپنے اس نئے کام سے؟" "اتنا ہی خوش جتنا کہ ان حالات میں خوش رہ سکتا ہے"

رندی بڑی حیرت سے اکرم کی طرف دیکھنے لگی۔ مگر کچھ بولی نہیں۔ اس کے بھرے ہوئے پیٹ پر ہنٹ دھنکی اس قدر خوب صورت تھے کہ کسی بھی مرد کو بوسے کے لئے پاگل کر سکتے تھے۔ اکرم نے سر ہوا پر رندی کی بڑی بڑی مدھن آنکھوں میں کتنی ٹھکی ہے۔ جیسے آدمی جولانی کی تپتی ہوئی نوکر چھوڑ کر کسی صدفے چشمے کے کنارے آ بیٹھے۔

باقی رستے میں خاموشی رہی۔ مگر اکرم نے محسوس کیا جیسے رندی بار بار اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔

ہسپتال میں ولایت یگم کے کمرے کے باہر ایک بیچ پر بے بے۔ ابابلا الدین۔ اور شفیق بیٹے تھے۔ ہر پٹان حال چکے ہوئے مردہ اور اُماں۔ گرائن میں عشرت کہیں نظر نہ آیا۔ اکرم کو بڑی حیرت ہوئی مگر بعد میں اُسے شفیق سے معلوم ہوا کہ ولایت یگم کے ہسپتال میں داخل ہوتے ہی ان لوگوں نے عشرت کو گھر سے نکال دیا تھا۔ مگر پھر بھی، اکرم نے سر ہوا، عشرت کو یہاں آہوا جئے تھا۔

ٹھوڑی دیر تک وہ سب لوگ باہر کھڑے رہے بے امان کے دھچکھڑکے لوگوں نے باتیں کرتے رہے اور ولایت عجیب کی صحت کے بارے میں بات چیتے رہے اور اٹھاپانچ سوں کرتے رہے پھر یہ ہسپتال دھوپ کی طرف سے کمرے کے اندر جانے کی اجازت نہ گئی تو نرس کے اشارے پر وہ سب لوگ ایک ایک کر کے آہستہ آہستہ اندر چلے گئے۔ . . .

ایک اونچے سفید جراثق بستر پر ولایت عجیب بے ہوش پڑی تھی۔ اس کی آنکھوں کے نیچے گہرے سننے تھے۔ اور اس کے رخسار نیلے تھے۔ اُسے ابھی ابھی سسکیں دہی جا چکی تھیں۔ لیکن اس کا سونہرہ زرد سے اندر کو پگھلا ہوا تھا، اور ناک کے تھنوں سے اندر ماس کی تلی تک ماس میں ناک تک تک کڑکڑاؤں گزرتی ہوئی چل رہی تھی جیسے ماس کے رستے میں کسی نے بھاری بھاری چٹانیں گرادی ہوں۔ اور اب ماس ان چٹانوں کی طعاندوں میں سے ہوتی ہوئی گومتی ہوئی بڑی مصل سے ناک کے تھنوں سے خارج ہو رہی ہو۔

یہ جڑا بمیاک نظر تھا۔ ولایت عجیب کا وہ پھول کا سارنگ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ اس کے دونوں بازو منہ سے سیاہ اور مٹی ہوئی گڈڑیوں کی طرح اُس کے دونوں طرف سرانے پر بے حس و حرکت پڑے تھے۔ کبھی کبھی ان کی انگوٹھوں میں ایک خفیف سی لرزش پیدا ہوتی۔ وہاں بھیاں جیسے ٹٹلی میں بند ہوا چاہتی تھیں۔ وہ بازو جیسے سرانے سے اٹھ کے سینے کی طرف آنا چاہتے ہیں۔ دو تین بار ولایت عجیب کے بازوؤں میں ایک ٹپک ٹپک پیدا بھی ہوئی اس کے ہاتھ اپنی جگہ سے اٹھے اور سینے کی طرف چلے مگر نرس نے انہیں ہلاتے ہوئے پھر سرانے پر دھک دیا۔

ٹھوڑی سوجی ہوئی تھی۔ ٹھوڑی پراک بے ہوش جراثق خاصا بھونکا جو منہ میں ٹھونسنے کے نیچے کا جو منہ نظر آتا تھا اور اس پر زخم تھے۔ سب پرچی بندی ہوئی تھی کہ سب زخمیں اس سے تھیں اور ماس کڑکڑاؤں گزرتی تھیں۔ کبیس یلوں سے آتی ہوئی گھٹ گھٹ کر چل رہی تھی۔

ایک ولایت عجیب نے انہیں کھلی دیں۔ رفیعہ اور رفیعہ ذرا آگے کو بولیں۔ مگر ولایت عجیب تو صوف

چھت کو تک نہ تھی۔ وہ کسی کو پہچان نہ رہی تھی۔ وہ صرف چھت کو تک رہی تھی۔ اس کے ہونٹ ہلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ کہنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بہت ہی دیر دیر سے سرگوشی میں اس کے ہونٹوں سے آواز نکلی "میرا بچہ! میرا بچہ..."

رفیقہ کا دل کانپ گیا۔ وہ کتنے عرصے پہلے کی ایک رات میں کو گئی۔ جب وہ اور ولایت راج قہار کے گھر پہنچے تھے جب وہ عشرت کے لئے اس قدر اس قہار اور ولایت نے اسے بتایا تھا کہ اس طرح اس کا دل ایک بچے کے لئے تڑپتا ہے۔

وہ ہونٹ بند ہو گئے۔ وہ آنکھیں دھپک چھت کی سجا کر دیکھتی رہیں۔ جیسے کسی کو تلاش کر رہی ہوں۔ ایک ایک شدید جان کاہ کوشش کے بعد ولایت بیگم بستر سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ نرس چھت میں رہ گئی اس نے ولایت بیگم کو لایا چاہا مگر اس کے گلے ہوئے بازوؤں میں نہ جانے کہاں سے اس وقت طاقت آگئی تھی کہ اس نے اپنے بازوؤں سے نرس کو پرے کر دیا۔ وہ آنکھیں میڈی غلامیں دیکھ رہی تھیں۔ وہ ہاتھ تیزی سے اٹھے اور سینے کی طرف گئے۔ ولایت بیگم نے اپنے سینے پر دو جھڑا کر ڈالے۔ ہونٹ لگے سے چٹا کر کہا "رہا۔ کیا میں ہمیشہ آدمی صحت رہوں گی۔ کیا میری چھاتیوں میں بھی دودھ نہیں اُترے گا؟ رہا بڑا کیوں نہیں۔ ولایت بیگم نے بے چینی۔ اور اس کی آواز ایک نفی ابابیل کی طرح دائروں میں پڑ پڑاتی رہی گئی۔ پھر اس نے ایک بار دوبارہ نفسہ دے اپنے سینے پر دو جھڑا مارے اور پھر ایک وہ پیچھے کو بستر پر گر گئی۔ اس کے دونوں بازو بے جان ہو کر دائیں جانب گرے۔

نرس جلدی سے آگے بڑھی۔ مگر وہاں اب کوئی نہ تھا۔ ولایت بیگم کی دونوں آنکھیں بے نور اور بے جان تھیں۔
بزم جیل کی طرح

آخر نے اُسے لٹا ڈالا، اکرم نیکی میں سرچنے لگا۔ میرے پیارے خوبصورت خیریت ساج! تم نے ولایت بیگم کو پہلے تو ایک سیاہی پورس کی طرح استعمال کیا۔ پھر اُسے گندے توڑنے کی طرح بڑا۔ اور آخر میں ایک

خینا جھلائی جو کرست کے کڑے کرکٹ میں پھینک دیا۔ لیکن جب تک میری جان میں جان ہے اور میرے اتموں میں طاقت ہے اسی آنکھوں میں نمود ہے اور دماغ میں سرچ اور جو کی ایک رمت بھی موجود ہے میں فراقوں کا اس اندھی شیطنت، نعم اور غم، ناک بے انسانی کے ظلمات، ایک بار نہیں دس بار نہیں، میں دس لاکھ بار اپنے فزادری تئوں سے تہا ہے، اپنی جڑوں کے ظلمات بکڑکا تاں ہیں گا، تاکہ کبھی کسی وقت کسی طرح تو تہا ہے اندھے دماغ میں کہیں سے روشنی کی ایک کرن پہنچے، اے گندے، گندلوں نے، غیظ، عوام خود بخود کھسا چہرے کر چلنے والے سارے۔

کبھی وہ کپڑے اچختے تھے۔ کبھی ان کی تراش بھی اچھی تھی۔ مگر اس وقت وہ گندے بنے پکیلے
 سے دکائی دے رہے تھے۔ سینٹر جمیئر کی ٹال بہت دیر تک مشرت کے مرجائے ہوئے چہرے کی طرف غور سے
 دیکھتا رہا۔ مگر مشرت کی آنکھیں غبر سولی۔ یہ پردہ شہن تھیں اور سیلیاں بھی پھیلی ہوئی نظر آتی تھیں۔ رات بھر وہ بخار
 سے ٹوکتا رہا تھا۔ کتنی راتوں سے اسے بخار ہوتا تھا۔ پھٹکتا تھا۔ جسم کو جھلکانے والا بخار۔ بیکار سے
 ہو جاتا تھا۔ جسم کی ہڈی ہڈی لڑی ہوئی۔ ہمنوا پانی جگ سے ٹپک رہا تھا۔ اس کی پیاس کی شدت سے کانٹے۔ مشرت
 نے کانٹے کے ٹوٹے چھوئے مگر اس سے دو تین بارل سے پانی پیا۔ غصا، اندکتنی قہقہہ۔ ہے۔ پیٹ میں پانی کی
 ایک پوری تنگ چاہئے۔ ان دو تین گلاسوں سے کیا ہو گا۔ پانی پنی کر اس نے زندگی کا منظر اپنے محلے
 کے گرد بیٹھا۔ اتنے میں رنگ دینے بغیر تمام اندھا لیا۔ تمام کمالی پور کا شہر دوڑا تھا، اور بائیں دلواری دکھائی
 دیتا تھا۔ کوئی اسے دیکھ کر غلطی نہیں کا سکتا تھا۔ کوئی اسے کسی اعتبار سے کسی حیثیت سے شریف انسان نہیں سمجھ
 سکتا تھا۔ اس کی پوری زندگی، اس کا پیشہ، اس کے خصلت، اس کا کردار اس کے چہرے پر کھل ہوا تھا۔ تمام
 جہانگ کے ملک کی طرف سے کوسوں کا کرایہ وصول کرنا تھا۔ اور کوئی کچھ بھی کہے، ملک مکان کے انتخاب کی
 دادرینی پڑتی تھی جس قسم کے لوگ ان کوسوں میں رہتے تھے ان سے کرایہ وصول کرنا تمام ہی کا کام تھا۔ تمام
 اسے اس پاس کی تین بلڈ میچیں اپنے نئے لے رکھی تھیں۔

کیوں کہ قاسم نے اسے بتایا تھا کہ آدمی جرائم کی دنیا میں رہ کر اتنا ہوشیار نہیں ہوتا۔ پانچ سال تک آدمی باہر جرم کرتا رہے تو اسے اسی گڑ کا پتہ نہیں چلتا جب تک وہ جیل نہ جلتے۔ جیل کے اندر ہی وہ تمام سسار و دروزہ ایک ایک کر کے سمجھتے ہیں جن پر گناہوں کی دنیا پختی ہے۔ وہاں ایک سے ایک بڑا استاد ہوتا ہے، جس نے ساری زندگی کی ریاضت سے یہ فن حاصل کیا ہے۔ اس نے قاسم نے یہ اصول بنا رکھا تھا کہ جوں ہی کوئی نیا آدمی اس کی ٹولی میں شامل ہوتا، وہ اسے دو ایک ماہ میں جلد بگوارا دیتا، اور بتا دیتا کہ جیل میں ایک اور بات بھی تھی۔ جیل جا کے آدمی پھر اور مراد و معنی نہیں سوجھتا۔ وہ میں اور میری کا ہر جانا ہے۔ اس دنیا کے صدفانے اس کے لئے بند ہو جاتے ہیں اور اس دنیا کے نیچے جو دنیا بچی ہے اس کے صدفانے اس کے لئے کھل جاتے ہیں۔ ایک دفعہ جیل جا کے آدمی کی بے چین رُوح اطمینان حاصل کر لیتی ہے۔ اسے عرفان حاصل ہو جاتا ہے عرفان دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جو نئی اور پاکیزگی سے آتا ہے۔ اور جس کی معراج جنت ہے۔ دوسرا وہ جو بدی اور غلاطت میں ڈوب جاتے سے آتا ہے اور جس کی انتہا جہنم ہے۔ وہ لوگ جو شب و روز جہنم میں رہتے ہیں ان کے لئے آگ کے شعلے جھپڑوں کے ٹانگہ اور تپتے ہوئے لوہے کے داغ اور جلتے ہوئے گوشت کی بڑ کہہ سکتی نہیں رکھتی وہ تو درد مندی بات ہے۔ وہ لوگ جہنم سے اس طرح گزر جاتے ہیں جیسے جنتی ہنر کے کلا سے ٹپس رہے ہوں۔ کم از کم قاسم کو دیکھ کر اس کے سکون اطمینان اور اس کے ضمیر کی محنت بخشی کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا۔ ان چند سالوں میں عشرت کے ضمیر کی کمال بے حد موٹی، کھڑکی اور بے حس ہو گئی تھی۔ تو بھی کچھ باقی تھا، عشرت محسوس کرتا تھا کہ ابھی وہ وہاں تک نیچے نہیں اترا۔ جہاں تک اسے لگا، وہ عرفان حاصل کرنے کے لئے نیچے اترا چاہئے۔ اس ایک اصول ہی جھجک تھی۔ کہیں پر اس کے ضمیر کی موٹی کلا کے اندر کوئی چیز بھی تک زندہ تھی۔ حرکت کرتی تھی کبھی کبھی اسے پریشان کر دیتی تھی۔ وہ جب نیچے دیکھتا تو اسے گہرائی سے بڑا درد لگتا۔ جانے دُور نیچے اس سانپوں کے بل میں کیا ہو۔ نیچے جانے کی کشش بھی اس کے دل میں تھی کیونکہ اب اتنا نیچے آ چکا تھا کہ جب وہ اوپر دیکھتا تو زمین اُسے اتنی دُور اور بے نظارتی جیسے وہ کسی گہرے کنوئیں میں

گر چہ ہو۔

عشرت دومین بار آہستہ سے کانا، پیسنے کے ترڑے اُس کے اُتھے سے چھوٹنے لگے۔
عشرت نے بیب میں مدال مٹوا، مدال کہیں نہ ملا، اس نے کٹ کے آستین سے اُتھے کا پسینہ پونچھ لیا۔
اس حرکت سے اس کے نذد، مدالوں پر سرخی چھا گئی۔

سینہ چیدی الال برے "آخری مرتبہ میں نے تمہیں راج کے ہاں ایک پارٹی میں دیکھا تھا۔
بہت عرصہ ہو گیا۔"

عشرت خاموش رہا۔

"تم بہت چل گئے ہو"

عشرت پھر بھی خاموش رہا۔

اُن دنوں راج نے تمہاری سفارش کی تھی کہ تمہیں میں اپنی تصویر میں بیروے لوں مگر کسی نہ کسی بہرے
سے وہ بیل منٹھے نہ چڑھ سکی۔

عشرت کانا۔

"یہ کانسٹی بہت بڑی ہوتی ہے۔ بچ کر"

عشرت نے کیا "بجے کام چاہئے"

"بجے سلاہ ہے" چیدی الال نے بناؤنی ہمدلی سے کہا "مگر مصیبت یہ ہے کہ میری دونوں
تصویری ختم ہو رہی ہیں اُن میں تو کوئی کام نہیں ہے۔ پھر بھی ان تصویروں کے ختم ہونے کا اثریت کرنے، سنسکر کو
دکانے اور نئی تصویر شروع کرنے میں چاہا، تو ضرور تھیں گے"

عشرت نے مذکر کرتے ہوئے کہا "بجے آج کام چاہئے"

چیدی الال ہنسا کہہ نہیں سکتا، تم وہ کام کر گئے ہیں، تم بیرونا چاہتے تھے نا؟ چیدی الال

نے چٹکی بھاگے اپنے جتنے ہوئے گھٹ کر دکھانے میں گر جاتے ہوئے کہا "میں نہیں ہیرو بن سکتا ہوں
عشرت حیرت سے اس کا طوطا دیکھنے لگا۔ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ یہ سیٹر جمیدی اول نے جانے اُس
وقت راج کے کہنے پر مجھے ہیرو بنایا۔ آج خود بخود کسی منارٹ کے بغیر مجھے اس حالت میں ہیرو بنانے کے
لئے تیار ہے۔ عشرت کی ماضی تیز تیز پٹنے لگی اس کی آنکھوں میں ایک فیروزہ جگمگاتی۔ کیا رات ہی جمیدی
نے یہ کہا تھا۔ ایک لمحہ پہلے اس کے کان بج تو نہیں سہے تھے۔

جمیدی عشرت کی حیرت اور حیرت کا غار شی سے نطرت اٹھا آ رہا۔ پھر کہنے لگا "اس میں حیرت
کی کوئی بات نہیں۔ میں تمہیں اپنی نئی نظم ۲ ہیرو بنانے کے لئے تیار ہوں"
"اُس نظم کا نام کیا ہے؟"

"اسرارِ محبت۔ عشرت کو کاک کہانی"

جمیدی لال نے معنی فیروزہ ہوں سے عشرت کی طوطا دیکھا مگر عشرت کی جگہ میں کچھ نہ آیا۔

"اور ہیرو بن کر بن ہی رہی؟" عشرت نے پوچھا۔

"ماہ پارا"

"ماہ پارا۔ مگر وہ قراب تین چار سال سے کسی جگہ میں ہیرو بنی نہیں آئی"

"بیچے جاڑی ہے" جمیدی نے سر ہل کے کہا "میں جانتا ہوں کچھ کل اس کے پاس کوئی کام

نہیں ہے۔ مگر میں اسے جی یا نہیں دے رہا ہوں"

عشرت نے رک رک کر کہا "یہ — میں — یعنی کی — کیا ہوں — بیٹو۔ تم

آری نہیں فرشتے ہو"

جمیدی لال نے اپنی آنکھوں پر پھیل پھالتے ہوئے کہا "تم اپنے سامنے کسی فرشتے کو نہیں دیکھ رہے

ایک بزنس میں کوئی کچھ سہ ہے ہو"

عشرت نے سوائے کچھ ہوں سے سیز کی حرکت دیکھا۔ سیز نے چیدی وال نے مذاکے چمک کے کہا: یہ ایک بڑی غم پرگنہ۔
 ”بڑی غم پرگنہ؟“

”ہاں سب کچھ ہے! اگر کے کام کرنا پڑے گا۔ اور وہ کام جس طرح سے کہیں گا اسی طرح سے کرنا پڑے گا۔ پنڈت کو گا گا کوک شاستر زندہ کر دیا گا اس غم میں۔“

جیسے کچھ کی تعداد نے عشرت کو چھو لیا ہو۔ وہ چھو گا۔ اس نے نندے سے کہی کر اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ چند لمحوں کے لئے کڑی، سیز، آس پاس کی دیواریں، تصویریں، چہرے سب اس کی نظروں میں گھوم گئے۔ اگلے سیدھے ہو گئے۔ اُسے سست کا نانا بے صاف، دست کا جگہ کا کوئی احساس نہ ہوا۔ اپنے گھر میں کوئی چیز بھی نہیں ہوتی مگر اس کے حق میں کوئی غلاب نہ تھا۔ اُسے یہ احساس ہوا جیسے وہ اپنے ہونٹوں پر نہاں پھرتی چاہی مگر اس کے حق میں کوئی غلاب نہ تھا۔ اُسے یہ احساس ہوا جیسے وہ اپنے ہونٹوں پر نہاں نہیں کرتی۔ ٹوکھا سا برش پھیرا ہوا چپ کا صعب ہے کہ۔ کہ۔ کہ۔
 ”عشرت اپنا فقر و پرہیز کر گا۔“

”ہاں ہاں۔ باہل تنگی غم۔ اسے ان دوسری غموں میں کیا دکھا ہے۔ چارہ کو خرچ کر دے کوئی بھروسہ نہیں پاس ہو نہیں ہو۔ مگر جو غم کوئی نہیں ہوتی۔ اس میں سیز بھی کلاتے ہیں۔ کرٹش بھی۔
 ہاں اپنے کام شریف اور گا گا دیوی روڈ پر بہت سے اپنے بھائی بند ہیں جو پاخانے پاخانے ہزاروں ایک غم کا پرنت اٹھا کے جلتے ہیں۔ پھر دوسرے شہروں کے بڑے بڑے سیز ہیں۔ دولت مند لوگ ہیں۔ رہے ہالہ بے ترے چارے ختم ہو گئے۔ حدت جناب پکاس پکاس ہزاروں نے ایک دوسرے سے ایک بڑی غم کے پرنت دیا ہے۔ اب بھی پرانے عکسوں میں دس بارہ اپنے مستحق ملک تریں۔ میں تم سے کچھ کہتا ہوں عشرت۔
 جو غم یہاں سوا پرگنہ غم انڈیشی میں کہیں نہیں ہے۔ ادب تو سولی سولی لوگوں میں بھی اس کے ملک پیدا

ہر گئے ہیں۔ میں دالوں کو پر دیکھ کر غم کی پیش بردیتا ہوں۔ سارے کئی کئی لوگ دوسرے دوسرے گھومتے ہیں اور جہاں کوئی مخصوص جگہ دیکھی وہاں غم پلا کے دکھاتے ہیں۔ دوسرے میری کئی بڑی بھینس بیلوں کو لے کر گیا کرڈن جو دیاں مٹا چکی ہیں۔

”مگر؟“ حضرت کچھ کہنے والے تھ کہ چیدی دال نے اس کی بات سنا کے وہیں پرکھ دیا۔ اگر عطر کیا۔ بات تو یہی ہے جو دوسری خیلوں میں کی جاتی ہے۔ وہ لوگ اسے کپڑے پہنا کر دیکھ رہے ہیں چکر مارا عطر کے ڈانس۔ گیت اور مکالموں میں گھما پھرا کے کہتے ہیں دالیں ہزار فٹ میں کہتے ہیں۔ میں ایک ہزار فٹ میں یا دو ہزار فٹ میں کہتا ہوں۔ اور کپڑے آدھ کے ملان ملات کہتا ہوں کوئی ٹی بیٹھی نہیں۔ برو منظر ہے؟“

حضرت اپنی ٹھٹھکیا آواز میں اپنے ماتوں کے کٹنے کا بھروسہ نہ کرتے ہوئے بھٹن کی طرح دیکھا۔ پھر اس نے سینہ چیدی دال سے پوچھا ”اے ادا پادا؟“

چیدی دال ہنسا۔ ہلا ”تم کیا کہتے ہو۔ وہ بے چاری پچھلے تین چار سال سے جو بے کار ہے تو کیسے اب تک زندہ ہے۔ وہ برابر میری بڑی خیلوں میں کام کرتی ہے۔ اسے جاب نہیں ہے اس کے آرٹ کا۔“

”آرٹ؟“ حضرت نے اپنے دل ہی دل میں سوچا۔

چیدی دال نے اپنی غازی کی طرح دیکھ کر کہا ”جے تھوڑی دیر میں سینہ کتر بند کئے اس جاتا ہے۔ اگر تم کو منظرہ جو بول دیو۔ اپنا ایڈوانس بھی لے جاؤ۔ ایک ہزار دو سو روپے کا۔ پانچ دن کی ٹورنگ ہے۔ سو دو سو روپے ایڈوانس لے جاؤ۔ کل سے حاضر ہو جاؤ۔ ایک ہفتہ میرے ساتھ رہنا چاہا۔ جہاں جہاں بدھ لے جاؤں۔ تم بول نہیں سکتا۔ میں کسی کا سمجھ رہا نہیں کہ کتنا ہیں اس بات میں۔ تم کو ہمیں گھننے سے ساتھ رہنا چاہیے گا۔ سلاؤنٹ۔ تم۔ میں۔ ماہ پادا۔ کیرہ میں۔ اس کا اسٹریٹ سب لوگ اگلے رہیں گے۔

سات ملنگ کرتی آدمی اپنے گھر نہیں جاسکتا۔ کسی کو میری اجازت کے بغیر ٹیلی فون نہیں کر سکتا۔ خدا نہیں سکھاتا۔
 ملنگ ایک ہزار روپیہ پر دل کا۔ سو روپیہ ایڈوانس ابھی لے جاؤ۔ منظر ہے؟

عشرت نے ایڈوانس کے لئے اپنا کاپتا ہوا ہاتھ آگے بڑھایا۔ "منظر ہے"
 سیٹھ نے گھنٹی بجائی۔ ایک چڑھی اٹھ اٹھا۔ سیٹھ نے چڑھی کو کہا "خزانی کو اندر بچھ دو" "خزانی اندر لگا۔ سیٹھ
 نے کہا "عشرت کو ایک سو روپیہ ایڈوانس ملے دوں۔ بعد میں پرہیز خان لے لو"
 "کس مطلب میں؟"

"بچوں کی اخلاقی تربیت کی ڈاکٹر میٹری جو بن رہی ہے اس کے حساب میں"

جب خزانچی چلا گیا تو مشرت حیرت سے سیٹھ کا منہ دیکھنے لگا۔ سیٹھ نے ہنس کر کہا۔ ارے
 بھائی۔ غم نہ آتا ہوں۔ قیس پیسے دیتا ہوں تو اس کا کس مطلب بھی رکھوں گا کہ نہیں؟ سو آج کل ایک
 ڈاکٹر نیشنل مشورہ کر رہی ہے "بچوں کی اخلاقی تربیت"۔ دو ایک شلٹ اس میں لپی تیار ہے ہر باتیں گے
 مگر وہ کچھ گی نہیں۔ مگر فٹ قراچ کل اپنی ڈاکٹر میٹریاں بناتی ہے۔ وہ میری ڈاکٹر میٹری کہاں سے خریدے گی۔
 میں تو سبھی حساب رکھنے کے لئے کاٹ پیٹ کے کسی طرح وہ ڈاکٹر میٹری عقل کدوں کا۔ اور اس جو غم کا سلا
 خرم اُس پر ڈال دلا گا۔ ارے کیا کریں مشرت بھائی آج کل سیدھے دھندے کا نانا ہی نہیں رہا۔
 "بچوں کی اخلاقی تربیت۔"

"اس تربیت عورت کو کاکی کہانی"

عشرت جب چھیدی وال کے دفتر سے باہر نکلا تو ان دروزوں مٹانوں کا خشتہ مٹنر اس کے ذہن میں
 بیدار ہوا۔ مگر اس کی جیب میں سو کانوٹ بھی تھا اور اس سو کے نوٹ کا مطلب تھا۔ روٹی۔ کھول کھول
 لافیا۔ شراب اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ تمام کے پنجے بچ جائے گا۔ ایک ہزار
 روپیہ! ارے وہ اس میں سے ہانچ سو اپنی اناں کر نہیں گئے ہیں کچھ ملتا ہے۔

راج کو جب تمام اس کے پاس آیا تو عشرت نے مختصر روپے محال کھاے دے دیئے اپنے پاس مروت پھیں رکھے۔ تمام غلامین ہوا جب عشرت نے اسے بتایا کہ اسے ایک غم میں کام مل گیا ہے وہ بہت حیران ہوا۔ مگر کیا کر سکتا تھا۔ نوٹ لے کر خاموشی سے چلا گیا۔

عشرت نے اپنی منجلی چاب پاتی پر لیٹ کر اپنی بہن کا خط نہایت سیریں مرتب پڑھا۔

پیارے بیٹا !

تمہیں بھی گئے ہوئے یہ تیس سال جا رہا ہے۔ اتنی بہت پریشان رہتی ہیں۔ کیا تم کچھ کامیں گنج نہیں نوٹو گے؟ ایک بار میں اپنی ماں اور اپنی چھوٹی بہن اور بھائیوں کو دیکھنے کے لئے نہیں آؤ گے۔ یہاں میں نے سب سے کہہ رکھا ہے کہ تم غم میں ہیرہ کام کر رہے ہو۔ مگر تین سال سے اب تک تمہاری کوئی غم نہیں گنج میں نہیں آئی۔ اس لئے میری ہسٹیاں اب مجھ سے مذاق کرتی ہیں۔ وہ نہیں سمجھتی کہ تم واقعی کسی غم میں ہیرہ کام کر رہے ہو۔ کچھ بتا دینا۔ تم کس غم میں ہیرہ کام کر رہے ہو۔ وہ غم میں گنج میں کب آئے گی؟ تمہیں دیکھنے ہوتے آتا حوصلہ ہو گیا کہ اب اگر میں تمہیں غم میں دیکھوں تو دیکھتے ہی رو پڑوں گی۔ جلدی بنا۔ اچھے بیٹا۔ تمہاری غم کب ختم ہوگی۔ ہمارے رئیس گنج میں کب آئے گی؟ اس غم کا نام کیا ہے۔ میں اپنی ساری سیریں کر لے کر آئے دیکھنے باتوں گی۔ اور وہ جو خاں صاحب مگر عشرت آگے نہ بڑھ سکا۔ ایک زور کا کھوکھلا قبضہ اس کے ہونٹوں سے نکلا۔ عشرت۔ ہیرہ۔

ایک بر غم کا !

پھر یہ ایک آئینہ تیزی سے اس کی آنکھوں میں منڈا آئے اور اس نے اپنی بہن کے خط سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور جا رہا پائی پر اندھا ہو کے گر گیا اور سبک سبک کر رونے لگا۔

دوسرے دن شام کے وقت چٹے میں کمانی ہوا پولیس ہاؤس کے پیچھے پاروں کے تختوں میں سب کام اپنے ٹکڑوں سے ٹٹے صاحب نے دے دیا تھا اور قفس وصول کر رہا تھا۔ کسی نے اس کے شانے

ہوا تو رکھا۔ کام نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ یہ عشرت تھا۔ مگر کام اس عشرت کو دیکھ کر حیران ہو گیا۔ عشرت کے چہرے پر غریبوں کا ایک قطرہ تھا۔ وہ ایک مردہ لاش کا چہرہ تھا۔ آنکھوں میں کوئی چمک نہ تھی۔ اور جب عشرت بولا تو ایسے بول گویا کنوئیں میں سے بول رہا ہو۔

”کیا ہے؟“ کام نے نڈاؤ دہشت سے کہا۔

عشرت نے کہا ”وہا میں تمہارے ساتھ کام کروں گا۔ جو بھی تم دو گے کروں گا۔“

کام اندر سے قریب غرض ہوا مگر اوپر سے اس نے وہ دہشت بھرا اختیار کئے رکھا۔ بولا ”کیا ہوا وہاں جہاں کام کرتا تھا۔ ملک کو کام پسند نہیں آیا؟“

”نہیں“ عشرت کے ہونٹ کو پھینکے ”ہم — میں — وہ کام کر نہیں سکتا۔“

”مہرے بے دروغ نہ کہتے۔ کام کرنے سے آتا ہے۔ ایک دوبارہ کوشش کی ہوتی۔“

”بہت کوشش کی وہاں مگر مجھ سے ہو نہیں سکتا۔ بیٹھنے کا وہ مجھ کو کبھی جاننا بہت غلط

تھا۔ ہمیشہ بہت خاص میرا ایک دن کیا برابر ہوا۔ ہزاروں کا نقصان ہو گیا۔ اس کے آدمیوں نے مجھے دھتکے سے کے

کال دیا۔“ عشرت کے ہونٹ کو پھینکے۔ وہ مٹی کا سا منتظر تھا۔ ہماری میں کھڑا ہوا۔ ہماری کے اندر شعلے کی طرح

بڑکتا ہوا۔ زہریلی سانس لیتا ہوا۔ وہ اسے بھول جانا چاہتا تھا۔ دودھ کو پیسے پر سے ہمیشہ کے لئے غائب

مددنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ اس کی آنکھوں کے سامنے ہر بار آ جاتا تھا۔ بار بار ٹلنے سے بھی آ جاتا تھا۔ اس سے وہ

بھی بھول نہیں سکتا تھا۔ جیسے کسی نے دیکھتے ہوئے سب کی گرم سلاخ سے اس کی دودھ پر وہ منظور کھینچ دیا

وہ جانتا تھا۔ وہ زندگی بھر کے کبھی نہیں بھول سکے گا۔

اور پھر وہ نہیں بے شرم۔ بے باک۔ بے حیاءت کی جی ہنسی۔ بار بار اس کے ہم پر کڑے نکال

تھی شرب۔ بھنگ۔ چرس۔ مددنا۔ متھکا۔ امراض کے سہارے ہوئے کچھڑوں کا کھانا ہوا کھو کھا۔ ہم۔ ذنب

دل سے اس کی ہڈی کا آخری گوشہ بھی کھایا تھا۔

یہ ایک انہوں نے مجھے باہر پھینک دیا۔ ایک چمڑے ہوئے لیوکی طرح! آے خدا!

ٹھہر جاؤ عشرت۔ آے ہوں جاؤ۔

عشرت نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور لڑکھڑکھ کر کام کے قدموں میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

ایک رات کو کھانا کھانے کے بعد چوتھے پر بیٹھے ہوئے کرم احمد حوے کے درمیان بڑے
 ناز کی ہمشیر ہی بحث بڑھتے بڑھتے اتنا پانی پر ختم ہوتی اگر موت، اس بیت کلمہ فضل احمد حوے کو
 کہیں میں نکال پھاڑ دیتے۔ بحث ہندوستانی غصہ کے بدلے میں بددیہی تھی اور غامی کر ترقی پسند فحشوں کے
 بدلے میں جن کے حقوق حوے اپنا مخصوص نقطہ نظر لکھا تھا اور کرم جن کی ناسایانی سے جھگڑا ہوا تھا کرم
 کی تعلق پسند غصہ کے بدلے میں کہہ کر لگا ہوا کے چنے کو چیرا تھا۔ اکثر مقامات نہ بحث میں تناسب اور
 فحش و فحش کو دیکھا تھا۔

دھوئے کہا "جے تم لوگوں کی تصویریں پر سب بڑا اعتراض یہ ہے کہ سب کی سب
 ٹیکس اور سوت پرست ہوتی ہیں۔ قبلی تصویریں کا مزہ ہے تو اس قدر پایا ہوا، گھٹا ہوا، غم و غم کا
 ملا ہوا کہ کبھی ہنسی کی غرض میں تم سے کہتا ہوں کہ یہ کچھ نہیں ہے۔ یہ حقیقت کھڑی کے خلاف ہے۔ اس میں
 کوئی شبہ نہیں کہ ہم پر بیت غم کو ستم ہوتے ہیں۔ ہوتے ہیں۔ مگر ہم اس قدر اس انداز سے ہوتے ہوئے
 وگ نہیں ہیں جس قدر ہم ہیں۔ غموں میں دکھاتے ہیں ہم غم کا جواب اپنی بھرپور ممانعت سے دیتے ہیں
 ہماری جدوجہد بیت ہی سخت۔ اکیسے عجز ہلکی زندگی میں ہر روز ہندو ایک لکھائے کرتے ہیں، جب سوج چکا
 ہے اور شہنم کے قطرے سکھاتے ہیں جب بیت کی کھاد پر پر بادو ساگر دیتی ہے جب ہم گیت لکھتے ہیں

اللہ ہمارے بچے خوشی سے دُعا میں پجاتے ہیں۔ تم اُن لوگوں کو کہیں بھول جاتے ہو۔

اکرم نے کہا: "اُن لوگوں کی موجودگی سے میں بھلا نہیں کرتا۔ غریب لوگوں کی زندگی میں ایسے لمے ضرور آتے ہیں۔ مگر یہ لمے بڑے مختصر ہوتے ہیں۔ جو غالب حقیقت ہے وہ غریب آدمی اس ایک تنگ و کمربند کی ہے۔ اللہ غالب حقیقت کو بڑا کر کے دکھانا ہمارا فرض ہے۔"

دوسرے نے کہا: "تہذیب سے پہلا فرض ہے کہ تم ایسی تصویریں بناؤ جو ہم دل چاہی سے دیکھ سکیں۔ تہذیبی غریبوں کو دل چاہی نہیں دیتیں۔ وہ سوچے ہوئے کڑوں کی طرح تنگ ہوتی ہیں۔ ساری یہ بھی کوئی تصویر ہے۔ بیرونی دیکھو تو لباس نامزد شکل ایسی کہ بچہ کڑا بھائی آئے۔ ہر پردہ دیکھو تو کیکر مالکہ بیڑی کا ٹیڈی مالک۔ جہاں موقع ملے اُسے تفریح ملتا ہے۔ اسے بھائی ہم دنیا میں تفریح کھینچنے نہیں جانتے۔ تفریحیں بھی بہت سنتے ہیں۔ کامکار میدان میں پہلے ٹیڈی بچہ کے لینے میں غریب کے مشتاق تم سے دنیا میں امداد دھارنا کرتے ہیں۔ مگر ہم دنیا میں امداد دھارنا دیکھنے نہیں جانتے۔ دن بھر کے تھکے ہمارے کام اللہ وہ بھی اس گنہگاروں میں جاں گسل کام کرنے کے بعد جب ہم دنیا میں جاتے ہیں تو کوئی ایسی تصویر دیکھنا چاہتے ہیں جس سے ہمارے تھے ہوئے اعیانہ کو سکون پہنچے۔ آنکھوں میں طراوت آئے۔ دل کچھ اس طرح مائل ہو کر یہ دنیا اپنی تمام عقیدوں اور محرومیوں کے باوجود اتنی بڑی جگہ نہیں ہے کہ خدا دنیا میں سے عمل کرے کہ کوئی ہی کرنا جانتے۔ اسے میں تم سے چاہتا ہوں۔ تہذیبی بہت سی تصویریں کہہ کر واقعی بنیال ہوتا ہے کہ یہ دنیا اتنی بڑی ہے۔ ماحول اس قدر پریشان کن ہیں۔ مخالف قوتوں کا بازار اس قدر وسیع ہے کہ خود کشی کے سوا کوئی اور چارہ ہی نہیں۔ میں تم سے چاہتا ہوں کہ تم لوگوں کی تصویر دیکھ کر میں خود بھی دیکھ کے اٹھا آؤں۔"

اکرم کا چہرہ شرم ہو گیا۔ اس کے ہاتھ دو زمین باز تیزی سے اُٹھ گئے۔ اس سے اپنا فون تیزی سے کھینچ کر اُٹھ گیا۔ اس کا ہوا معلوم ہوا کہ میں تہذیب سے ایک چڑھے کے ہاتھ پر اس سے اٹھ گیا۔

ہائیں مٹ رہی ہوں، جو کہ تم مجھ پر اس قدر غصہ ہوا کہ زندگی کے کچھ حقائق سے منہ ہٹ کر دلچسپ تصویریں بنائیں، یعنی ایسا دل چسپ تصویریں جس سے تمہارے شکے ہرے اعتبار کو سکون ملے، تھلا غصہ ہل دلائی تصویریں کا فلسفہ ہے۔“

دوسرے نے فتنے سے کہا: ”تم میری بات نہیں سمجھتے ہو۔“

گرا کر مرنے کو کہ کہا: ”میں خوب جانتا ہوں یہ دل چسپ کا فلسفہ، سکون اور اطمینان کا فلسفہ، فرار کا فلسفہ ہے جو زندگی کی غالب حقیقت ہے، جس سے منہ ہٹ کر دلچسپ تصویریں بنائیں، ایسا دلچسپ تصویریں بنانا۔ جتنی ترغیب دینے والے ناچ گانے دیکھو، وہ آنکھوں کو بہت بے ملے معلوم ہوتے ہیں، یا حسن خفیل نیند لای بناتا، اور وہی سا بیٹا، بعد ازاں صدی، شاہی محرم، کنوڑی کینز، ایسی زندگی جو خود آج کے عرب ملکوں میں کہیں نظر نہیں آتی، اس کی عکاسی کر کے دوسرے ملکوں کے کچھری بے غزنی کر کے اپنی جیبیں بھر دیتا۔ تم کیا۔۔۔“

دوسرے بیچ میں ہل اٹھا، تم بات کو سمجھتے نہیں، بیچ میں کہاں کر رہے گے۔۔۔۔۔“
 ”کونسا تم کرتے ہو؟“ اکرم نے جواب دیا۔

دوسرے کی آنکھیں ایک لمحہ کے لئے شرم برہنہ ہوئیں، پھر وہ غصے کو پی گیا، پھر اس کے چہرے پر ایک عیب سی سکواٹ آئی، وہ آہستہ سے ہلکا کرکے بھائی یہ بھاس نہیں ہے، تم مرنے اپنے کتابی ذوق کے بل بوتے پر، اپنے کتابی علم کے بند پر تصویریں بناتے ہو اور اس نے نام نہان رہتے ہو گئے تھلری اور تھلے دوسرے ساتھیوں کی تصویریں نام نہان رہیں، کبھی تم نے اس کے بارے میں سوچا یا تو تم نے مدافعت میں اپنی نام نہان کی برتری کو گھنگھارے جس میں تم لوگ اپنے آپ کو ترقی پسندی کا شہید سمجھتے ہو، اس سے الگ ہٹ کر سوچنے کے لئے تامل تیار نہیں ہو، میں تم سے کچھ کہتا ہوں، تم شہید نہیں ہو، مدافعت فرمائیے گا، آپ لوگ شہید نہیں ہیں، اپنے تمام علم کے باوجود آپ جاہل ہیں اور میں یہ ثابت کر سکتا ہوں۔“

دوسرے نے اپنی بائیں تھیلی پر دائیں ہاتھ کا ٹکڑہ لٹکے رکھا۔ چوتھے مندرجہ بالا ہوں کے فضل میں جیت چکے
 اب ہم دوسرے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔
 "مہبت کرو" اکرم بولا۔

"کنا ہوں۔ مگر پیچھے میں تم سے ایک سال کر لوں۔ کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ میں اس کی بڑی چیز
 ہے۔ ایک سو ایک صحت۔ جوں باخ۔ زندگی میں پہلی بار محبت سے آشنا ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کو پہچانتے
 ہیں۔ اس میں کیا بڑی بات ہے۔ کیوں یہ ایک اچھی فلم کا نمانہ نہیں بن سکتا۔ آج اس فلم کے تمام سب
 لوگ اس قدر غصہ منظر آتے ہو۔ تم سب لوگ اسی بات پر غصہ منظر آتے ہو کہ ایسی تصویر بنائی جائے جس میں
 کہنے کو آج اس فلم نے ہوں بلکہ گراں حال ہی نہ ہوں تو سب سے زیادہ ترقی پسند فلم ہوگی۔ سیٹ جتنے
 بڑے ہوں گے۔ پکڑے جتنے پکڑے پائے ہوں گے۔ سدا و صرا جتنا زیادہ ہوگا۔ مناظر جتنے نمائندگی ہوں گے
 اتنی ہی زیادہ ترقی پسند فلم ہوگی۔ حقیقت کے زیادہ قریب ہوتی جائے گی۔ تم یہاں کیوں سوچتے ہو۔ میں تم سے
 پرچہ لے سکتا ہوں۔ آج اس فلم میں کیا بڑائی ہے۔ ہمارے پھر کا ایک شاندار حصہ ہے۔ یہ توڑنے کو آج
 اس سنگیت۔ تم ان غزلیاں لکھتے ہو۔ ہمارے لوگوں کو اپنی جھلس میں ان سے کیوں محروم رکھنا چاہتے ہو۔ لوگ
 آج ہمارے کے ہمارے میں سے متعلق نہیں ہیں۔ لیکن کچھ نہیں ہیں تو اس میں کیا بڑائی ہے۔ کیا کوئی اور صحت
 کی محبت۔ کیا جس کی محرومی یا اس کی نشت لکھنا بڑی کیفیت ایک آج میں ظاہر نہیں کی جا سکتی یہ کس قسم کی ترقی
 پسندی ہے۔ تم کہنا چاہتے ہو یہی نگاہ ہندوستان کے مزید اور کہان اس قدر ہے ہوتے اور ٹکٹے ہوتے
 ہیں۔ ان کی زندگی میں مدنی کی جدوجہد اس قدر شدید ہے کہ انہیں ہنسنے کے لئے آج اس فلم کے
 جھٹکا ٹھانے کے لئے۔ تو ان کے پاس وقت ہے۔ انہماک کے پاس اس کا طریقہ ہے۔ مگر وہ انہماک ہاں
 غلط ہیں۔ اس پر پریشان ہیں۔ اس نے قبل ہی تصویریں چاہی۔ چھدی حاصل کرنے میں اکثر کام
 رہتی ہیں۔"

اکرم نے کہا "تم پر اہ تبدلی طرح تصویریں دیکھنے والوں کے اندر بڑا ہی گھنٹی تصویروں
زہر سہاگت کر چکا ہے۔ جو حقیقت ہم اپنی تصویروں میں بیان کرتے ہیں وہ بے مدعا ہے۔ تم لوگ نہ
گول نہیں کرتے۔ مگر ایک وقت آنے کا۔"

کب وہ وقت آئے گا؟ دوسرے نے جفا کے کہا "مگر تم آج کے مسائل کو دیکھتے ہو آج کے
لوگوں کو ان میں سب سے زیادہ دل پی ہونی چاہئے۔ جب یہ مسائل ختم ہو جائیں گے تو آنے والی نسلوں کو
ان میں سہرت تارینی دل پی نہ جانے گی۔ مگر یہ غریب یہ بے مدی۔ ساشی پریشانی تو آج کے حقائق
ہیں جن میں کچھ کھڑا نہ کرنے کے لوگوں کو گہری دل پی ہونی چاہئے۔ پھر وہ کیوں تبدیلی نہیں نہیں دیکھتے
کیونکہ وہ دوسری نسل کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ سارا باطل مانت ہے۔ تم ان نسلوں کو صحیح نہیں دکھائی دے
نہیں پیش کرتے اس لئے وہ غیور چپا ہونے لگے ہیں؟

"دوسرا مگر یہ سب کے سب سے کھلی ہیں اس طرح کی تصویریں تیار ہوتی ہیں جو موت
نے بحث میں حصہ لے کر کہا۔

"دوسرے کھلی کی نقل میں کھلی پر کھلی سے لے کر دوس میں مریکہ میں برما میں اٹلی میں
لوگوں کی دل پی کے لئے اور بہت سے ممالک ہیں۔ دوس میں تمیز اسی لئے بہت ترقی یافتہ ممالک میں
ہیں۔ پھر ان کھلوں میں ٹیلی ویژن ہے۔ بھنگا ہل میں۔ اور پورا اوس میں۔ گنتی تمیز ہیں۔ شکایت اور
ناخ کی پڑیاں ہیں جو مکانات اور سیاق میں جا جا کے دلوں کے لوگوں کے نن اور ذوق کی ٹیکس
کرتی ہیں۔ یہاں پر کیا ہے؟ زخمی زخمی ڈیڑھ ڈیڑھ شکایت پائی۔ ناخ کا انتظام لے دے کے حدود
طرح پر ایک نیلہ گیا ہے جس میں دس آئے فرخ کر کے موم جاسکتے ہیں۔ اس لئے دس آؤں میں
اگر یہ چاہتے ہیں کہ ناخ بھی دیکھ میں۔ جانے بھی میں۔ زندگی کے تلخ تجربوں کے ساتھ تھوڑا سا
اس جو میں۔ تھوڑا سا جنس بھی میں۔ مگر وہاں تمام باتوں کو ایک ہی غم میں لہا ہوتے ہوئے دیکھا جاتا ہے

پڑے اور بحث ختم ہو گئی۔

اور سب کے لئے تربیت ختم ہو گئی تھی لیکن دو کاموں کے لئے یہ بحث ختم نہ ہوئی تھی۔ راست کے سناٹے میں جب سب سرگئے تو اکرم دیر تک جاگتا رہا اور اس بحث کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتا رہا۔ اے مسلم تھا کہ موضوع کے انتخاب اور زاویہ نگاہ کی چٹائی میں اس کے ہاں اور اس کی طرح سرچنے والے دوسرے دوستوں میں کوئی کمی نہ تھی مگر کوئی کمی تھی تو یہی کہ وہ لوگ اپنے جوش میں یا تجربے کی کمی کے باعث یا دونوں باتوں کی درجے جو وہ کہتا پاتے تھے اُسے صحیح فہم نہ تھی کہ نہیں پاتے۔ دوسرے اور سب نے آج جو باتیں کہیں اُن میں بہت سچائی تھی۔ ہر ایک کے اپنے مخصوص حالات بہتے ہیں اس کی اپنی پچھری غصہ میں ہوتی ہیں۔ اس کے فزون لطیف کی ایک غصہ میں قوی ہوتی ہے۔ ایسی چیز جو دوسرے کو اُن یا قوسوں سے مستعدی جاتے اُسے بھی دوسرے ملک میں جا کر وہاں کی زندگی میں اپنی جڑ پکڑنا پڑتی ہے۔ وہ وہ ٹھہرا جائے گی۔ اکرم کی ناہام غیروں کی طرح ——— اس میں کوئی شبہ نہیں۔ اکرم نے غصہ کس کیا۔ میں نے بہت شدید غلطیاں کی ہیں۔

اکرم دیر تک یوں ہی سوچتا رہا اور بحث کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتا رہا مگر اے مسلم نہیں تھا کہ ایک اور آدمی بھی برابر جاگ رہا ہے۔ وہ بھی اس کی طرح سوچا نہیں۔ اسی بحث کے مختلف پہلوؤں پر وہ بھی غور کرتا رہا ہے۔ وہ ستیہ رائے تھا۔ . . . اکرم کو بڑی حیرانی ہوئی۔ جب ستیہ رائے نے اس کا نام لے کر پوچھا کہ اس پہلی بحث میں ستیہ رائے نے اب تک کوئی حصر نہیں دیا تھا۔

”اکرم؟“

”ہاں۔“

”جاگ رہے ہو؟“

”ہاں۔“

”اس بحث کے متعلق میں ایک بات سرچا رہا تھا“

”کیا؟“

”ستیدائے کرٹ جیل کے اکرم کے قریب ہو گیا۔ سرگوشی میں بدلا ہنگامہ دوسرے سونے والے جگ نہ جائیں۔
”بجے کوئی دل چاہی نہیں تھی۔ چوہاری غلوں میں یا جس طرح کی غلیں قبلے دوست بناتے ہیں۔ میرا
مطب ہے کہ زہنی دل چاہی تو نہیں۔ مگر کرٹشل قبلے جب نہیں، تاہم ہونے لگیں تو ایک بے چارہ بدکر
دلال کیا کرے گا“

”دوست ہے“ اکرم بلا۔

”مگر۔۔۔۔۔“ ستیدائے نے ایک لمبے وقفے کے بعد کہا۔ ”گھر آج کی بحث سے میو یا خیال ہوتا
ہے کہ اگر میرا مطب ہے۔ ٹھیک طریقے سے جیسا کہ دوسرے لہجہ جوت کہتے ہیں۔ ٹھیک طریقے سے ان
باتوں کو رکھا جائے۔ ایک غم میں تو بھائی نکلن ہے وہ غم کامیاب ہو جائے۔ چانس زیادہ ہے۔“
اکرم چسپدا۔

”ستیدائے بلا“ کیا کہتے ہو“

”اول۔ ام“ اکرم نے جواب دیا۔

”ستیدائے آہستہ سے ہنسا“ اور نہیں ماننا چاہتے۔ خیر ٹھیک ہے۔ میرا کہنے کا مطب یہ تھا کہ اب کے قہر
ہم ل کے ایک تصویر بنائیں۔ ویسی ہی۔ ان نئے خیالوں کو اسی طریقے سے پیش کریں؟ کیا خیال ہے؟“
اکرم نے کہا۔ ”س کی مدنی کا تو کچھ پتہ نہیں تصویر بنانے چاہیے ہیں۔“

”ستیدائے نے کہا“ ”میا۔ تم ستیدائے کو نہیں جانتے۔ بنگالی پس کا سمتہ۔ دنیا کو ہواوں کا ایک ہنسنے
میں دو ٹیری ٹیری اٹھی ملاتے۔ ایچک دھل گا۔ اور سیر کی ٹیری ٹیری (سمند پار کے ملاتے، تروں ہنگی
بجاتے جاتے گا۔ اور اس کے بعد بنگالی۔ بنگالی میں اہر نیند گھوش ڈسٹری پر ٹر میرا پناہ دے ہے۔“

جب وہ ٹیری ٹریاں سن گئیں تو ہرزناس مابیل کن کیا محفل ہے رکھا۔ بانڈھا۔ تا۔ کہینا اور کچھ کے
ہمٹو یا کہ جاتو چٹا گلے رہو۔

اپنی انکیم سرگشتی میں بیان کرتے کرتے تھیائے اس قدر جوش میں آگیا کہ اس نے آخری فقرہ
بہاں چٹکے کہا۔ اس کی پاٹ دلاؤ دوسرے کے جوتے پر سونے ہوئے دوسرے ساتھی بکہ اس پاس کے
ہستے لوگ جاگ گئے اور چہرہ کی صدا میں جند پڑیں۔ مگر اکرم نے ہنس کر کہہ کر بتلایا کہ کچھ نہیں ہوا
تھا۔ تھیائے خواب میں بکلا ہوا تھا۔

”دیکھتے جاتو۔ میں بکلا نہیں ہوا ہوں۔ ایک صف میرے خواب غور پر ابھرا۔“ تھیائے نے لا لہو صریر کے
ساتھ سر ہلاتے ہوئے کہا۔

اور واقعی محفل سے ایک ماہ گزرا جھگا کہ تھیائے نے اپنی تصویر کی مدد ٹیری ٹریاں بیچنے میں
کامیاب چرگیا۔ جیسا اس نے وعدہ کیا تھا۔ ایک تو اس سے دوسری جمال کی ٹیری ٹریاں اس نے بچا
دی اور کائنات کے کرم کو دکھایا۔ اس کا ٹریٹ میں تصویر کا نام تھا ”طوفان“ اور اس کا ڈیوکلر
اکرم تھا۔

اکرم ہلا۔ مگر تم نے مجھے بتایا نہیں اور غم کا نام رکھ دیا۔ طوفان کی کہانی کیا ہوگی؟
”اب میں کیا جانوں۔“ تھیائے نے بڑی مسائی سے کہا۔ ”اب کہانی تم بتاؤ۔“ ڈسٹری پر ڈر کہانی کا نام
پڑھا تھا۔ ہم تارے ٹیری ٹریٹ کیسے ہو سکتے تھے۔ مجھے غم کیسی کا نام بھی دینا پڑا۔ میں نے اپنا نام نہ دیا۔
تھیائے ہنسنے لگا۔

”اور کہنی کا پتہ؟“

”سفرِ فٹ پاؤں پہنچنی۔ فی الحال تو یہی پتہ ہے“ سٹیڈ نے ہنس کر کہا ”مگر تم دیکھتے پاؤں اسی طرح ایک
ذایک سلف نفاض ہی ماسل کریں گا“

”سپ ہپ ہڑے؟“ اکرم اندر سے ہلایا۔

”خدا کی ست کر دے معاملہ بہت عجیبہ ہے“

”ہاں؟ کیسے؟“ اکرم نے پوچھا۔

”بات یہ ہے کہ اکابر داری روڈ پر ایک سنگی سیٹھ کی پڑھی ہے۔ میں وہاں پڑھی پر گیا تھا۔ سیٹھ نے
کہنے لگے کہ سیٹھ پوڑو بسروں کو پکڑ کر دی رکھ کر اس پر روپیہ دیتا ہے۔ میں نے اس سے بات کی تو
ہلکی پکڑ کو فانس کرنے کے لئے تیار ہے۔ اس نے مجھے کہانی بھی سنی۔ کہانی اسے بہت پسند آئی
اکرم نے کہا ”تم نے اُسے کہانی بھی سنائی۔ کیسے؟“

”بوسیرے ہی میں آیا میں نے بڑا چڑھا کر اُسے سنا دیا۔ ان سالوں میں تم جانتے ہو جب میں اپنی باتوں
پر آجاتی تو کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ میں نے ایسے کرتے گئے انھوں نے اُسے کہانی سنائی کہ وہ وہاں پر
پت ہو گیا۔ اُس نے میرے کھٹے پکڑ لئے۔ بلا۔ ستیہ بابو ایسی کہانی میں نے زندگی میں نہیں سنی۔ میں نے
کہا تم کیا جانتے ہو۔ یہ کہانی کسی جھوٹے موٹے فلمی شخص کی کہانی نہیں ہے۔ اسے یہ کہانی انٹرنیشنل شہر
پانڈراپ اور شاعر سندھوستان۔ پاکستان چین۔ جاپان اور افغانستان کے عظیم فن کار جناب اکرم بابو کی ہے۔
اکرم بابو تم جھوٹو مارو۔ میں نے پہلا جمنڈاٹ پاؤں کہنی سے اٹھایا۔ ہمالیہ پر گاڑ دیا۔ ہمالیہ سے اٹھایا ایشیا
پر گاڑ دیا“

”مگر کہانی کسے سنائی تم نے؟“ اکرم متکڑ ہو کر بولا ”کہانی تو“

”ستیہ نے اس کی بات کاٹ کے بولا ”گھبرائو نہیں اکرم بابو۔ کہانی وہی تیار ہوگی جو تم چاہو گے۔ ان

کی طرف لاپٹی دکھائی دے رہا تھا۔ بنانے کے بعد جوں سمت کی دھت میں جڑاڑگی اور بھارا جاتا ہے اس نے باورام کو بالکل بہت سا کر دیا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے وہ اس کی جلد کی خوشبو تک سونگھ سکتا ہے۔ وہ بار بار نظر فرما کر اس کی طرف دیکھ لیتا کہ جب دیکھتا تو سر سے پاؤں تک اس کے بدن میں آگ سی لگ جاتی۔

”دیکھو میں غمزدگی کو بہت ہی طرح بانٹا ہوں“ ستیہ دے نے سب کو بھانپتے ہوئے کہا۔ ”یہ تیسری ٹیری ٹری اس طرح نہیں کہے گی جیسی یہ پہلے دیکھا گئیں۔ نہ پڑھی ولا سیٹھ اس طرح خاص کرے گا۔ اب وہ موقع آگیا ہے کہ میں بڑنگ پانکھی میں ایک کر دیا جائے۔ وہ ٹی دفتروں کا گلا ہے۔ تمام ڈسٹری جو بڑنگ وہاں پر بند آتے ہیں۔ یہاں دفتروں کا ہے۔ میں نے بڑنگ کے خبر سے بات بھی کی تھی مگر تمیں ماہ کا کرنا یہی دیکھا ہے گا۔ پرنے پانور دیر پہر کو فرخچ بھی چاہئے۔ وہ تو خیر کرائے پر آ سکتا ہے ایک چمڑی رکھنا پڑے گا۔ پہلے دفتروں میں دن دفتروں کو لایا جائے گا اس دفتروں کا بہت ہی جگہ۔ میں بہت سے ڈسٹری بیوروں کو بلاؤں گا۔ اس دن پرنے بانٹے جائیں گے۔ ایک پچاس روپے کا دفتروں کا دفتروں میں بھٹا ہوں ہمارے پاس اگر شل سات سو پڑے ہوں تو کام چل سکتا ہے۔ تیسری ٹیری ٹری پک سکتی ہے۔ پھر بنا سکتی ہے۔ جتنا اگر سکتا ہے۔“

”سات سو پڑے اکٹھے کرنا ناممکن ہے۔“ اکرم بولا

”کیا ناممکن ہے۔“ نصیب نے جوش سے کہا۔ ”پانچ روپے میں دتی ہوں۔ جس روپے میری پہلی خریدی تھی میں روپے میری بیل کا تھوڑے گا۔ پچیس روپے تو ابھی میرے نام لکھو۔“

”بھرتے۔“ جسوزت آئی بھارت کے بولا۔ ”مٹی سمت شرم دلا رہی ہے۔ اب تو کچھ کرنا ہی پڑے گا۔“

کیوں دھوت؟

”کیا چاہو پے دیں گے۔“ دھوتے اتنا بولا۔ ”لیکن میں اپنی جگہ میں بات کروں گا۔“

اگر مزدوروں کی بھر میں بات آگئی تو۔۔۔۔۔ پہلا تارنگ بھی قریب آ کر بیٹھتا ہے نہیں کہوں جا۔۔۔
چلتی چلاؤ تالیس " بزم ہلا۔

فضل ہلا " میں اگلی رستم تو نہیں دے سکتا لیکن مزدور کی کمان سے ایک روپیہ دے سکتا ہوں۔ ایک
ہینہ تک "

" فضل ! تیس روپے ؟ ابے سالے ! " من بیت گنگو بندی سے تازہ گنگا کے منہ سے کوئی بہت بڑی
رقم برسنے لگا تھا کہ یکایک اسے اپنے چھوٹے بھائی کرنا کا خیال آیا اور اس کا منہ کھلے کاٹھارہ گیا۔
اس کا چہرہ بڑا اس وقت شادمان اور ایک سترت آمیز تک سے تاباں نظر آ رہا تھا یکایک بجھ گیا۔ ایک سایہ
سایہ کے چہرے پر آگیا۔ اس نے یہ یکایک اپنا کٹھارہ برا منہ بند کر لیا۔ سر جھکا دیا اور ہلا " میں۔۔۔۔۔ میں
۔۔۔۔۔ دس روپے سے زیادہ نہیں دے سکوں گا۔ وہ گئی بیٹھے بھر میں دس مہ فضل کی طرح بڑا بھائی
کھنڈ۔۔۔۔۔ " وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ فضل نے اسے گلے سے لٹکایا۔ اس کی پیٹ پر تھپی دے کر
ہلا " ابے ڈھونگی کے دس روپے تم میں کیا ؟ تمہاری طرف سے میں تو اکیلا ہوں۔ تیرے اچھڑ کر تلہ کی
پڑھائی کا خرچہ ہے۔ کیا ہم نہیں بکتے ہیں "

جسوت ہلا " آٹھ آنے روز کر کے ایک بیٹے کے لئے بھروسے ہی لیتے جاؤ "

" واہ اداوا ! " رضیہ نے نقد سے تالی بھائی۔ پھر وہ باہرام کی طرف دیکھ کر بولی " اور تم۔۔۔۔۔ تم کیا
دو گئے ؟ "

باہرام دودھ روپے کہنے والا تھا مگر جب اس نے رضیہ کو مخاطب ہوتے دیکھا تو وہ بالکل ٹھہر
سا گیا۔ اس کی زبان بند ہو گئی۔ رضیہ کا میٹھا حشر تم سرائے کے کمانے کا " تم کیا دو گئے ؟ " تم کیا
دو گئے ؟ " اس کی آواز اس کے کانوں میں دیر تک گونجتی رہی۔

یکایک باہرام نے ہٹلے کے کہا " میں روپے " وہ اتنی زور سے براہ کرا سے خود بھی اپنی آواز پر حیرت

ہوئی دوسروں کو اس کی آواز پر نہیں اس کی فیاضی پر حیرت ہوئی۔ بابرام میں روپے۔ وہ طے لگائے؟
جنون نے کہا ”کچھ کم کرو گجراٹ میں زیادہ بول گئے ہر شاید“

”نہیں نہیں“ بابرام نے اکڑ کے کہا ”میں میں ہی دوں گا۔ چاہے اس پہلی کو لے لو“
”اور جہاد دینی تم؟“ رضیہ نے مڑ کر جناح پر چھا اور بابرام کو بے حد افسوس ہو کر رضیہ نے اس کی
فیاضی اور حرارت پر تالی نہیں بھائی۔ وہ اسے اس طرح بھول گئی جیسے وہ وہاں تھا ہی نہیں۔ اسے دوسرے
لئے میں اپنی سماعت پر سخت فضا آیا۔ وہ خواہ مخواہ میں روپے بول گیا۔
”اسے یہ کیا دے گی“

من جیت سنگ جواب تک نیم دراز حالت میں چوتھے کے ایک طرف لیٹا ہوا تھا۔ ایک لٹکھ کھڑا
ہوا۔ سب ہاتھ تھے کہ من جیت سنگ کو جناح سے بڑی نفرت ہے۔ وہ جب ہی کا پڑھنے والا۔ پورا پاٹھ کا
پر سیاہ ہاتھ۔ دگر دوسرے ہاتھ والا۔ دھرم کرم کا سچا سادہ لوح بکھ تھا۔ اسے جناح سے اس کے فیاضی کی
وجہ سے نفرت تھی۔ ہاں سچی میں بھی جب اس نے دیکھا کہ وہ کتنی کتنی سمجھے اور کس طرح ایک ایک
پانی پر جان دیتی ہے تو اس کی نفرت اور بھی بڑھ گئی۔ مگر اس کے ساتھی اور دوست اس کے اس دیتے
کو پسند نہیں کرتے تھے اور وہ جناح سے جہاں تک ہو سکے سنی کے دوسرے عام لوگوں سے بہتر سلوک
کرتے۔ اس نے من جیت سنگ بھی اس کی موجودگی کو چوتھے پر برداشت کر لیتا تھا۔ پھر گرجنا پیسے
پسند پر جان دیتی تھی گرجنا کے کئی طرح کے کام یوں ہی کر دیتی تھی۔ لافین کو صاف کر کے چوتھے پر
لٹاتا۔ چوتھے پر چھاؤ دینا۔ ان کے کڑوں کی حفاظت کرنا کیوں کہ وہ سب لوگ تو اپنے کام سے باہر
پلے ہاتھ تھے تو وہی ان کی جھونپڑیوں کا خیال رکھتی تھی۔ ان میں سے اگر کوئی بیمار پڑ جائے۔ اور ایسا کم
ہوتا تھا۔ تو وہ دوا دار دلاتی تھی۔ ان کی تیمارداری کرتی تھی اور سب بالکل خاموشی سے۔ چپ چاپ
ایک لٹکھ بوسے بن کر عمو جہاد اس قدر خاموش رہتی تھی گریا اس کے مونہہ میں نہ بانی ہی نہیں۔ بس خالی

ہوں ہاں! نہیں ہے اپنا کام چلتی تھی۔ اس کے بعد رفیع نے جتنا سے بڑا تو پیشتر اس کے کہنا چھوڑتی
 من جیت سنگھ نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا: ”اسے یہ کیا کنوس نکھی ٹرس عورت کیا دے گی۔ اسے
 اس کا دمن ست لڑتے بارہناری پکھر نیا، ہو جائے گی۔ یہ تو دھیلے دھیلے پر جان دیتی ہے۔“
 سب نہیں پڑے کیوں کہ یہ جی تھا، جتنا واقعی سچے پیسے کے بدلے میں بڑی کنوس تھی۔

”اب مت کہو“ فضل نے جتنا کو ٹھٹھاتے ہوئے کہا: ”ہماری جتنا اگر ملنے پر جائیں تو ہماری ساری
 پکھر خود بنا ڈالیں۔ جو نپڑتے میں اتنا ذریعہ بارود پیر پار کا ہے۔ جانے مرنے کے بعد ہمیں سے
 کس کے نام وصیت کر کے جائیں گی۔“

پھر سب پہننے لگے مگر رفیع نہیں بھیجے بلکہ اس کے ہاتھ پر نہ پڑ گئے۔ اس نے ہما کو پکڑنے کے
 کہا: ”اجھا مذاق ہانے دو سہی۔ بولو ہناروی کتنے روپے دو گی تم؟“ رفیع بڑی حاجت سے بولی۔
 جتنا کے ہونٹ کانپے۔ اس نے اپنے سونگے ہونٹے بونٹوں پر زبان پھیری۔ آتش بار لگا ہونے سے اس
 نے من جیت سنگھ کی طرف دیکھا اور بولی: ”ایک روپیہ۔“

”انقلاب زندہ باد!“ من جیت سنگھ دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کے بولا اور پھر اکرم کی طرف ٹٹکے کہنے کا غضب
 ہو گیا اکرم باہر، یعنی میں تم کو انقلاب لے آئے۔ ابھی تک جتنا نے ایک روپیہ تو کیا ایک چھلہم تک کسی نیک کام
 کے لئے نہیں دیا تھا۔ یہ تم نے کیا کر دیا۔ میرے خیال میں تو یہ بڑا کام ہے۔۔۔۔۔“

”ہی اچی!“ رفیع نے اسے ٹٹکے ہونے کہا۔ من جیت سنگھ گواپانقرہ پرانہ کرنا پھر بھی جتنا نے بھر
 لیا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ وہ غصے سے اٹھ کر چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد رفیع نے کہا: ”تہیں ایسا نہیں کہنا چاہئے تھا۔“

”ہاں! ہاں! یہ بہت بڑی بات کی تم نے!“ ابورام نے رفیع کی تائید کی۔

”اچھا یاد۔ من جیت سنگھ ہمارے بولا“ آئندہ نہیں کہوں گا۔ اب تم آگے چلو۔“

وہ ہمیشہ ہی کہتا تھا آئندہ نہیں کہوں گا مگر پھر کیا تھا۔ لوگ اس کی طبیعت کی کمزوری سے ہمت
تھے، چپ ہو رہے۔ اکرم نے کہا ”میں ابھی کچھ نہیں دے سکتا۔ مجھے صبروت کے بہت سے روپے یادگار
دینے ہیں۔ اس رقم کے چکارے کے بعد البتہ . . .“

ستیرہ رائے نے چاقو کے نور اکبا ”ارے تم سے تو بہت سے کام لینے ہیں۔ کبانی بیسز روپے کھالے ڈیٹ
کاری سب تمہاری ہوگی۔ تمہیں تو تم اپنے پاس سے کچھ دوس کے ”پھروہ پٹ کے بوا“ طلب کر دو کتنی
رقم ہونی ہے۔ یہ سب رقم میں دوستوں کو دے دوں گا۔ ایک ایک پانی۔ سود میت۔ بچکر منسر ہو جانے
کے بعد میں پروڈیو سودوں گا۔ اکرم ڈاکٹر گز ہوگا۔ رنویہ کا ایک شان دار رول ہوگا۔ اکثر لوگوں پر ایک
پانی خرچ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جی کے سب لگ جاوے ساتھ فلم میں اکثر لوگوں کا کام کریں گے
وہ رومیہ صاف یوں نچ جانے گا۔ ایشیا پر جیٹا آکر جانے گا“

اکرم کا نقد پر حساب کرنے لگا۔ رنویہ نے توڑے سے دو ایک بار باروں کو جنگل کو جنگل کرتے
سے ان کو جھڈہ بانٹ دیا۔ باہرام اس کی گردن کے صراحی دار غم کو دیکھنے لگا اس کا بھی چاہا کہ وہ اس
غمر پر آہستہ سے اپنی آنکھیں پھیرتا چلا جائے۔ اتنی زندگی گزر گئی تھی۔ آج تک کسی جوان عورت نے اس کی
طوت منکر کے نہ دیکھا تھا۔

اکرم نے کہا ”ایک سو تین سو روپے ہوتے ہیں۔“

”اب میں چاہتا ہوں“ ستیرہ رائے نے بڑی آداسی سے کہا۔ جیسے اس کی بلند بلا میڈیا
کا قصہ کا ایک زمین پر آگیا ہو۔

سب چپکے ہو گئے۔ پانچ دس۔ بیس، سو کی بھی بات ہوتی تو وہ لوگ کچھ کرتے مگر اسٹے
چو سو روپے۔ بہت زیادہ فرق تھا غراب میں اور حقیقت میں۔ امید میں اور سلامت میں۔ آسمان میں
اور زمین بہت زیادہ فاصلہ تھا۔

سب کے سب میرے باپس اور اس فکر آنے لگے۔

اکرم نے وہ کانڈ کا پرندہ نکڑے نکڑے کرتے ہوئے ترش رو ہو کر کہا ”ہٹاؤ۔ گولی مارو“

لیکن اس کے چند ماہ بعد جب نئے ماہ کی پہلی تاریخ کو دھوئے نے اکرم کو تین سو روپے لاکے دئے تو وہ چونک پڑا۔ دنگ رہ گیا۔ اور جب دھوئے نے اسے بتایا کہ یہ تین سو روپے مزدور دال نے اپنی غول پیسنے کی کمائی میں سے دو دو پار پار کئے کر کے دئے ہیں تو اکرم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اکرم نے روپے گن کے ستیرے دئے کو دئے۔ ستیرے کا جہرہ اس طرح کھل گیا جیسے کسی نے اس کی آنکھوں کے اندر کا بھاہر اب آ کر نیا باب روشن کر دیا ہو۔ اس کا جڑا چلا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا اور اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا ”مجھ کا ڈیرا!“

رضیہ بولی ”میں نے اپنے ہاں ڈالسنہز یونین میں بات کی تھی۔ وہ لوگ ہماری تصویر میں منت کام کریں گے۔“

”بھڑے!“ اکرم نے ہلکی جہانی۔

”اوپر ہاں۔ یہ دس روپے رضیہ نے دئے ہیں“ رضیہ نے اکرم کو دس روپے دئے۔ اکرم نے ستیرے دئے کو دئے۔

”زمانی تین سو ابھی اور پائیس“ اکرم نے سوچتے ہوئے کہا ”کہاں سے آئیں گے؟“

”سوہیں گے! سوہیں گے!“ ستیرے دئے نے خوش ہو کر کہا ”غیر بازار۔ میں کل جاکے فیس بڑھانگ

کے سینہ سے بات کرتا ہوں۔ شاید وہ کم ایڈوانس نیسے پڑا مٹی ہو جائے ؟

وہ رات بہت تاریک تھی۔ آسمان بادلوں سے گھرا ہوا تھا۔ بارش کم تھی مگر ہوا کے زور سے اس قدر تیز فزٹوں میں آئی کہ لوگوں نے ہستی میں اپنی جھونپڑیوں کے دھواڑے بند کرنے تھے اور اندر چلے گئے تھے۔ صوف کرم کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ وہ رات کے سناٹے میں اپنی جھونپڑی کے صوف سے پر کھڑا دودھ آسمانوں کی طرف نگہ رہا تھا جہاں طوفان کوڑک رہا تھا۔ بجلی چمک رہی تھی، اور ہوا بارش کی ہوجھاڑیں اپنے ہاتھوں میں لئے ہوئے سارے شہر میں ایک دیوانہ وار مستی کے عالم میں ناچ رہی تھی۔ اکرم خیالوں میں گھویا ہوا تھا۔ وہ اس وقت چڑھا جب اس نے دیکھا کہ جناح اس کے پاس کھڑی ہے اور انہیں اٹھانے اس کے چہرے کی طرف نگہ رہی ہے۔ اکرم کو معلوم تھا کہ بنا رات کو نہیں سوتی ہے۔ پھر بھی وہ اس طرح جناح اپنے سامنے دیکھ کر چنک گیا۔

جناح نے اپنے بے راخت کے سوزھوں سے منکراتے ہوئے پوچھا "نیند نہیں آئی ؟"

"ہاں! ——— ہاں!"

اکرم ان باتوں میں گھویا گیا۔ وہ بڑی سی پتلیاں جنہوں نے ہانے کیسی کیسی زندگی دی تھی۔ وہ بچوں کے بغیر پہلے کیسی ان آنکھوں میں دھڑکی تھی۔ ان آنکھوں پر کبھی صفت آراستہ کھیں کہتے تھے اُن کو، مگر کر۔ اُن کو، مگر کر فوجیوں دلوں کو مستحکم کر دیتی تھیں۔ جناح اس کاڑی کی رہنے والی تھی؛ شاید اس کا کوئی باب بھی تھا۔ کوئی ماں۔ کوئی بہن۔ کوئی بھائی۔ ———؟ پھر کیا ہوا ———؟

اکرم ان باتوں میں گھویا گیا۔

جنانے اپنے پرڑوں کو چہلاتے ہوئے جو کرم کو بڑے منہکا فیزے معلوم ہوئے، آہستہ سے کہا: ”تم کہیں کہانی
سوتلا رہے ہو؟ اپنی فلم کے لئے۔۔۔۔۔؟“

”یہ ایک کہانی ہے کسان اور اس کی زمین کے متعلق“

”کسان؟۔۔۔۔۔ زمین؟“ جنانے آہستہ سے سوالیہ انداز میں دُہرایا۔ پھر اپنے آپ سے کہنے لگی
”میں ایک کسان کی بیٹی تھی“

پھر وہ چپ ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پھر پوچھا ”اور اس کہانی میں لڑکی بھی ہوگی۔۔۔۔۔ یا لڑکیاں
ہوں گی؟“

”ہوں گی!“ اکرم نے جواب دیا۔

”تم کیسے من کے ساتھ سلوک کرو گے؟“ جنانے کا بچی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”کیا مطلب؟“ اکرم نے پوچھا۔

”جنانہ لڑکی“ میرا مطلب ہے۔ وہ کہیں لڑکیاں ہوں گی۔ مردوں کے کھلنے یا انسان؟“

اکرم نے چونک کر حیرت سے جنانہ کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی طرف دیکھتا ہی گیا۔ دیکھتا ہی چلا گیا۔

”جواب دو!“ جنانہ کی آواز میں خدا کی سختی تھی۔

”انسان!“ اکرم نے آہستہ سے کہا۔

جنانے وہ لائین اوپر اٹھائی۔ اور پراٹھائی۔ لائین بائیں کرم کے چہرے کے سامنے آگئی۔

اتنے میں بجلی کا ایک چمک اٹھی۔ زور کا کڑا ہوا۔ بجلی کا کڑا شہر کے چاروں طرف پھیل گیا۔ اکرم کی آنکھیں
بے اختیار بند ہو گئیں لیکن سب کچھ تو وہ پراسی بڑھیا کی لائین دیکھ رہا تھا۔

بہت دیر کے بعد بڑھیا نے سانس لے کے کہا ”بجے نہیں ہے۔ بجے نہیں ہے!“ تم ان

انسانوں کا ساملوک کرو گئے“

پراس نے ہاشین نیچے کر دی۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنی چوٹی میں ہاتھ ڈالا اور تین سوکے نوٹ نکال کے اکرم کے ہاتھوں میں دے دئے۔ "باز فہم بناؤ۔ جگوان تمہیں کامیاب کریں" اور وہ جلدی سے قدم مڑے تیزی تیزی اپنے جھونپڑے کی طرف چلی گئی۔ یکایک بارش کے ایک تیز تھپڑے سے ہاشین جھونکی اور چاندل طرف اندھیرا چھا گیا۔

مگر اس رات بہت دیر تک اکرم جھونپڑے کے حدود سے پرکھڑا رہا اور حیران ہوتا رہا۔ اس کے ذہن میں سیڈم آئی۔ اور پھر صورت جس کا نام جتنا تھا۔ وہ سیٹھ میں کا نام باخڑیا تھا۔ اور یہ کیسی ڈرا تیرہ جس کا نام فضل تھا۔ من جیت لگتا تھا۔ وہ بچہ دت جس نے اپنے لوگ گیتوں کو بچہ دیا تھا۔ اور دھوئے اور موت کتنے ہی چہرے تھے اور پڑانے قطار اندر قطار آنے سے سامنے اس کے سامنے کھڑے ہوتے گئے۔ اور وہ ان دونوں دنیاؤں کے نیچے میں دونوں پرکھڑا رہا اور حیران ہوتا رہا ہر یکایک آپنی دماغ میں بجلی کے کونے کی طرح اس کی سمجھ میں آ گیا کہ اسے کدھر جانا ہے؟

یکایک دونوں کو چھوڑ کر اکرم باہر گئی پلا آیا۔ بارش کے تیز تھپڑوں نے اسے فرما جگوریا۔ مگر اکرم نے ذرا پروانگی۔ یکایک سڑت کی ایک دھچکتی ہوئی لہر اس کے سارے جسم میں پرتی ہوئی چلی گئی۔ اور جب بادل مگرتا تو اس نے اپنے سینے کے ٹٹن کو مل دئے اور اپنے دونوں ہاتھ خوشی سے کسمان کی طرف اٹھا دئے اور بے تھوڑوں کے الفاظ میں کہا "میں آدمی ہوں اس لئے میں بادلوں کی طرح گر جاؤں گا اور اتنی ہی گیسیر، بلند اور بلند والی موسیقی قہقہہ کر دوں گا۔"

وہ دن کتنا عمدہ اور آسودگیوں سے بھرپور تھا جس دن ستیہ رائے اور کرم نے اپنی کمپنی کے دفتر کا فیس بلنگ میں بہرہ کیلک ان کی جان بچان کے غم کے بہت سے لوگ اس موقع پر موجود تھے لیکن ایک نیا عنصر بھی موجود تھا جس سے پہلے ایسے موقعوں پر کسی نے نہ دیکھا تھا یعنی من جیت سنگھ کیسی ڈائریٹر۔ دھوئے ٹیکسٹائل مزدور جمونٹ ٹاؤنٹ۔ بابو رام۔ فضل اور بستی کے بہت سے مزدور کارگریں اس موقع پر موجود تھے۔ چنانچہ ان کی مدد کرنی یونین نے اس موقع کے لئے اپنے تین نمائندے بھیجے تھے۔ ڈائریٹر یونین۔ اسٹریٹ یونین اور اسٹریٹ یونین کے نمائندے بھی موجود تھے۔ اور ان لوگوں کی تعداد شاکر سنگھ کی بھولن اور دو گھوڑا بولکی کی قیص اور ان کی منتقلی سونے کے ٹیبن پہننے والوں سے کہیں زیادہ تھی۔ یہ لوگ بول چال، مزاح اور گھڑا بول کی قیص اور ان کے مقابلے بھی کھڑے، کھڑے، سخت اور نرمند نظر آتے تھے۔ لیکن آج یہ سب لوگ بے حد خوش نظر آتے تھے۔ دفتر کا کمرہ ان لوگوں کے ہنسی خٹکوں سے معمور تھا۔

ایک کمرے میں جہانگیر دھوئی پہنے ہوئے مٹھی مٹھی تھی۔ بہت دفن کے بعد آج وہ دن کو بھی جاگ رہی تھی۔ اس نے پہلے تو آنے سے انکار کیا تھا۔ مگر ستیہ رائے اور اس کے ساتھی نہیں ملنے زندگی میں جہانگیر کے شاید یہ پہلا موقع تھا کہ وہ بہت دالے لوگوں میں اس طرح عزت سے بیٹھ رہی

حق۔ بلکہ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتی ہیں اور وہ نہیں سمجھتا کہ اپنی سفید و حوتی کے اُبلنے پر پہنچ گئی۔ سچی میں تو وہ اگر غلط نہیں تو کم از کم بے حد میلے کپڑوں میں رہتی تھی۔ ہاں یہاں پہلی مرتبہ جانے کتنے سالوں کے بعد وہ ایک سفید و حوتی بن کر آئی تھی۔ اسے ان لوگوں میں بیٹھ کر ایسا محسوس ہوا جتنا کہ جیسے خود اس کی مودت سفید اور اُبل جی ہو گیا ہے۔

جب دفتر کا مہورت ہو چکا اور پڑھنے بیٹھ چکے اور لوگ اکرم اور ستیہ رائے سے ہاتھ ہلا کے مبارک بارے کر چلے گئے تو سردیش پر اپنے اکرم اور ستیہ رائے کو دفتر کے باہر چھوڑ کر کمرے میں نے گیا اور کہنے لگا: ”تم جانتے ہو، سیٹھ نے سٹوڈیو کے ملازمین کو چار مہینے سے تنخواہ نہیں دی۔“

”ہاں کسی نہ کسی طریقے سے ان چار مہینوں میں ہم کام چلائے رہے۔ مگر جب پانی سرے گزر گیا تو ہم نے سیٹھ کو ہڑتال کرنے کی دھمکی دی۔ سیٹھ بلا میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ تم کچھ سٹوڈیو تیار ہے تم اسے چلاؤ۔ اس کا خیال تھا شاید ہم اسے چلا نہیں سکیں گے۔ ہم لوگوں نے ایک منگ کر کے سٹوڈیو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔“

”مگر تم کیا اسے چلا پاؤ گے؟“ ستیہ رائے نے پوچھا۔ ”ایسا نہ ہو۔ جیٹا کیس جتلیہ سے اٹھے اور کپڑے میں گر جاتے۔“

سردیش نے مسکراتے کہا: ”نہیں ایسا نہیں ہو گا۔ ہم نے بہت سوچ بچ کے ایسا کیا ہے۔ ہم نے سٹوڈیو دکن کی ایک کوآپریٹو بنائی ہے اور یہ کوآپریٹو اب سٹوڈیو کو چلائے گی۔ ایک سال کے لئے ہم نے یہ بھی سوچا کہ سیٹھ سٹوڈیو کا کرایہ بہت لیتا تھا۔ ساڑھے سات سو روپے روزانہ تھی بہت زیادہ میں۔ تو ان لوگوں کا تھا لوگوں کو۔ ہمیں کوئی ٹرانزاکشن ہے نہیں۔ ہم نے سٹوڈیو کا ریٹ گھٹا کر چھ سو کر دیا ہے۔“

”بہت اچھا کیا“ اکرم بولا۔

’سودیش نے کہا۔“ اب میں اصلی بات کی طرف آتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے تم لوگ کس طرح یہ تصویر بنا رہے ہو۔ کس طرح کے تم لوگوں کے عزائم ہیں۔ کون لوگ تمہاری مدد کر رہے ہیں اور کون کون سے چاہیں گے۔ ہم لوگوں نے فیصلہ کیا ہے۔ اگر تم لوگ ہمارے شوڈیو میں تصویر کی شوٹنگ کرو تو ہم تمہیں پچاس فی صدی امداد دیں گے یعنی چھ سو روپے۔ اس میں سے تمہیں ایک شوٹنگ کا صرف تین سو روپے ملے گا۔ باقی تین سو صرفہ کے بعد۔“

اکرم نے نوے سے سو روپے کا ہاتھ پکڑ لیا اور سودیش نے اس کا امدادوں نے یہ بھی امداد سے ایک روپے کی طرف دیکھا۔ یہ ایک بڑا ہی مضبوط معاملہ تھا۔ اکرم کو معلوم تھا کہ شوڈیو کے مزدور کتنی ہیرانی کر رہے تھے۔ اس تصویر کے لئے اپنی مزدور کی ناکافی تنخواہ میں سے بھی میں ہزار روپے امداد اس کے لئے دے رہے تھے۔ ستیہ رائے، اکرم اور سودیش دونوں سے غصہ گریں گے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو برائے اور اس نے ہلکے کہا۔ ”کالڈیا جھنڈا کھڑا نہیں بلنگ سے اٹھایا اور ساری فلم انڈسٹری پر کھڑا کیا۔ اب دنیا کی کوئی طاقت میں ٹنکٹ نہیں دے سکتی۔“

وہ اتنے زور سے جھلکا کہ آہیں پاس کے دفاتروں کے باہر بیٹھے ہوئے بہت سے اونچے ہوئے چہرے جاگ اٹھے اور چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ کئی لوگ تو اپنے دفاتروں سے باہر نکل آئے۔ سودیش اپنے مسکرایا اور وہ ستیہ رائے کی ہنسی میں ہاتھ ڈال کر اسے واپس دفاتر کے اندر لے گیا۔

شام کے قریب جب اکرم، رہہ کر کے چرچ گیٹ جانے والا تھا، جہاں موہنی دہستان میں نے اسے چائے کی دھن دی تھی ایک لاکھ اس کے دفاتر میں آئی۔ اس کی ٹھوڑی چھوٹی تھی۔ ہنسنا پچھتے ہوئے لیکن آنکھیں بڑی بڑی نوروز نشن۔ وہ آتے ہی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اجازت لئے بیٹھ کر کہنے لگی۔ ”مجھے کام چاہئے۔“

”ہوں!“ اکرم نے جواب دیا۔

”میں کھا سکتی ہوں۔ ناچ سکتی ہوں۔ کھالے بول سکتی ہوں۔ تیرا گھوڑے کی سواری کرنا۔ بائیسکل چڑانا پس کام کر سکتی ہوں۔ کالج کے ڈراموں میں اکثر کام کرتی تھی“

”ہوں“ اکرم نے نیزکی دروازہ کھول کے اس میں سے چند ورق کھالے اور اس لڑکی کو پڑھنے کے لئے دئے۔
”چیلے انہیں پڑھ لیجئے اور پھر اس صورت کے کھالے آپ برتے۔“

چند منٹ کے ملائے کے بعد اس لڑکی نے وہ کھالے سنائے۔ طرز ادا بہت عمدہ مشنرور تھے۔
گولڑ میں جان اورس اورسدا آمد۔

”آپ کا نام؟“ اکرم نے پوچھا۔

”آہ پارا“

”گھر والے تو یہاں نام نہیں رکھ سکتے تھے“ اکرم نے مسکرا کے پوچھا۔

”اے نہیں، یہ میرا اصلی نام ہے۔ میرا اصلی نام تو بھلا ہے۔“

”بھلا کیا بڑا ہے“

وہ لڑکی خاموش ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد بولی ”تو آپ مجھے کام دیں گے۔ آپ کو مجھے کام دینا ہی ہوتا“

اکرم نے سوچتے ہوئے آہستہ سے کہا ”ایک چھوٹا سا رول ہے۔ ایک ماہ میں آپ کا کام ختم ہو جائے گا۔ صرف ڈھائی سو روپے ملیں گے۔ اس کام کے لئے۔ اس سے زیادہ ہمارے پاس بحث نہیں ہے۔“

”مجھے منظور ہے۔“

اکرم نے صورت کی طرف دیکھ کر کہا ”بھئی ان کا کنٹریکٹ ٹائپ کر دو۔“ پھر کمرے آہ پارا کی طرف۔
”غائب ہو کے کہا“ آپ اپنا ایڈریس پورا پتہ وغیرہ۔ اب انہیں بتا دیجئے۔ وہ آپ کا کنٹریکٹ ٹائپ۔

نہایت میں

جنوت نے شام کے دو گھنٹے اپنی فلم گپنی کے دفتر کو دیکھا منظر کئے تھے۔ وہ اپنا ٹاپ راتر یہاں اٹھا کے لے آتا تھا اگر فلمی کانسٹریکٹ واکاروں کے، کانسٹرکٹ، ڈسٹری بیوٹروں کے مسئلہ کائنات ٹاپ ہو سکیں۔

جب کانسٹریکٹ ٹاپ ہو کے آو پارا کے سامنے آیا تو اس نے اسے پڑے فیروز دستخط کر دئے اکرم نے دستخط کرنے کے بعد کانسٹریکٹ کی ایک نقل آو پارا کو دی۔ آو پارا نے اپنے پرس میں ڈال دی اس کے بعد بھی دو کرسی پر بیٹھی رہی۔ تھوڑی دیر کے بعد بلی "ایڈوانس؟" اکرم نے جنوت سے کہا۔ "بھئی انہیں تیس روپے دے دو۔ رسید لے لو"

تیس روپے لے کر لڑکی نے اپنی پرس میں ڈال لئے۔ اس کے چہرے پر نہ کانسٹریکٹ پر دستخط کرتے وقت نہ ایڈوانس لیتے وقت کسی قسم کی خوشی کے جذبات اُبھرے۔ وہ شکر کی باتیں جس حرکت لری پر بیٹھی رہی

اکرم نے سوچا خطاب دوپہل جاسے گی۔ خود بخود مگر جب چند منٹ گزر جانے کے بعد بھی وہ وہاں سے نہ گئی تو وہ خود پٹنے کے لئے تیار ہو گیا۔ کیوں کہ اسے دیر بھر بیٹھی تھی۔ وہ ذی سون جنی میں اس کا انتظار کر رہی ہو گی۔ اکرم نے جنوت کو دو ایک کانسٹریکٹ ٹاپ کرنے کے لئے دئے۔ دفتر کی چابی اس کے حوالے کی اور کرے سے باہر چلا گیا۔ وہ لڑکی بھی اس کے ساتھ ہی کرے سے باہر نکل آئی اور اس کے پیچھے پیچھے چل دی۔ اکرم نے کوئی زیادہ توجہ نہیں کی۔ لیکن جب فیس بلڈنگ سے باہر نکل کے ہاسٹل کے بجلی کی کٹ جاتے ہوئے بھی اس نے اس لڑکی کو اپنے ساتھ پایا تو اس نے شمس ماکھوں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا "فرمائیے"

وہ لڑکی اس کی فٹ پاور، آپ فرمائیے سے میری فٹ پاور

”کیا مطلب؟“ اکرم نے پوچھا

”آہ پارلے بڑی محنت سے اس کی طرف دیکھ کے کہا“ آپ نے اپنا کام کر دیا اب میری باری ہے۔ زیادہ بننے نہیں۔ میں سب سمجھتی ہوں۔ رات کو آپ مجھے جو پرپے جانے کے لئے آؤں گے۔ اُس وقت آپ کو بھی میرا پیڈیس ڈھونڈنے میں گرفت ہوگی۔ مجھے بھی ہوگی۔ میں اس وقت آپ کے ساتھ چلے کو تیلہ ہوں۔ جہاں آپ چاہیں“

اکرم نے کہا ”میں چاہتا ہوں آپ اپنے گھر چلی جائیں۔ میں آج نہیں آؤں گا“
”اوہ۔ تو آپ کل آئیں گے“

”کل بھی نہیں۔ پرسوں بھی نہیں۔ کسی دن بھی نہیں۔ آپ کو اس کہانی میں نہ میرے ساتھ نہ کسی دوسرے کے ساتھ جو ہو جانے کی ضرورت پڑے گی۔ آپ ایمان داری سے اپنا کام کیجئے۔ ہم ایمان داری سے آپ کو آپ کی رقم دے دیں گے بس! یہی آپ کا ہمارا کام ٹھیک ہے“

”لیکن کام ٹھیک میں ایک تردد بھی تو ہوتی ہے جو کبھی نہیں جانی مگر ہوتی ہے“

”مس آہ پارا“ اکرم نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا ”میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہمارے پاس آپ سے کبھی کوئی بدسلوکی نہیں ہوگی“

آہ پارہ اب دبیہ ہو گئی۔ اس نے زور سے کرم کا ہاتھ پکڑ لیا اور گلو گراؤں میں بولی ”آج میں ہر بات کہنے تیار ہو کے آئی تھی۔ مہینوں تک اس کے لئے کبھی تیار نہ ہوئی تھی۔ جس جگہ جاؤں میں سے بات کرو۔ وہی اشارہ، وہی کنایہ۔ وہی سوال۔ آخر میں۔۔۔۔۔ وہی ایک سوال میں ڈھونڈنے ڈھونڈنے تک گئی تھی۔ آج میں نے فیصلہ کر لیا تھا۔۔۔۔۔ دو دن سے بھوک تھی۔ مجھے خواب میں بھی خیال نہیں آسکتا تھا کہ آپ مجھے۔۔۔۔۔ اس۔۔۔۔۔ اس طرح۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے، اس طرح کام دے رہے گے۔۔۔۔۔ میں ایک غریب سندی لڑکی ہوں۔ میرا سب کچھ تھا۔۔۔۔۔ اب تو کچھ نہیں رہا۔۔۔۔۔

ہائے اکرم صاحب۔ میں نے کتنی بڑی بڑی باتیں سونچیں آپ کے پاس میں۔ آپ کو دل ہی دل میں بہت سی گھایاں دے ڈالیں۔ مجھے کیا معلوم تھا آپ اتنے شریف آدمی ہیں۔

اکرم نے کہا۔ میں پہلا شریف آدمی نہیں ہوں۔ مجھ سے پہلے درجنوں اچھے آدمی اس انداز میں موجود تھے۔ آج بھی سینکڑوں کیا ہزاروں ہیں۔ اس سے پہلے بھی مرث کام کی قربانی لوگوں کو کام ملا ہے۔ میں آہ پارا آگے بھی بے گار اور غنا ہلے گا۔ اور بھی آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایسے لوگوں کی تعداد بڑھتی جائے گی جو مرث آپ کے کام اور آپ کی فنی صلاحیتوں کی بنا پر آپ کو کام دیں گے اور ہر ایک سب وہ بھی آہلے گا اس آہ پارا جب اس قسم کی بڑی باتوں سے غمناک نہ ہوں گا دامن یک سر پر آہلے گا مجھے اس کی پوری امید ہے۔

تب آہ پارا نے ایک عجیب و غریب بات کی۔ اس نے اکرم کے ہاتھ کو اپنے ہونٹوں سے گھسیا اور فریاد کیا کہ بھائی بھائی بھائی بھائی

مولن جی میں دیر تک آرام اور دودھی بیٹے ہاتھ پر فروش گیتیاں کرتے رہے۔ پہلے کئی مہینوں سے وہ ایک دوسرے کے قریب آ رہے تھے۔ کئی نے کئی سے کہہ دیا تھا۔ لیکن ان دونوں میں سے ہر ایک یہ محسوس کرنا تھا کہ دوسرے کی جانب بگھنا بنا رہا ہے۔ مگر انہی کچھ کچھ کاواوتے نہیں تھا۔ کچھ محسوس کرنے کا ٹھوٹے کا۔ سوچنے اور جھٹکنے کاواوتے تھا۔ دوسری اکرم کی کامیابی سے بے حد خوش تھی۔ مستونے اس کی آنکھیں تاروں کی طرح چمک رہی تھی اور شلوں کی نئی چمک اس کے رخساروں

پر تھی۔ اس نے سیاہ مگرٹ پہنا ہوا تھا اور اس سیاہ مگرٹ پر سنہری کام کا لہریا اس کے بازو تک جاتا تھا۔ یہ سنہری بیل اس کے سینے سے اس کے ٹخنوں تک کھینچی ہوئی اس کے جسم کے دل آویز خطوط آبشاری تھی۔ دیوار گیر۔ مہم مہم نیلی نیلی روشنیاں رون ہنی کے ڈانس ہال میں جاتے فی کا سا پُرکیت منظر پیش کرتی تھیں۔ ہاؤم اسٹیلیٹا اپنے گہرے بھرے بالوں کو شانوں تک چٹکائے، ایک طرف منک آئیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک نازک سی گینار تھی۔ ان کے پیچھے ایک بہت بڑا گلاب کے رنگ کا ایپ ٹیڈ تھا جس کی روشنی ہمیں کران کے بالوں اور ان کے ہاتھ میں تھامے ہوئے گینار پر پڑ رہی تھی۔ اسٹیلیٹا کی ٹیم ہاتھ میں گینار پر جب تک گئیں اور مہم مہم ناچ کا ڈولنا ہوا تو گینار کی اکوں سے پھوٹ پڑا۔

خاموشی سے اکرم اور دزدی لٹھے اور اپنے گھے۔ دزدی اکرم کی بانہوں میں تھی، اور اپنے تپتے اس سے ایک لمبے کے تے اپنی آنکھیں بند کر میں اور اس کا سر اکرم کے سینے لگ گیا اور اسے محسوس ہوا جیسے وہ پھولوں کے تختے پر ناچ رہی ہے۔ ہرے بھرے سرخواریں میں۔ برن پرش پہاڑوں کے دامن میں کسی اجنبی بھیل کے ساحل پر ناچ رہی ہے۔ گھائیوں پر کھڑے ہوئے دفنوں کی ہر شاخ وائیلن ہے اور ہوا اسٹیلیٹا ہے اور ان ہزاروں وائیلنوں کے آرکسٹرا سے جو موسیقی ابھر رہی ہے۔ اُن سے دو داترے، دو دول، دو افراو، گونے گونے ایک دوسرے کے گرد طواف کرتے ہوئے آپس میں یوں گھول گئے ہیں جیسے اب موت ایک دائرہ ہے، ایک دل ہے، ایک فرد ہے۔ موسیقی کی ایک لمبے ہے جو ہزاروں لاکھوں وائیلنوں سے جتنی محبت سنارہی ہے۔

اور مغربی موسیقی کی دھن کے ساتھ تپتے ہوئے اکرم نے سوچا، کبھی ہماری مشرقی موسیقی کے فن کھرچی کوئی ایسی دھن بنائیں گے جن پر دو محبت کرنے والے ناچ سکیں۔ ایک دوسرے کی کر میں ہاتھ ڈالتے۔ جسم سے جسم ہاتھ آٹھوں میں آنکھیں ڈالے اپنے جسم کی نے گورو دوسرے جسم کی نے، سوتے ہوئے موسیقی کی گت پر ایک دوسرے میں کھو جائیں۔ ایسا تو جس باسے ایک نہیں، بیٹیم نے کھا

منی ہدی کتھا کی! کھک۔ بھارت ناٹیم — نہیں۔ نہیں۔ بھارت ناٹیم ہی نہیں، محبت ناٹیم بھی چاہئے
 صرف کتھا کی ہی نہیں، محبت کی گئی بھی چاہئے۔ مگر کیسے؟ ہزاروں برسوں سے ہم نے، ہمارے آباؤ اجداد
 نے محبت کی۔ مگر محبت کرایا یا جاں بھ کر۔ مرہ کر جیون کا جنجال بھ کر۔ رُوح کی ضرورت بھ کر نہیں۔ تو کیا ہم
 لوگ کبھی محبت کی موسیقی نہ پاسکیں گے۔ ہمارے ہاں ایک کس لئے موسیقی ہے اور دوس کے لئے بھی
 ہے۔ لیکن دو کس لئے۔ صرف دو کس لئے؟ ایک مزار ایک عورت کس لئے۔ ایک اکرم اور ایک مذہبی
 کس لئے؟ اے خدا۔ اس ملک میں محبت کرنا اتنا بڑا گناہ کیوں ہے۔

وہ دن ختم ہو گیا۔ کتنا خوب صورت دن تھا۔ کتنا بھرپور میل، منہا، سورج کی دھمکی ہوتی۔
شعاعوں کا لباس پہنے ہوئے، آج بستی میں بھی ہر کوئی خوش تھا جیسے آج کوئی قوی میل ہو جس
میں ہر فرشتے، ہر خیال اور ہر مذہب کے لوگ مٹے رہے ہوں۔ جیسے آج بستی میں قوس و قزح
اتر آئی تھی اور اس نے اپنی رنگارنگی سے دلوں کو شاداب کر دیا ہو۔

کمال کا کہے سب لوگ آج جلدی سے سو گئے۔ بون بھر کے تھکے ہوئے تھے۔ ستیہ رائے
بھی مکے دس سال کی بچہ زلی کا پروگرام بنا کے کر گیا۔ جنا بھی جو آج دن بھر نہ سوتی تھی، آج کئی ہزاروں
کے بعدوات کی مہربان آغوش میں اپنے بازوؤں کا بچہ لے کے سو گئی۔ صرت اگر مہربان اور دیرینہ
جاگتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں نیند نہ تھی۔ آج بہت سے پرانے دوست اُس سے چھوٹے گئے تھے
اور نئے ساتھی اسے ملے تھے۔ ایک زندگی کا دروازہ اس پر بند ہو گیا تھا اور دوسری دنیا نے اپنے
بٹ اس کے غیر مقدم کے لئے کھول دیے تھے۔ کامیابی نئے کی طرح تھی۔ پھر بھی وہ اپنے دل میں
خدا ماحوت نہ دے تھا۔ خدا ماحوت چاہتا تھا۔ یہاں سے اب وہ کہہ سکتا تھا۔ اس کے دل میں ایک
عجیب مہل سی تھی، ایک طوفانی جہانی کیفیت، یادوں کی، خیالوں کی، جذباتوں کی، بھگتوں کی تصویریں
کی اور ان کی پر مہائیاں اس کی روح پر ایک کونے سے دوسرے کونے تک چھاتی ہوئی تھیں اور وہ

سوتا پانا تھا۔ یہ ایک چوتھے پر فیہ آگے بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ میں گلاب کا ایک پھول تھا۔
اکرم نے پھول کی طرف دیکھا، پھر فیہ کی طرف۔

”فیہ بولی: ”یہ بابرام نے مجھے دیا ہے۔“
اکرم سکرایا، مگر فیہ ڈرا بھی نہ سکرائی۔ وہ بہت ادا سی تھی۔
اکرم نے کہا: ”جسٹن تو خوش ہونا چاہئے۔“
فیہ اس کے آٹھ ہے۔

”کیوں؟“

جواب میں فیہ نے اس سے ایک سوال کیا: ”تھا کیا خیال ہے۔ بابرام کی کیا عمر ہوگی؟“
”کوئی باون تین برس کے قریب ہوگی۔“
”میں اس خبر میں جس برس کی ہر باؤں گی۔“
”اس سے کیا ہوتا ہے؟“

”ہر گز ہے اور نہیں بھی ہوتا ہے۔“ فیہ نہیں کے بولی۔

”وہ نہایت مشکل فیئر بائیں کرتا ہے۔ کسی طرح سے کوئی بھی حسرت اس سے جنت کر سکتی ہے؟“
”کیا ہوا؟“

وہ آج شام کو جب تم لوگ یہاں نہیں تھے میرے پاس یہ پھول لے کے آیا۔ پہلے تو بہت دیر تک
اموش بیٹھا رہا۔ ہاتھ میں پھول کو پھول کی طرح نہیں چمتی کی طرح پھڑپھڑے ہوئے۔ فیہ نے وہ نہیں
میں نے پرچا لیا ہے۔ ہلا۔۔۔۔۔ یہ گلاب نہ پھول ہے۔ میں نے کہا اتنا تر بجے بھی لگائی
ہے۔ اس پردہ بے پردہ چپ ہو گیا۔ اور اب اس نے اس پھول کو اپنے ہاتھ سے یوں نیچا کر لیا
یہ آدمی کسی منزل پر پہنچ کر چلتے کر چھا کر رہتا ہے۔ تو یہی پھول اس کے ہاتھ میں تھا۔ پھر اس نے کہا

”میں یا کروں“ رُفیع ایک آہ بھر کے بولی۔ ”وہ اگر بادن برس کا نہیں تیس برس کا بھی ہوتا جب بھی میں اسے جنت نہیں کر سکتی تھی۔ کیوں کہ میں کسی اور سے محبت کرتی ہوں۔ اور اگر میں کسی اور سے محبت نہ بھی کرتی ہوتی تو بھی اس سے محبت نہیں کر سکتی تھی۔“

”ہائے وہ کس قدر مُنک خیز ہے۔“

”بالکل بُرے آؤ کی طرح میری طبت دیکھتا ہے۔ اُجالا!“ رُفیع پہلے شہی۔ پھر ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ بولی۔ ”وہ کہتا تھا جب میں نے اس سے پوچھا تھا کہ میری عمر چھتیس برس کی ہے۔ وہ کچھ تو دسے کے کسا صوٹ ہوا؟“

اکرم ہوا۔ ”وہ نہیں اس کی محبت بہت ہوٹ ہوں رہی ہے۔“

یہ ایک وہ دونوں آدمیوں سے ہو گئے۔ ابراہام کی بادن برس کی بچرا اور بے معنی زندگی پر سیدہ جیدہ کی طرت ان کے سامنے پہنچی پہلی گئی۔ اس زندگی میں کہیں ایک ہلچل نہ تھا۔ پھول کی ایک کی نہ تھی۔ پھولوں سے لڑی ہوتی ایک ڈانی نہ تھی۔ سمرت رُفیع آلفہ پائپوں کے اسٹوڈیو شاپ ہزاروں۔ لاکھوں کروڑوں کی تعداد ریت کے فتول کی طرح اس کی زندگی کی سطح پر پھیلے ہوئے تھے۔ بادن بے شکایتیے والے طویل برس ریت کے ٹھیلے ہوئے ٹیلوں کی طرت ابراہام کی زندگی میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک کھڑے تھے۔ ایک قتل تو وہ ہوتا ہے جس میں آدمی کو گواگونٹ کر مار دیا جائے لیکن یہ کس قسم کا قتل ہوتا ہے جو ابراہام ایسے لوگوں کی زندگیوں سے روا رکھا جاتا ہے۔ کیوں یہ لوگ ایسا کرتے ہیں۔ ایک دن نہیں۔ دونوں نہیں۔ ساہا سال ایک ہی آدمی کو گٹکا گٹکا کے مار دے سہتے ہیں کہ پھر کوئی امید نہیں رہتی۔ کوئی سکڑا ہٹ نہیں رہتی اور کوئی یاد نہیں رہتی۔ اور کہیں پر کوئی پھول دکھائی نہیں دیتا۔ اور کہیں پر کوئی آسمان نظر نہیں آتا۔ سمرت، مع، تفریق، ضرب تقسیم، سمرت مع تفریق ضرب تقسیم۔ ۱۰۰۰!

رُفیع نے آہستہ سے کہا۔ ”جب میں نے پھول لے کے بھی اس سے کہہ نہ کیا۔ اس کا شکریہ تک ادا نہیں کیا۔“

اکرم نے چھ مہینوں میں تصویر نکل کر لی۔ اس نے اس کا ہم دکسان رکھا۔ سرانے کی کمی، اور چند بڑے بڑے پروڈیوسروں کی دہلی بی سرگوشیوں میں چلنے والی مخالفت کے باوجود اگر یہ تصویر بننے کے بعد سے میں نکل رہی تھی۔ تو اس میں اکرم کی دن رات کی ان تھک محنت کے علاوہ اس کے یونٹ کے لوگوں کی ہر خوش خدمت اور سٹوڈیو کے مزدوروں کی ہر غلوں مسامی کو بڑا دل تھا۔ انڈسٹری کے جو چھوٹے چھوٹے لوگ تھے۔ وہ ایک طرف سے اس تصویر کو اپنی تصویر سمجھتے تھے۔

اس دفعہ اکرم نے بھی پوری کوشش کی تھی کہ وہ بیت اور پانڈا اٹھے۔ ان تمام غلطیوں کا اعادہ نہ کرنے جو اس نے کچھلی تصویروں میں سرزد ہوئی تھیں اس بار جو مسئلہ اس نے اپنی تصویر میں اٹھایا تھا۔ شہری مسئلہ نہیں تھا۔ کسان اور اس کی زمین اور جاگیر وادی، زمیندار کی نظام زیادہ تر وہابی مسئلہ تھا۔ مگر ہندوستان، دیہاتیوں میں جود ہوتا ہے۔ اس لئے اکرم نے یہ مسئلہ اٹھانا مناسب سمجھا۔ مگر اس بار اس کے کردار تقریری نہیں کرتے تھے۔ اپنے عمل سے اور حرکات و سکنات سے بولتے تھے اب کچھ بار اس کا گاؤں ایک کچھ کا گاؤں تھا۔ کسان کچھ کا کسان معلوم ہوتا تھا۔ وہ فلی کسان نہ تھے۔ اس کی ہیر وئی کھیتوں میں کام کرنے والی ہیر وئی معلوم ہوتی تھی۔ ہیر وئی حقیقت کے اس قدر

قریب تھی کہ گاؤں کی زندگی سے مربوط۔ اس بار اکرم کے کردار بالکل سیاد اور معیہ نہیں تھے اور نہ ان
 تھے اپنی تمام خامیوں کے باوجود چھوٹے چھوٹے انسان۔ ان کی زندگی بڑی تلخ اور بڑی مصیبت کی
 تھی۔ مگر اکرم نے کہیں بھی کوشش نہ کی تھی کہ وہ مصیبت کو اتنا بڑا معاملہ کر دکھائے کہ زندگی کے
 دوسرے پہلو اس میں چھپ جائیں۔ یہ تو مرکزی نقطہ تھا۔ یعنی زمین اور اس پر کام کرنے والے کسان
 مگر آندھروں کے درمیاں ہنسی بھی تھی۔ چاندی کی گھنٹی کی طرح سرٹتی ہنسی۔ جو کبھی تو زندگی کے چھوٹے
 چھوٹے دکھوں کو اپنی شاداب آواز میں گھلا دیتی ہے اور کبھی بڑے دکھوں کو تھلا دے زیادہ اُبھار دیتی ہے
 لیکن اب کے یہاں اس تصویر میں ہنسی بھی تھی۔ صاف ستھری زندگی سے بھرپور محبت کرنے والی ہنسی
 اور گیت۔ گاؤں کے ٹیٹو گیت۔ کھیتوں میں گانے جانے والے۔ چڑیا بوں میں گونجنے والے۔ چچی کی گھر گھر
 اور سیاد کی پر شور چل پہل میں گانے والے گیت زمین اور زندگی کے ساتھ جدم سے جوئے گیت اور ناچ
 اکرم نے اس سے فائدہ اپنی کسی تصویر میں مانج نہیں رکھے تھے مگر اس نے دھواں لے دھواں کی سبقت سے
 فائدہ اٹھایا تھا۔ وہ تیرہ ایک ایسی تصویر کی صورت میں نمودار ہو رہا تھا جو اپنی تمام خامیوں کے باوجود ایک
 چھوٹے سے ہندوستانی گاؤں اور اس کی زمین اور اس کے کسان کے مسئلے کی ایک مٹی جگتی اداسی
 دستاویز تھی۔ اکرم کو سنسکرت کا بہت خوف تھا۔ اگر سنسکرت نے اصل موضوع ہی سے اتفاق نہ کیا تو اس کی
 ساری محنت پر پانی پھر جائے گا۔ موضوع کے اعتبار سے اس میں سیاست کا بھی دخل تھا اور وہ لوگ
 جو زمیندار تھے اور جاگیر دار تھے اور صدیوں سے ہندوستان کی پچھرتی صدی آبادی کی معاشی، سماجی اور
 تہذیبی زندگی پر قبضہ کئے بیٹھے تھے وہ کس طرح اس تصور کو چلنے دیں گے۔ اور اکرم نے جہاں تک
 مرکزی نقطہ پر کہنے کا حق تھا۔ اس پر ٹری بے باکی سے، بڑی فن کاری سے مگر صاف صاف کہہ دیا تھا
 کہ زمین کسانوں کی ہے اور جو غاصب ہیں انہیں زمین اور کسان کے بیچ میں سے ہٹا دینا چاہیے۔ اس
 مرکزی نقطہ پر اکرم نے کسی قسم کا بھگوتہ نہیں کیا تھا۔ اس لئے وہ سنسکرت رائے سے بہت

ڈر رہا تھا۔

مگر یہ دیکھ کر اُسے ایک گونہ حیرت اور پھر شہت بھی ہوئی کہ سنسنے اس کی تصویر پر کبھی قسم کا کوئی اعتراض نہیں کیا۔ پوری تصویر ایک فٹ کالے جانے کے بغیر پاس کر دی۔ نہ حیرت پاس کر دی گئی بلکہ سنسنے نے اکرم کے اقدام کو سراہا۔ اُسے ذاتی طور پر مبارکباد پیش کی۔ کہ اس نے اتنے بڑے قوی مسئلے پر ایسی جرأت کرنا تصویر بنائی اور فلموں کے تمام رجحان کے خلاف ایک نہایت صاف ستھری مشق مذاق کی خوب صورت تصویر تیار کی۔

اکرم اس تعریف سے بہت خوش ہوا۔ کیونکہ یہ تعریف خلاف توقع تھی لیکن پھر کو فانس کرنے والے سینٹو کمرچند کا چہرہ اتر گیا۔ اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ اور جب نائش کا دسے واپس آئے ہوئے اکرم اور ستیہ رائے نے سینٹو سے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے غصے سے چلا کے کہا۔

”تم نے مجھے ڈبو دیا۔ کہانی کچھ سہنائی اور اب کچھ بنا دی۔“

”کیا شہب کیا؟ ستیہ رائے نے پوچھا۔“

”سنتے نہیں سنئے سنہ کیا کہہ رہا تھا۔“

اکرم نے کہا ”وہ سب تو تعریف کر رہے تھے۔ کہہ رہے تھے دس سال میں پہلی بار ایسی تصویر آئی ہے۔“

سینٹو نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مار کے کہا ”جس کی سنسنے تعریف کرے مجھ کو اس تصویر کی قیمت پھوٹ گئی۔“

”کیا بات کرتے ہو سینٹو جی“ ستیہ رائے نے برا فروخت ہو کر کہا ”ہم نے جھنڈا....“

”رہنے دو اپنے جھنڈے کو“ سینٹو کمرچند نے فوراً ستیہ رائے کی بات کاٹ کر نہایت ہی غصے سے کہا

”بڑے آئے جھنڈے خاں کہیں کے ہیں بیس سال سے انڈسٹری میں بھاڑ نہیں جھونک رہا ہوں

”سیٹر کا غلم نہ کرو“ اکرم بولا ”دوسری ششماہی میں صرف دس دن اور بچے ہیں۔ میں نے یہ تصویر
چھو بیٹے اور دس دن میں تیار کی ہے۔ تم نے خود ستیرائے سے کہا تھا۔ تم اس دس دن کے لئے
سود نہیں لوگے۔ دوسری ششماہی کا سود نہیں لگاؤ گے۔“
”میں نے باطل نہیں کیا تھا“ سیٹر نے کہا۔

”تم — تم جھوٹ بولتے ہو ستیرائے نے غصے میں آپ سے باہر ہوتے ہوئے کہا اتنی بددیانتی،
تم نے ہی آدمیوں کے سامنے کہا تھا۔“

”ذرا غصہ الٹ میں نے کے آنا انہیں“ سیٹر کوڑھنے لگا ”مگر اے کہا“ مجھے جھوٹا اور بددیانت کہنے والے
کون ہیں۔ میں ان کا چہرہ دیکھنا چاہوں گا۔“

خیر میں نے کہا براہ کیا ہو چکا سیٹر کیٹ میں تو لکھا ہے کہ چھ ماہ میں اگر تصویر تیار نہ ہوئی تو دوسری
ششماہی کا سود چر جائے گا۔ تم دو دن کان کھول کر سن لو اور اس حساب سے تمہیں ستر ستیرائے، بچے
دوسری ششماہی کا سود دینا پڑے گا اور اس حساب سے ستر اکرم نائی غلام کے بڑے اور ستر ستیرائے
کو تمام ٹیری کوڑھنے سے مذہب وصول ہو جائے گے بعد ازیں مجھے آٹھ ہزار کی رقم دینا پڑے گی جسے
وصول کرنے کے لئے مجھے ان کے خدات عدالت سے ڈھرنی لے کے ان کے باہم کے فلیٹ پر لٹائی
لائی پڑنے گی۔ اور ان کے زیرِ کمر سے ڈیڑھ گرام سود وصول ہو جائے گا اور ان کے کواچی کرنا پڑے گا۔ اور تو
کوئی طریقہ ہے نہیں۔ ستیرائے فاب سے روپیہ وصول کرنے کا۔“

یہ کہہ کر سیٹر چلے گئے دو دن کو کلاسی سے اٹھ دیا اور اپنی بیوی کے پاس گیا کہہ کر اپنا زوی روز کی جانب
لے گیا اور ستیرائے اور اکرم دو دن تک دوسرے ماند دھجے رہ گئے۔

کمر مرنے غصے میں کہا ”سالہ جب کہتے پھر مٹل نہیں ہوئی تھی کہتے تھا اکرم بیٹا میں دوسری
صورت بھی تمہارے سنگ بناؤں گا۔ ابھی سے انا دھن کر رہا۔“

ستیرائے کہا ”پاجی سارا دہ پیہ خود کھا لینا چاہتا ہے“
 ”صرف یہی نہیں اکرم نے کہا ”وہ تو تمہارے فلیٹ پر قرقی لا رہا ہے“

جب سے تصویر کا کام شروع ہوا تھا۔ ستیرائے چونکہ پروڈیوسر تھا اسے بہت سے
 ڈسٹری بیوٹروں اور دوسرے فنانشروں اور سرمایہ داروں سے ملنا پڑتا تھا اس لئے وہ جتنی چھوڑ کر
 چلا گیا تھا اور اہم میں اس نے ایک فلیٹ لے لیا تھا اور اُسے ایک فلمی پروڈیوسر کے فلیٹ کی
 طرح سہایا تھا۔ ٹیلی فون ریفریجریٹر، ڈیو گرام، غلیچے، مٹھی پر دے۔ اگر کوئی کئی تھی تو ایک سوئی اکھ
 ایک داسشتہ کی اور یہ دونوں ہی بہت ہنگامی تھیں۔ گو ستیرائے موٹر کے خلاف تو نہیں تھا لیکن
 داسشتہ کے بہت خلاف تھا اور جب اس کے دوسرے دوست جیسی جیسی میں اس کا مذاق اڑاتے
 ہوئے کہتے ”تم کیسے پروڈیوسر ہو۔ تمہاری تو کوئی داسشتہ ہی نہیں ہے“ تو ستیرائے جس کے جواب
 دیتا ”میں خود ہی اپنی موٹروں خود ہی اپنی داسشتہ ہوں“

”تمہی کہتا ہے، مجھے اس کی فکر نہیں ہے۔ ستیرائے کا پتہ پھر صرف فٹ پا تو ہو سکتا ہے مجھے اس
 بات کی اتنی فکر نہیں ہے جتنی اس بات کی کہ وہ اسے کہیں دوسرے تیسرے درجے کے فیئر میں نہ
 ڈال دے۔ اور اس کی اچھے طریقے سے سلیٹی نہ کرے۔ اکثر اوقات ایک عمدہ تصویریری سلیٹی سے
 مر جاتی ہے“

ستیرائے کا غصے سے تھمتا ہوا چہرہ فوراً تبدیل ہو گیا اور وہ اپنی جیسی روک دسکا سکواتے ہوئے
 کہنے لگا ”دیکھو اکرم میں دعا کرتا ہوں یہ سچ نہ ہو مگر بھائی جانے کیا بات ہے۔ ہر نامو ایسا ہی ہے جب
 تصویر کی سنہ تعریف کہتے ہی وہ سالی دودن میں اڑ جاتی ہے“

”اوہام پرستی ہے اور کچھ نہیں۔ اکرم نے چلا کے کہا
 ”نہیں اصل بات یہ ہے۔ ستیرائے نے بمشکل اپنی جیسی روک کے کہا ”سنہ دے جو بڑے

ہیں۔ بہت سے اسی میں سے اب زندگی کی اس منزل پر پہنچ چکے ہیں۔ جہاں فطری طور پر انہیں دلچسپی نہیں جو ان اور صحت مند فلمیں مری معلوم ہوتی ہیں۔ ان کا شوق کھلناڑا پن انہیں ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے وہ عموماً ان فلموں کی تعریف کرتے ہیں جو عوام کی دلچسپی کی نہیں ہوتیں..... بچے بھی ڈر لگتا ہے کہیں یہ تصویر کب نا کام نہ ہو جائے۔ تو پھر گھبراہٹ اور رعب بستر بستی سے گول! اکرم نے کہا "تم دیکھتے جاؤ۔ آج تو کچھ سنس ہوئی ہے۔ ایک بڑا سا شو کرتے ہیں میں یہ نکتہ بہ نکتہ اور خیالات کے لوگوں کو بلاتے ہیں۔ اسی سے تصویر کے بارے میں صحیح رد عمل معلوم ہوگا"

مگر اس پرائیوٹ شو سے بہت پہلے بہت سی باتوں میں گولاڑ ہو گئی۔ سینٹھ نے سہارے کی دوسے بہت سی چھوٹی موٹی غلام و درزیوں کی مثالیں دے کر ستیہ رائے کے کمان تصویر کا ٹیکٹو اپنے نام کھوا دیا۔ پھر اس نے اپنے آٹھ ہزار روپے کا اتفاق کیا اور ایک فوجی بھتہ کھل کے ستیہ رائے کے غلام ڈگری حاصل کر لی۔

ایک چچی تصویر بنانے کے بعد بھی اکرم کے منہ میں ایسا ذائقہ تھا جیسے وہ لکڑی کا براہہ کھا رہا ہو۔ یہ لوگ تصویر نہیں دیکھتے، اس کا تاثر اس کی خوبصورتی، اس کی عجیبی صفات پر غور نہیں کرتے۔ اب تو اس بچہ کی سب ٹیری ٹوری بک چکی ہیں، تجارتی اعتبار سے اس میں منافع بھی ہے مگر

سیٹرونگ موف ساف بھی نہیں دیکھتے۔ یہ سارے کا سارا بندھن ان کی جیب میں جانا چاہئے۔ وہ لوگ جنہوں نے گذشتہ چھ بیسے اس پر غمت کی ہے فائیں فلز کا سائبہ جنہوں نے اُدھی تھراو پر کام کیا ہے۔ شوڈاؤ کے مزدور جنہوں نے اسٹوڈیو کی شوٹنگ کا سرت اُدھا رو پیہ لیا ہے۔ اُدھا اُدھا رو پیہ ہے۔ ڈائریوین کی لڑکیاں۔ اکثر ابونین کے لوگ بستی کے لوگ جنہوں نے اس پگھیں کام کیا ہے۔ ان سب لوگوں کی اُجرتیں ماری جائیں گی۔ چائیل کے وہ مزدور جنہوں نے وودوئے کر کے اس فلم میں چندہ واپس اُن کے تین سو روپے تک واپس نہیں ہو سکیں گے۔ جتنا — کیا زندگی ہے ایک تسویر بنانے کے بعد اتنے سینکڑوں آدمیوں کی مسلو اتیں سننا پڑیں گی۔ کوئی نہیں کہے گا کہ سیٹو کٹر چند نے بد معاشی سے کام لیا ہے۔ سب ستیہ رائے کو اُدھ اکرم کو گالی دیں گے۔ یہ لوگ رو پیہ کھائے قوم کے نام پر ترقی پسندی کے نام پر۔ ایک یا دو آدمیوں کو بھانا آسان ہے۔ اتنے سینکڑوں آدمیوں کو کیسے بھایا جائے گا۔ کیسے انہیں بتایا جائے گا کہ محنت کے رس سے چمکتا ہوا ہیں کس طرح معنی شائخوں سے توڑ کر ناصب کے ہاتھ میں دے دیا جاتا ہے جو اس سانچ کا بدھی اصول سہنہ۔ ہر شخص کسی نہ کسی طریقے سے اس عمل کو اپنی زندگی کے دائرے میں دیکھتا ہے گردن اپنی زندگی میں نہ اپنے کو مظلوم اور دوسروں کو بے ایمان سمجھنے پر مجبور ہے وہ لوگ کسی طرح ان کی باتوں کو نہیں کریں گے۔

جس وقت بے کیا کسی نہ کسی طریقے سے ستیہ رائے کے فلیٹ کو اس ٹائپ سے بچا پاتا ہے۔ مگر کس دل سے ستیہ رائے پریشان ہو گیا۔ پوچھا رائے سے کہ اس بری طرح تو نہیں ہے تو جھٹکا اٹھا کر کہے کہ وہ چپ ہو گیا۔

کوئی نہ کوئی رستہ نکالے گا۔ سیدھا نہ سہی طرہ تھا ہی اور وہ اپنے خیالوں میں مستغرق ہو گیا۔

قرنی کے دی جب سیٹر کٹر چند سیلٹ اور اس کے پانچ آدمیوں کو لے کر ستیہ رائے کے فلیٹ میں داخل ہوا تو اس نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ دس بارہ آدمی فلیٹ میں جمے ہیں اور حلق کر رہے ہیں حلق چیزوں کے قریب دھرتا دئے خاموشی سے بیٹھے ہیں۔ سیٹر کٹر چند نے اِدھر اُدھر دیکھا، مگر کوئی شخص اس کی تعظیم کے لئے نہیں اٹھانہ کسی نے اُسے آداب کیا۔ سب خاموشی سے اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہے۔

سیٹر کٹر چند نے بھونک کے کہا ”طہانچ لویا ہوں“

ستیہ رائے نے کہا ”لئے ہر تو لے آؤ۔ لے جاؤ حوالہ تھا رہا ہے“

سیٹر نے اِدھر اُدھر خاموشی سے دیکھا، مگر کوئی اپنی جگہ سے ہلا نہیں اُسے ایک گونہ حیناسی ہوا وہ ریڈیو گرام کے پاس گیا۔ وہاں دھوئے پنا سر منڈائے، ہاتھ میں ایک ذنی ہسٹو ڈالے بیٹھا تھا سیٹر نے ریڈیو گرام پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ”یہ فرق کرو“

سیٹر کے ہاتھ پر زور کا ایک ہتھوڑا پڑا وہ جیلا کے اور اچل کے ریڈیو گرام سے دو فٹ پرے جا رہا ”کیا بات ہے، کیا بات ہے۔ دھکا کرنا چاہتے ہو“

دھوئے بولا ”میری چیز کو تم ہاتھ نہیں لگا سکتے“

”تمہاری بیڑا“

”ہاں“ ستیہ رائے یہ ریڈیو گرام عرصہ ہوا مجھے فروخت کر چکا ہے۔ یہ کانڈ دیکھ لو، دھوئے نے کانڈ خاموشی سے سیلٹ کو دکھائے، کانڈات تانوفی تھے، بائبل درست ریڈیو گرام عرصہ ہوا فروخت

ہرچکا تھا۔

سیٹھ کتر چند غصے میں ریفریجریٹر کی طرف بڑھا۔ وہاں سودا میں جیت سنگھ ہاتھ میں ایک بڑا سا سونا بھلے ایک اسٹول پر بیٹھے تھے اُن کا سونے والا ہاتھ ریفریجریٹر پر تھا۔ سیٹھ کو اپنی طرف آنے دیکھ کر زور سے بولے ”سٹیا! دھر نہ آؤں۔ پہلے سے کہتا ہوں۔ ادھر نہ آؤں۔ نہیں تو مارا سارے پھلجڑی بنا دیوں گا۔“
 (یہ کادو دیکھ لے ”من جیت سنگھ نے کاغذ بلیٹ کو دکھایا، بالکل ٹھیک تھا قانونی حیثیت سے اس فرخت میں کوئی نقص نہ تھا۔ سیٹھ ریفریجریٹر کو ہاتھ نہ لگا سکا۔

سیٹھ نے بھناکے کہا ”اچھا یہ سو ذرا اٹھا لو یہاں سے“

مگر سو سیٹ بھی بکا ہوا تھا تین مزدور وہاں بھی بیٹھے تھے ایک سے ایک ٹھوڑا اور ہاتھ میں اُن کے بازوؤں سے بھی ٹھوڑا اور قانونی پرزد۔

”قریب غالیجہ“

مگر غالیجہ بھی بک چکا تھا۔

کریاں، اسٹول، میز، الماریاں، کپڑوں کی کمونیاں تک بھی ہوتی تھیں غصے کے مارے سیٹھ کے منہ سے جھانک نکلتے گئی۔

اس نے چلکے پوچھا ”یہاں کوئی چیز ایسی بھی ہے جو پہلے سے بکی ہوئی نہیں ہے؟“

”ہاں ہے؟ اگر م نے بڑی گھبر آواز میں کہا ”یہ میری قلم دوات ہے آٹھ تک کوئی خرید نہیں سکا اسے تم فری کر سکتے ہو۔“

ستیرا نے سیٹھ کتر چند کے قریب آیا اور کہنے لگا ”اسی قلم سے ایک نیا چیک لکھ دو دس ہزار روپے کا۔“

”۲۳ ہے کتنے؟“ سیٹھ کتر چند نے حیران ہونے کے پوچھا۔

”دوسری بچہ کے ایڈوانس کے لئے۔ میں دوسری بچہ تیارے لئے بنا تا ہوں۔ دس ہزار ایڈوانس کرو یہ آٹھ ہزار جو تم نے مجھ سے زبردستی کا لیا ہے اس رقم کو بھی اگلی بچہ میں ڈال دو“

کتر چند ستیرائے کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھنے لگا۔ تجریر مسقول تھی۔ مگر اس وقت اُسے اپنی اکائی پر منت غصہ آ رہا تھا۔ اس نے فلم دولت اٹھا کر فلیٹ کی کڑائی سے باہر پھینک دی اور غصے میں جھلٹا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد بلیف اور اس کے آدمی بھی چلے گئے۔ ان سب کے جانے کے بعد ستیرائے نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر چلا کے کہا ”جسٹہ اگاڑ دیا۔ رکھا! ہاندھا! تانا کیچھا اور کیچہ کے چھوڑ دیا۔ جاؤ بیٹے نکلے رہو۔ گھو بھیا“ ستیرائے نے جسوت سے پوچھا ”کیسی رہی میری ترکیب“ جسوت نے تعریفی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کے کہا ”اب لوگوں سے جتنا تم خوب جانتے ہو“

ستیرائے نے کہا ”اور کیا، اب ہم ان چیزوں کو بیچ کر جن لوگوں کی رقیں باقی ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ جن رقموں کا حساب تصویر کے ذریعہ دو تو سٹھ کیا سینٹھ کے باب کو بھی دینی پڑی گی۔ لیکن کچھ رقمیں جو ذاتی حیثیت میں ہم نے رکھی ہیں جھٹاٹیل کے مزدوروں کا قرضہ جتنا کاروبار بستی کے پیشان خیمہ زخان کا روپیہ یہ روپیہ تو ہم اب واپس کر سکتے ہیں۔“

جسوت نے ستیرائے کا ہاتھ دیکھ کے کہا ”میں نے سمجھا تھا تم صرف صوفیوں کے دلال ہو۔ معلوم ہوا تم انسان بھی ہو۔“

ستیرائے خاموشی سے مسکراتا رہا جسوت نے پوچھا ”اب تم کہاں جاؤ گے“

”رہی تمہارے پاس بستی میں صرف فٹ پاتھ بھی! ستیرائے کا وہی پرانا پتہ ہے اب تو“

پرائیویٹ شو کا دن آن پہنچا۔

اکرم نے طرح طرح کے لوگوں کو بلایا تھا۔ فلم انڈسٹری کے سربراہان وہ لوگ تو موجود تھے ہی۔ مگر اکرم نے فرزندوں۔ چھوٹے چھوٹے دوکان داروں، طالب علموں، ٹیکسی ڈرائیوروں۔ کام کرنے والی عورتوں کو خاص طور پر مدعو کیا تھا اس نے انگریزی تصویریں دکھانے والے تمام سینماؤں کے منبر لوگوں کو بھی دعوت دی تھی۔ ان میں ماترو سینما کا امریکی منبر جان رولینڈ بھی شامل تھا۔

”ماترو سینما کے منبر کو کیوں بلاتے ہو“ دھومے نے چلا کے کہا ”وہ فرزند تہاری تصویر دیکھے گا یا کی؟“

اکرم نے کہا ”میں تو سب کو بلاؤں گا، امریکی ہوا تو کیا ہوا، کیا امریکی کسی اچھی چیز کو پسند نہیں کر سکتا“ دھومے نے ہنس کر طنز کیا ”ہاں کیوں نہیں پسند کرے گا بہت جلدی تم نے سن آت انڈیا ایسی بکھر تیار کرلے ہے بہت اس میں راجہ ہمارے ہیں۔ سانپ میں جوگی ہیں۔ نیم عریاں ناچ میں ناچو وہ اسے ضرور پسند کرے گا؟“

اکرم حینہ پ گیا ”بہت سے امریکیوں کیا بہت سے مغربیوں کا ہندوستانی کے بارے میں یہی نظریہ تھا۔ مگر اکرم جب بھی ڈھارہا۔ کہنے لگا ”اُسے بھی ایک سو فی صدی ہندوستانی فلم دیکھنے دو کیا ہرج ہے؟“

اور اس طرح سے ماترو سینما کے امریکی منبر جان رولینڈ کو ”کسان“ کا پرائیویٹ شو دیکھنے کی اجازت ملی وہ چھوٹا اونچا لانا بہت ہی عمدہ گوشت اور بہت ہی عمدہ محکم پر پلا ہوا امریکی تھا۔ نیوارک کا رہنے والا۔ پتلے پتلے زپ کی طرح بند ہو جانے والے ہڈوٹ۔ فلاو کے رنگ کی سی آنکھیں،

جہاں پڑ جائیں وہاں گویا ایک کیل کا ڈوب۔ بڑے بڑے ہاتھ بے عیبے چین اور مضطرب جب
”کیان کا شوختم ہوا تو حسب دستور اکرم کو ڈائریکٹروں اور اداکاروں نے گھیر لیا۔

جمال آبادی ڈائریکٹر نے اکرم سے ہاتھ ملا کے کہا۔ ”راہ داد لطف آگیا۔ پھر منہ پھیر کے اپنے
دوست گوند شرم سے کہا۔ ”سارے نے بور کر دیا۔“

ڈائریکٹر دھیرندرا کے اکرم سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا ”فائن“ دھیرندرا کمار کا سکراما ادا گورا
چہرہ غلوں اور محبت کی زندہ تصویر تھا۔

اکرم نے سر جھکا کے شکریہ ادا کیا۔

دھیرندرا کے واپس جاتے ہوئے اپنی بیوی سے فریب کہا ”بھواس“

جوشی جی نے اکرم کو گلے لگایا ”واہ۔ واہ۔ کیا تصویر بنائی ہے تم نے ہندوستانی فلم انڈسٹری کی

لاج مکملی۔ جوشی نے جوشی میں آکے اکرم کا منہ چوم لیا۔ اسے اکرم تم GENUS ہو GENUS
کیوں سیٹھ۔“

جوشی جی نے سیٹھ باجوا سے داد چاہی۔

سیٹھ باجوا بڑی دیر تک اکرم کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے رہتے ہوئے ”کیا بتاؤں اُن دنوں میں
لے تمہاری قدر نہیں کی۔ میری نظلی تھی۔ پارٹیاں تم کسی دن دفتر میں آ جاؤ۔ مگر دفتر میں آنے سے پہلے
ٹیلی فون کر لینا اور دو غلوں کے کانسٹیبل پر دستخط کے اپنا ایڈریس لے جانا“

اکرم نے پھر سر جھکا کے سیٹھ باجوا کا شکریہ ادا کیا۔

اکرم سے دور جا کے سیٹھ باجوا نے جوشی سے کہا۔

”جوشی جی بال بال بک گئے۔ یہ اکرم تو پھر میرے چار لاکھ پر پانی پھر دیتا۔“

”اجی کیا پوچھتے ہو سیٹھ! ایسی بڈل بچہ زندگی میں میں نے نہیں دیکھی۔ سارے کوشاٹ لینے کی تیز

نہیں ادا جلتے ہیں مگر سے ڈائریکٹر بننے! اس تو سیٹ پر کلپر لوائے نہ رکھوں اسے! جی جی اور سیٹھ باجھو یا اسی طرح باتیں کرتے ہوئے آگے نکل گئے۔

راج ہمشاد اور رجن نے اک بڑی خوب صورت سی تھلیٹ بنا کر اکرم کو گھیر لیا وہ بہت ہی عمدہ سا فرمایاں اور بلاؤز بہن کے آئی تھیں۔ ان کی نگاہیں بار بار اکرم کی تصویر کی تعریف کرنے ہوئے ادھر ادھر بھٹک جاتیں۔ وہ نگاہیں دراصل فوٹو گرافر کو تلاش کر رہی تھیں جو اس موقع پر کاپیوز لے لے۔ عمدہ سا فوٹو لے لے تو قیفا کل کے اخبار میں آجائے گا۔ حالانکہ ان تینوں میں سے کسی نے کسان میں کام نہ کیا تھا مگر یہ سبٹنی کرنے والے کہاں اصل کام کرنے والوں کو دیکھتے ہیں۔ وہ تو خوب صورت اور مشہور چہرے دیکھتے ہیں۔

شمشاد نے مسکرا کر اپنی گہری آنکھوں سے اکرم کو دیکھتے ہوئے نیم اُٹاس لے لی ہیں کہا ”کئی جگہ تو میں سو فی پڑی۔ آپ بڑے ظالم ہیں“

راج نے چمک کے کہا ”ارے ان کے ظالم کا کچھ مت پڑھو یہ تو بہت بڑے شاعر ہیں۔ پہلی بھی اداکاروں سے قربات کرنا بھی گناہ سمجھتے ہیں۔ اب تو یہ کچھ سلور جوبلی منائے گی۔ اب ان کے ٹھکانے دیکھنا۔ ہم غریبوں سے ...“

اتنے میں اتفاق سے ایک فوٹو گرافر آگیا۔ تینوں ہیر دینوں کی جان میں جان آئی۔ راج اپنا فخر بیچ میں چھوڑ کر اپنی ساڑی کا پلو ٹھیک کرنے لگی۔ جلدی جلدی تینوں ہیر دینوں نے اکرم کے ساتھ ایک دلفریب پوز لیا۔ کیرے میں کھٹکا سا براؤن ختم۔ تینوں ہیر دین جلدی جلدی سے اکرم سے ہاتھ ملا کے بلکہ ہاتھ چڑا کے بھاگیں۔

راتے میں شمشاد نے کہا ”یا خدا! تا خوب صورت آدمی ہے۔ مگر اسی پر کچھ کیوں بناتا ہے اور کسے دلچسپی ہے۔ کسانوں کی زمین میں۔ یہاں۔ یہی میں تو ایک کھیت بھی نہیں!“

راج نے کہا ”بہنئیں میں نہیں ہیں۔ مگر بیٹی کے باہر تو ہیں۔“

ششاد نے چڑکے کہا ”گروہاں کھیت ہیں۔ وہاں سینا گھر تو نہیں ہیں۔ کون اس تصویر کو دل چاہی ہے دیکھئے؟“

”رینجا بلی“ ہاں ری۔ اور میروئن کے کپڑے دیکھے تم نے ایک بھی تو اچھا ڈیس نہیں دیا اس کو۔“
 اری جب میرو بھائی بہت کی کچھ کسان پتری“ میں کام کر رہی تھی تو میرا بھی کسان کی بیٹی ہی کا دل تھا۔
 اسی کسان کی طرح وہ غریب تھا مگر میرو بھائی نے مجھے ہندو تھے ڈیس دے تھے۔“

”اری چوڑو“ راج نے چڑکے کہا ”کس کی بات کرتی ہو۔ یہ اکرم سر پر ہے دونوں بھی اس کی بچہ میں جائے
 تو میرا نام راج نہیں گیاراج رکھ دیتا۔“

اس پر رینجا اور ششاد بہت خنسیں۔ رینجا نے ترقی چکا ہوں سے راج کی طرف دیکھ کے کہا ہائے
 راج سے گیاراج۔ ارے بھئی۔ کچھ راج تو بڑی اعلیٰ چوٹل باتیں کرتی ہے۔“

جب میں چھٹ گیا اور بہت کم لوگ رہ گئے۔ اس وقت جان دویلنڈ اکرم کو ایک
 طرف لے گیا اس نے اکرم سے بڑے معمولی طریقے سے مسافر کیا اور پھر بڑی سنجیدہ آواز میں اس سے
 کہا ”تم نے ایک عمدہ تصویر بنائی ہے اس میں کوئی شبہ نہیں میں اسے اپنے سینا میں چلانا پسند
 کر رہا ہوں۔“

”ہاں میں؟“ اکرم کے منہ سے بے اختیار نکلے۔

روڈینڈے آہستہ سے اپنا سر ہلایا۔

اکرم پکڑا گیا مکان " ماتر دین ؛ ایسا تو اس نے اپنے کسی خواب میں بھی نہ دیکھا تھا۔
 روڈینڈے اُسے خاموش دیکھ کر کہا: مجھے نیو یارک سے اس کی منظوری منگانی پڑے گی۔ مگر وہ
 ایک مضابطے کی کارروائی ہے۔ اس میں میرے خیال میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔ میں تمہیں پارہنٹے کی
 کارٹھی دیتا ہوں۔"

ماتر دین پارہنٹے ؛ جان بڑی سے بڑی تصویر دوہنٹے سے زیادہ نہیں ٹھرائی جاتی تھی محال کے
 پینک دی جاتی تھی جہاں کوئی ہندوستانی تصویر آج تک پیش نہ کی گئی تھی جہاں صرف امریکن
 تصویریں پیش کی جاتی ہیں۔

اکرم نے ہاتھ کے اشارے سے سیٹھ کتر چند کو بلایا جس کے پاس تصویر کا نیگیٹو گروی تھا۔ تصویر
 دیر کی گفتگو کے بعد سیٹھ کتر چند جان روڈینڈے اور اکرم اور ستیہ رائے نے ایک دوسرے سے
 ہاتھ ملا اور رخصت ہو گئے۔

"مذیہ تو ایک سپنا ہے۔"

"بہت جلدی ہماری شادی ہو جائے گی اب" مذیہ نے رگ رگ کے کہا۔

اکرم تلچتے تلچتے رگ گیا۔

ایک اور چوڑے نے اکرم کی طرف گھور کے کہا "آگے چلو"

والزنج رہا تھا مگر اکرم کیا سوچ رہا تھا۔ یہ ایک گھورتے ہوئے تلچنے ہوئے جڑے کی طرف
 دیکھ کے معافی مانگ کے سرکایا اس کے ہاتھ پیر روضی کی کمر کی طرف گئے اور والز بجنے لگا
 ”روضی کیا تمہیں انوس تو نہیں ہوگا کہ تم نے دوسرے مذہب کے آدمی سے شادی کی؟
 روضی نے کہا ”میرا تھارا مذہب تو ایک ہے محبت؟“

اکرم روضی کا جواب سننے کے لئے پیرنگ گیا تھا پھر اُسے ایک تلچے ہوئے جڑے کی خنکی کھانا
 کرنا پڑا۔ وہ آتھ مار کے ہنس پڑا اور روضی کو اپنے ساتھ ہال کے باہر کھینچ لایا ”اؤ روضی آج ہم ایک
 سوئس تک چلتے جائیں گے۔ پیدل آ“
 ”کہاں؟“

”یہ تو بے معلوم نہیں! محبت کی کوئی منزل ہوتی ہے؟“
 ”اؤ ستاروں سے پوچھیں“ روضی نے مشورہ دیا۔
 ”اؤ۔“

روضی نے اپنی دونوں باہیں آسمان کی طرف پھیل کے کہا ”اے ستارو!“
 اکرم نے اپنے دونوں بازو روضی کی کمر میں ڈال کے اُسے اُٹھایا، اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں
 ڈال کے کہا ”اے کبکشاں؟“
 ایک سپاہی نے اُسے اُسے ٹھوکا دیا ”اے تم کیا تھے میں ہے؟“
 ”کیا پٹیل ہے کا جو؟“ سپاہی نے پوچھا۔

”نہیں؟“

”طرا؟“

”نہیں۔“

”پھر کیا ہے تو؟“

”عزت!“

پرسیدہ مسکرایا ”احقِ عزت کرنے سے یہی بہتر ہے کہ تو پولیس میں نوکری کر لے“
”کیوں؟“

”کبھی میں نے بھی عزت کی تھی تو میرے سات بیچے میں۔ خواہ شہر روپے ہے۔ عزت کہ مر گئی؟
پولس طے نے گھوڑ کر اکرم کی طرف دیکھا جیسے اُسے پکا کھا جائے گا۔

اکرم نے اک آہ بھر کے روزی سے کہا ”اکو روزی گھر چلیں۔ یہ آدمی بھی ماؤرت پرست معلوم ہوتا ہے“

شہر میں گورنمنٹ آف انڈیا کے فٹ ڈویژن کی طرف سے ایک نمائش جاری تھی جس میں
 امریکی، روسی، انگریزی، جاپانی، اطالوی، چینی، چیک اور فرانسیسی فلمیں دکھائی جا رہی تھیں مختلف
 ملکوں سے برگزیدہ فلمی ہستیاں بھی اس موقع پر مدعو تھیں۔ روس سے پردوکن اور چرغوسف اور لڑکی
 سے فریک کیہ ایسی مشہور ہستیوں نے بھی کے فلمی مطلقوں میں اک ہل چل سی حد ڈراوی تھی۔ جلد ستی
 میں بین الاقوامی فلموں کی یہ پہلی نمائش تھی اور اس قدر کامیاب تھی کہ محض گھروں پر گھنٹوں کی نوک لگاتا
 تھا یہ شو کئی کئی دن پہلے بک ہو جاتا تھا۔ بین الاقوامی فلموں میں روسی، اطالوی اور چیک فلموں میں
 لوگوں نے بڑی دل چسپی ظاہر کی کیونکہ امریکی فلمیں تو ہر روز دیکھتے تھے۔ یہ ان کے لئے پہلا موقع تھا کہ وہ
 دوسرے ملکوں کی فلموں کے موضوعات ان کی قومی حیثیت ترتیب و تدوین اور مثال سے اکادم
 ہو سکیں۔ اور دل ہی دل میں ذہنی طور پر موازنہ کر سکیں۔ روسی فلموں میں "خال آف برلن" اور "ٹین
 باس انٹرز" بہت پسند کی گئیں، اور پبلک کے اسرار پر ان کے کئی شو کئے گئے۔ اس کے بعد اطالوی
 فلموں کا نمبر آتا تھا "بائیکل چور"۔ "روٹی ٹی" "مرکل آف میلان" کو عوام نے بہت سراہا چیک فلمیں
 کی فلمیں بھی پسند کی گئیں۔ اطالوی تھی حقیقت شکاری کے اسکول سے ہٹ کے کچھ لوگوں کو فرانسیسی فلموں

میں بات کہے جانے کی جوا دل سے بہت بھائی، جتنی غلوں میں سفید بالوں والی لڑکی نے ہر ایک کے دل کو مرہ دیا۔ جتنی غلوں کا انداز ہماری غلوں سے ملتا جلتا تھا۔ اُن کی طرزِ ادا میں ایک ایسی ایذا نیت تھی جو انہیں ہمارے بہت قریب لے آتی تھی۔ اس ناش میں حصہ لینے والے ہر ملک نے اس موقع پر ایک غلطی دفع کی بھیجا تھا۔ مختلف دفعوں کا حکومت اور پبلک کی طرف سے شاندار سواگت کیا گیا۔ اکرم آج رات ہی ابھی ایک سیر تھڑے واپس آیا تھا جس میں روسی وفد کا شاندار استقبال کیا گیا تھا، ہندوستانی غم کی تہم اہم اور نامور ہستیاں اس موقع پر موجود تھیں۔ لیکن جس چیز نے اس سواگت کو یادگار بنا دیا وہ پنڈت نہرو کی اس کچھل سواگت میں غیر متوقع شرکت تھی۔ پنڈت جی اسی دن لندن سے لوٹے تھے اور سفر کی سحران ادا اپنی دلچسپ مصروفیات کے باوجود انہوں نے استقبال کی کمی کی انتہا پر اس میں شرکت کی تھی۔ ایک سیر تھڑے کا بال کچا کچ بھرا ہوا تھا بلکہ لوگ اُس کے باہر بھی کھڑے تھے۔ ہر حیثیت سے یہ یادگار دن تھا۔ اس لئے دوسرے دن اکرم کو بہت غصہ آیا جب بس نے تنگ نظر دفع ناموں میں یہ ٹرہا کہ پنڈت جی کو اس استقبال جلسے میں شرکت نہیں کرنی چاہیے تھی وہ بہت صاف صاف کھل کر توذ کہہ سکتے تھے کیونکہ ایک عام سیدھے ساوے خوب صورت کچھل جلسے کی مخالفت کرنا بہت مشکل ہوتی ہے۔ اس لئے وجہ الفاظ میں اور منہ بنا کر اور طرح طرح کی دھڑکار باتیں کہہ کر وہ پنڈت جی کے اس اقدام کی مذمت کر رہے تھے:

جسوت نے کہا ”میں تم سے کہتا نہیں تھا۔ ہمارے ملک میں تنگ نظروں اور رحمت پرستوں کا ابھی تک ایک بہت بڑا گروہ ہے جو پنڈت جی کی صلاح کل چالیسی سے اتفاق نہیں رکھتا جو ہر موقع پر اس کی چشم میں ٹھہرا بھونکنے کی کوشش کرتا رہتا ہے اس لئے وہ لوگ جو باشعور ہیں، اور صلہ میں ان کے لئے یہی جانی لینا کافی ہے کہ پنڈت نہرو اور ان کی حکومت ان کے لئے خاطر خواہ کوشش کر رہی ہے۔ ہیں خود بھی اس کوشش میں ان کا ہاتھ بٹانا ہو گا۔ اپنی ترقی پسند کاوشوں

کو جاری رکھتے ہوئے پنڈت نہرو اور اپنی حکومت کی صلاح برائسی کے ساتھ مضبوط کرنے ہوں گے۔

جب بڑے غور سے اس گفتگو کو سن رہی تھی ان پہلے سات آٹھ ماہ میں اس نے ذہنی طور پر بہت فاصلہ طے کر لیا تھا۔ "کسان تصور کے متخل کرنے میں اس کی اس جھک کو شیشوں کا بہت بڑا ہاتھ تھا وہ دہائی رات کام کاج میں جٹی رہتی تھی سیٹ پر وہ اکرم کی اسسٹنٹ کا کام باقاعدگی سے کرتی تھی۔ اس کے علاوہ عورتوں کے لباس اور آرائش کا شعبہ بھی اکرم نے رضیہ کے سپرد کر دیا تھا۔ رضیہ کا خیال تھا کہ شاید رضیہ ضرورت سے زیادہ کام کرتی ہے مگر رضیہ زیادہ کام سے کبھی گھبراتی نہیں تھی بڑی خندہ پیشانی سے روزمرہ کے شوٹنگ کی الجھنوں کو سلجھا دیتی۔

ایک دن رضیہ نے پوچھ لیا "تو جو دن رات کام میں لگی رہتی ہے یقیناً کبھی گھوٹنے کو نہیں چاہتا؟ کہیں تفریح کرنے کو رضیہ؟"

رضیہ بیک ایک سی ٹی ٹی بولی "گھوٹنے کو؟۔۔۔۔۔ اب نہیں چاہتا اب کسی کے ساتھ کہیں تفریح کرنے کو نہیں چاہتا!"

رضیہ نے اسے گلے سے لگا لیا "اسی لئے زیادہ کام کرتی ہے؟"

رضیہ نے کہا "نہیں۔ بات نہیں ہے۔ مجھے کام میں بہت گھٹن آتا ہے غم کا کام مجھے پسند ہے تو پھر میں اُسے اچھی طرح سیکھ کیوں نہ لوں؟"

"فلم ڈائریکٹر بنے گی؟ ایک عورت ہو کر؟"

"عورت ایک فلم ڈائریکٹر کیوں نہیں بن سکتی؟"

رضیہ نے ہنس کر کہا "میں جانتی ہوں۔ تو اس لئے زیادہ کام کرتی ہے کہ کسی کو بھول سکے؟"

رضیہ چپ ہو گئی۔ بہت دیر کے بعد بولی۔ گویا اب تک اپنا دل ٹٹول رہی تھی "یہ بھی ٹھیک ہے رضیہ میں اب تک عشرت کو بھولی نہیں ہوں۔ مگر اسے بھڑ دینا چاہتی ہوں مگر اس کام میں زیادہ دل لگانا

موت اس نے نہیں ہے۔ یہ بھی ایک وجہ ہے۔ مگر سب سے بڑی وجہ نہیں ہے۔ سب سے بڑی وجہ یہ ہے۔ کہ کام۔ خود اس کام میں مجھے بڑی دلچسپی ہے میں سمجھ نہیں سکتی۔ ہم میں سے بہت سی لڑکیاں عمدہ ساڑی پہنے پ اپ اسٹک اور سُرخ ٹکڑے زیوروں میں مچھ جھاتی ہوئی سیٹ پر اس کوڑے سے اُس کوڑے تک بچل جاتی ہیں اور کہتی یہ نہیں سوچتی کہ ظلم کیسے تیار ہوتی ہے۔ کیونکر تیار ہوتی ہے اس کی تیاری میں کون سے مراحل آنے میں کون سے مسئلے اُنہیں کس طرح حل کیا جاسکتا ہے ایک چیز جو ہماری روزمرہ کی زندگی ہے جس کی بنیاد پر ہماری ساری زندگی چلتی ہے ایک اسی سے ہم اس قدر لاپرواہ ہو جاتی ہیں کہ دل میں ہمیشہ خیال رہتا ہے کہ کب کسی طرح جلدی سے شوٹنگ ختم ہو اور ہم بھاگ جائیں۔ یہ بھاگنا ہمیں بہت ہنسکا پڑا ہے رضیہؒ

رضیہؒ بیک ایک خاموش ہو گئی۔ اتنی لمبی تقریر اس نے زندگی میں کبھی ذکی تھی اب جب وہ ایک سانس میں اتنی باتیں کہہ گئی تو خود اپنے آپ پر اُسے حیرت ہونے لگی اور رضیہؒ کا تو منہ کھلے کا کھلا ہی رہ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد رضیہؒ آہستہ سے بولی ”ایسی کم نیت تو تو بہت لگے پڑے گی“ رضیہؒ کے ایک اس جملے نے رضیہؒ کی ہمت اور بندھادی۔ اب تو وہ اکرم کے ساتھ ساتھ اس کے دوسرے ساتھی کاموں میں بھی حصہ بناتی تھی۔ رضیہؒ بھی کام کتنی تھی مگر اسے اپنے لباس میں اپنی خرمی و آرائش ہی سے کم فرصت ملتی تھی۔ روزی کہ ان دونوں سے حسین تھی اور وہ ایک زیادہ آزاد ماحول میں پائی تھی اور مسلسل شوق کرنے سے اب اُسے اپنے میک آپ میں زیادہ وقت نہیں لگتا تھا مگر ابھی وہ نوکرانہ محبت تھی کام کم کرتی تھی اکرم کو زیادہ دیکھتی تھی۔ آپس زیادہ بھرتی تھی اور غصے ظہر پر جب کبھی اکرم کہیں اس کے نزدیک جوتا تو اس کے گرد پیش کیا۔ ہر ماہ اسے کچھ یاد نہ رہتا اس وہ طرز پر اکرم کو دیکھنے لگتی اور رضیہؒ کو اُسے ڈانٹنا پڑتا اور روزی کا چہرہ کد دم سسرخ ہو جاتا اور وہ رضیہؒ سے مساتی مانگ کر ہر اپنے کام میں لگ جاتی۔ مگر پھر جب کبھی اکرم اُسے دکھائی

وے جا پہنچے مگر وہ پیش کی دنیا کو قبول نہ جاتی۔ اس دنوں صفی کے لئے سدا آسمان مٹھتی تھا اور ساری زمین اک نیلگوں سبزے میں مٹھتی ہوئی تھی۔ تفسیر صفی کو بخشش میں ملے ہوئے اپنے دل میں اک چہی ہی محسوس کرتی۔ اک لمحے کے لئے عشرت اس کی نگاہوں کے سامنے آکر دکھائی دے مگر وہ پھر اس کی یاد کو بڑی سختی سے دل کے کسی کونے میں دھکیل دیتی اور اپنے ہونٹ چبائے ہوئے اپنے کام میں مصروف ہو جاتی۔

اس وقت جنوت اور اکرم کو رات کے چلے پر بحث کرتے ہوئے دیکھ کر اُسے یاد آیا کہ رسولِ بستی شامی بسا کی فلم کیٹی کی طرف سے باہر سے ملے ہوئے قتلِ ملک کے فلمی دھندوں کو مستلِ مشاہدہ میں ایک دھرت دی جانے والی ہے جس کا ذرا اکرم اور اس کے ساتھیوں نے یاد ہے اور انکی اس سلسلے میں کچھ کام نہیں ہوا ہے۔

دفعہ نے اکرم کو یاد دلانے ہوئے کہا "اُنٹوک بنگ یہاں بحث کرتے رہو گے۔ اس دھوت کے خلق کہاں کہاں جاتا ہے۔ کچھ پتہ بھی نہیں ہے۔"

اکرم کچھ کہنے ہی والا تھا کہ جنوت نے پوچھا "اس دھوت میں کئی لوگوں کو بڑا رہے ہو۔"
"تمام فلمی دھندوں کو۔"

تھرکچوں کو کبھی ستیہ رائے نے چلائے ہوئے "کم نیت جیہاں جلتے ہی فلاں کھڑا کر دیتے ہی۔ کوریا میں۔ انڈیا چائنا میں، فاروسا میں، جاپان میں، خانات سلو کے جزیروں میں، قزاقستان میں، آئی میں، برطانیہ میں، اورے جہاں جاؤ۔ یہ سب لوگ اپنی خلیوں کی اپنا بوائی اٹا، اپنا ٹیم لے کر جگہ موجود ہیں؟"

"کیوں نہیں جلائیں گے۔ خود جلائیں گے۔"

"کام کرنے پر شامی بسا کا۔ پلانے ہو جنگ بازوں کو...."

جس نے کہا "مجھے ستیہ رائے کی دلیل میں کچھ وزن معلوم ہوتا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ یہ بالکل غلط بات ہے کہ امریکی جنگ باز ہیں۔ ایک آدمی جنگ باز ہو سکتا ہے دس آدمی جنگ باز ہو سکتے ہیں، دس ہزار آدمی جنگ باز ہو سکتے ہیں لیکن دس کروڑ آدمی جنگ باز نہیں ہو سکتے۔ کیا تم مجھے یہ بتانا چاہتے ہو کہ امریکہ کے شہروں اور دیہاتوں میں انسان نہیں بستے۔ کیا ان انسانوں کے گھر نہیں ہیں۔ ان گھروں میں ان کے محبوب بچے، عورتیں، مائیں، باپ اور بھائی نہیں رہتے۔ کیا تم مجھے یقین دلانے کی کوشش کر رہے ہو کہ وہ لوگ اپنے سر پر اٹیم کی تلوار لٹکتے ہوئے نہیں دیکھتے کیا ان کو یہ بھروسہ ہے کہ اگر کوئی جنگ شروع ہوئی، تو یہ ہم ان کے گھروں پر نہیں گرے گا کیا وہ لوگ اوپر سے یہی دل ہی دل میں یہ دمانیں لگتے ہوں گے یا خدا کسی طرح یہ جنگ کی مصیبت ٹل جائے، کسی طرح سے ٹل جائے؛ کیا ان ایسا نہیں سوچتے ہوں گے میرا خیال ہے کہ ضرور سوچتے ہوں گے۔ کیونکہ میرا اعتقاد ہے کہ حکومتیں بُری ہو سکتی ہیں، سناج بُرے ہو سکتے ہیں معاشرے بُرے ہو سکتے ہیں، معاشی نظام بُرے ہو سکتے ہیں لیکن لوگ بُرے نہیں ہوتے۔ چند آدمی بُرے ہو سکتے ہیں لیکن سارے لوگ بُرے نہیں ہوتے۔"

"جناب کا فلسفہ میری سمجھ میں نہیں آیا" ستیہ رائے نے جھٹکے کہا "آج کل تو جو اخبار پڑھو جنگ کی خبریں آتی ہیں جو امریکی جنرل یا ایڈمرل اٹھتا ہے۔ اٹیم بم کا سوٹا گھماتے ہوئے دھماکا آئینہ نقسری کرتا ہے۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں۔ ان موت بلاؤ۔ یہ لوگ ساری دنیا پر اپنا جوتہ اگاڑنے کی فکر میں ہیں یہ لوگ پختے جنگ باز ہیں۔"

اکرم نے کہا "تم کہتے ہو وہ لوگ جنگ باز ہیں وہ لوگ کہتے ہیں ساری سرورت کی جرمینٹ میں بہر فیصلہ کس طرح سے ہو گا۔" اٹیم بم سے: "وہوے نے سر ہلا کے کیا۔"

اکرم نے جس کے کہا "فیصلے ہی کی ایک صورت ہے۔ دونوں کو ایک ہی ذمہ داری میں جبا یا جائے۔"

کہ ذکم میں تو بلاؤں گا اسی دعوت میں ؟

جسوت نے شے کا اظہار کرتے ہوئے کہا "تم بلاؤ گے مگر میرا خیال ہے وہ نہیں آئیں گے۔ مگر آجائیں تو آجائیں مگر کنیڈین آئیں گے ذرا ایسی اندھا دلی وفد کے سربراہی میں کہ غم کھلی کا جلسہ ہے۔ امریکی لوگوں، حالت میں نہیں آئیں گے دیکھتے ہو یہ سوجگ کتنے زوروں پر ہے۔"

اکرم نے کہا "وہ آئیں نہ آئیں میں تو ضرور جڑوں گا۔"

مگر شانتی سبساکی فلم کمپنی کی دعوت خطرات تو قح بہت کامیاب رہی امریکی بھی لگے اور برطانوی بھی اور کنیڈین بھی۔ فرانسیسی بھی اندھا دلی بھی۔ روسی چینی اور چیک وفدوں کے اراکین بھی زیادہ سے زیادہ تعداد میں موجود تھے۔ وہاں فرینک کیپرل تھے اور پیو وکن تھے اور فرانسیسی ڈائریکٹر اندھا دلی کیمرو میں، کنیڈین اور چینی اور ہندوستانی فلم انڈسٹری کے تمام ذمہ دار افراد برگزیدہ پروڈیوسر اور فنکار تمام بڑے بڑے اداکار موجود تھے۔ سنٹرل سٹوڈیو کے نمبر دو سٹیج کاشن مارہال بہت عمدہ طریقے سے سجایا گیا تھا ہندوستانی طریقے سے یہاں نہ کرسیاں تھیں نہ میز فرش پر بڑے بڑے نرم اور گداز غالیچے بچا دئے گئے تھے اور سب لوگ شرقی بھی اور مغربی، ایشیائی اور یورپین سب لوگ ہانگیں پرارے یا ناگیں دبائے یا ناگوں پر ناگیں رکے یا اتنی پاتنی مارے۔ صبح ہندوستانی طریقے سے بیٹھے تھے اور ہندوستانی اداکاروں کی طرف سے پیش کئے گئے کپڑے بدگرم کو بڑے خوبے دیکھ رہے تھے اور سن رہے تھے یہ ایک عجیب و غریب دعوت تھی جودات کے تین بج چکے

چلتی رہی۔ کوئی دہاں سے نہیں ہلا اس خد دل چسپ پروگرام تھا۔ بار بار پروگرام کے مختلف حصوں کو سوز
مہانوں کے اسرار پر دہرایا گیا اور تھوڑے ہی عرصے میں امریکی، روسی، چینی اور ہندوستانی فرانسیسی اور
اطالوی۔ شہر و شکر ہو کے دس سو بول رہے تھے جیسے کبھی ایک دوسرے سے جوا نہ تھے۔

اور اس ہال سے باہر سرد جنگ جاری تھی۔ سورہے لگے تھے۔ خد قیں کھدی تھیں، اختیار میں کئی جگہیں
پراس وقت بھی بیماری ہو رہی تھی۔ جوانی جہان کو ریامیں نیلام کا آتش گیر مادہ غریب کو ربائی کا لڑن
کے چھوٹے چھوٹے گھروں پر برسا رہے تھے آج کی اس تاریک رات میں کہیں پر کوئی گھر جھکے
اڑ گیا۔ کوئی تخریب ہو گیا کوئی یہی ہو رہی تھی۔ کوئی ماں اپنے جوان بیٹے کی شکل ایش سے پٹ کر رہ گئی۔
اور لاکھوں یورپی گھروں میں مائیں اور بچے۔ بیٹے اور جوان۔ آئندہ جنگ کے خوب سے ہے
ہوئے اس وقت بھی یہ سوچ رہے تھے کہ کس کی جگہ کون سی خبر لائے گی۔

لیکن اس ہال میں کتنا امن تھا۔ کتنا سکون تھا۔ کتنی مسرت کتنا بھرپور سیماں پر فتنے تھے اور تاج
اور گیت اور تالیاں، یہاں دوستی کے پر جوش مصلحت تھے اور محابوں میں دوستی اور مفاقت
انسانیت۔ بھرپور اور مہربانی کی چمک اور تابانی !

اس ہال میں تمام دنیا کے مختلف قوموں، نسلوں، رشتوں اور نظریوں کے لوگ جمع تھے۔ لوگ جو
انگ انگ ایک دوسرے سے برگشتہ فاطمے تھے۔ یا یوں تھے اور نفرت کے نقطے پر پہنچتے جہاں
تھے۔ شاید جب وہ اس ہال میں آئے تو اپنی تمام مجبوریاں، کمزوریاں اور اپنے پہلے سے سوچے گئے
ہوئے خیال اپنے ساتھ لائے تھے۔ لیکن جب یہاں ان کی نگاہیں ایک دوسرے سے ملیں تو پہلے
بٹ گئے اور ساتھ بیٹھے ہوئے ان لوگوں نے محسوس کیا کہ وہ ایک ہی گیت کو پسند کر سکتے ہیں
ایک نغمہ پر تالی بجا سکتے ہیں۔ ایک ہی مذاق پر سنیں سکتے ہیں۔ وہ آدمی تھے اور سارے وہ کئے تھے
ہاں ! ہاں کے اندر! — تو پھر ہال کے باہر کوئی نہیں۔

ہاں کے اندر چند گھنٹے! ————— چند گھنٹے! ————— تو پھر چند برس کیوں نہیں! چند صدیاں کیوں نہیں! ہمیشہ کے لئے کیوں نہ ہم صلح سے رہیں۔ یہ جنگ کا خوف ہمیشہ کے لئے کیوں نہ انسان کے دل سے مٹا دیں۔

جھل کے خوف کی طرح! رات کی تاریکی کے خوف کی طرح۔ بادلوں کی گرج کے خوف کی طرح۔ اس جنگ کے خوف کو بھی ہندو انسان کے دل سے مٹا دیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔

”آج کی رات بڑی تاریکی تھی“ اکرم نے چلتے چلتے رضیہ اور جسونت سے کہا۔
 صبح کے چار بجے تھے وہ لوگ دعوت کے غلٹے کے بعد اپنی بستی کی طرف جا رہے تھے
 جسونت نے کہا ”مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے آج کی رات اُمید کا جنم ہوا ہے۔“
 ”جیسے اندھیرا بہت دور دور تک چھٹ گیا ہے۔“ رضیہ نے آہستہ سے کہا۔
 رضیہ نے گرائڈ روڈ کے پل پر کھڑے ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ رات نے اپنے پر محیط لئے تھے
 سمندری جہازوں میں تازہ نلک کا سوندا جاں تھا۔ مشرقی آسان پر صبح کی تصویر کھل اُٹھی تھی۔ بھائی
 ایک سپید وکل شبنم میں شرابور اپنے کتاؤں سے اس کے قطرے چھکاتی ہوئی اپنی باریک آواز
 کو گئی ہوئی پل کے نیچے سے گزر گئی۔ اور چاروں طرف اُجالا ہو گیا۔

اس واقعے کے چند روز بعد رضیہ رضیہ کے پاس جھونپڑوں میں آئی اور اس سے کہنے لگی
 "حضرت سائیں ہسپتال میں ہے اور مر رہا ہے"۔

رضیہ کا چہرہ اک دم پتلا پڑ گیا اتنے زور سے اس نے سانس اندر کو کھینچی کہ اس کے طلق سے ایک عیب
 زخمی جانور کی سی جھنجھ نکل گئی۔ رضیہ نے اُسے سہارا دیا۔ مگر وہ رضیہ کا رد عمل دیکھ کر حیران ہو گئی۔ اتنے
 عرصے سے کبھی اس کے اور رضیہ کے درمیان عشرت کے متعلق کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ اگر کبھی رضیہ
 نے بات کی بھی۔ تو رضیہ نے ہنس کر ٹال دیا۔ یا ایسی لاپرواہی سے اس کا ذکر کیا۔ جیسے وہ اُسے بھول
 چکی ہے۔ لیکن اب رضیہ کو اس حالت میں دیکھ کر رضیہ کو اپنی رائے بدلتا پڑی۔ اس نے سوچا۔ اگر مجھے
 معلوم ہوتا۔ یہ موتی سے اپنی جان کو لٹکانے لگی تو میں یہ خبر دوسرے طریقے سے آہستہ آہستہ سے
 سناتی۔

تھوڑی دیر کے بعد رضیہ نے پوچھا۔

"کہاں ہے وہ؟" اس کی آواز سرگوشی سے ذرا ہی بلند تھی۔
 "سائیں ہسپتال میں"

”سائیں ہسپتال کہاں ہے؟“

”سائیں میں؟ جہاں پہلے ٹری کی پارکس ہوا کرتی تھیں نا انیس اب جہل ہسپتال میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔“
”تھیں کیسے معلوم ہوا۔“

”جیسے ٹاکر گج راج سنگھ اپنے اکثر اہلین کے پریذیڈنٹ نے بتایا وہ اُسے دیکھنے گئے تھے۔ کیوں کہ عشرت نے اُسے بلایا تھا اور اس نے.... میرا مطلب ہے عشرت نے خاص طور پر کہ: ”ٹاکر گج“ سے کہا تھا کہ رضیہ کو میری بیماری کی اطلاع نہ ملے۔ مگر چونکہ اب وہ مر رہا ہے اس لئے میں نے.... رضیہ نے فقرہ اتنا مچھوڑ دیا۔ رضیہ نے اپنا پس بٹھایا اور جھونپڑے سے باہر نکل گئی۔

”کہاں جا رہی ہے تو۔۔۔۔۔ رضیہ نے پتلا کے پرچھا
مگر رضیہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

وہ بستی کی گلی سے دوڑتی ہوئی باہر نکل گئی۔ وہاں سے بائیسٹل کے پل تک بسا گئی ہوئی
گئی۔ ایک دیوانی عورت کی طرح۔ جب وہ بائیسٹل کے سبس اسٹینڈ پہنچی تو اس کا دم پھول رہا تھا
اس کا سارا جسم پسینے میں تر ہو رہا تھا۔ لیکن اُسے اپنی جسمانی تکلیف کا کوئی خیال نہ تھا۔ وہاں
سے اس نے سائیں جانے والی تیز پس لی اور اس میں بیٹھ کر سائیں ہسپتال کے نام کے پر جا اترتی۔
اور سیدھی اندر چلی گئی۔ مریضوں سے ملاقات کا وقت ساڑھے چار بجے کا تھا اور ابھی اس میں ایک
گھنٹہ باقی تھا۔ کچھ عرصہ تو زخموں اور ڈاکٹروں سے پوچھنے میں گزر گیا کہ عشرت کو کون سے د۔۔۔!

میں داخل کیا گیا تھا اس کے بعد رفیعہ دینک ہسپتال کی مشینوں اور پگ ڈنڈیلوں پر مشغول رہی گھاس کے قلموں میں کہیں کہیں پھولوں نے کھلنے کی کوشش کی تھی۔ مگر ہسپتال کی بیمار فضا میں ان کی کوششیں کچھ عجیب محسوس ہوتی تھیں۔ سبز سے بھی قائل اور شیل کی بو نہ رہی تھی۔ سرخ ایشیوں کی لمبی لمبی نچی نچی بارکیں ایک عجیب افسردہ منظر پیش کرتی تھیں۔ آہستہ آہستہ ملاقاتیوں کی تعداد بڑھتی گئی بہت سے لوگوں کے ہاتھوں میں پہل اور پھول تھے۔ ان سے رفیعہ کو بھی خیال آیا اور وہ دوری دوری ہسپتال کے باہر گئی۔ جہاں دو تین ٹھیلے والے دوکانیں بھلے بیٹھے تھے۔ جن لوگوں کی شہ نرغ بازار سے دو گئی تھی۔ پھر کبھی رفیعہ نے آدمی و جن موسمیاں اور حوسیب خریدنے اور ٹکاب کے پھولوں کا ایک گچھا اُسے چار آنے میں مل گیا پھل اور گلاب نے کر وہ پھر ہسپتال کے اندر آگئی عشرت بنی وارڈ میں داخل تھا۔ رفیعہ جلدی سے بنی وارڈ کی روشنی کی طرف گئی کیوں کہ ہسپتال میں اب ملاقات کے وقت کی گھنٹی بج رہی تھی۔ اور لوگ باگ تپے عورتیں ماٹیں اور بھائی باپ اور بیٹیاں دوست اور رشتہ دار مریضوں کو دیکھنے کے لئے مختلف وارڈوں میں گھس رہے تھے۔ رفیعہ بھی جلدی سے بنی وارڈ میں گھس گئی۔ جنرل وارڈ کے اندر قطار در قطار لیٹسکوں پر مریض بیٹھے یا لیٹے ہوئے اپنے ملاقاتیوں سے باتیں شروع کر رہے تھے۔ ہسپتال کی زندگی میں مریضوں کے لئے یہ زندگی کے سب سے دل خوش کن لمحے ہوتے ہیں جب باہر کی زندگی کے تلاء جھونکے ہسپتال کی بیمار فضا میں داخل ہوتے ہیں اور اپنے ساتھ اُمید، مسرت اور ہمتی بھی لے جاتے ہیں۔ اس مسرت کی طرف اس اُمید اور اشک کے ملے جلے جذبات سے دیکھتے ہیں جیسے زندگی کو اپنے ہاتھوں میں لے لیں اور اپنے پیروں سے پکڑ کر اسی سے ٹک جائیں گے۔

رفیعہ ایک بار سارے وارڈ کا پکڑ لگا کے گھوم گئی۔ اسے عشرت کہیں دکھائی نہ دیا۔

دوسری بار وہ پھر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ہر ایک پنک کو غور سے دیکھتے ہوئے زس کی طرف
بڑھ رہی تھی تاکہ اس سے پہلے کہ عشرت کہاں سے کہیں اس کا پتہ چلنے میں زس نے غلطی تو نہیں
کی دوسری بار وہ ذرائع دیوار سے لگے ہوئے بہت سے پنکوں کو دیکھتی ہوئی مرکز میں گچے ہوئے
زس کی بیزر کی طرف جا رہی تھی کہ کسی نے اُسے خفیہ آواز میں پکارا۔

”رضیہ“

رضیہ نے ہلٹ کر دیکھا۔

یہ بیزر کے بیڈ سے ایک سیاہ دھواں اٹھا ہوا چہرہ اس کی طرف تک رہا تھا۔ آنکھیں گہرے گڑھوں
میں دھنسی ہوئی تھیں۔ رخسار اندر کو گھسے ہوئے تھے ملتوی پتی گردوں سے باہر کی پڑانے وقت
کی گرہ بند جڑ کی طرح جو زمین سے اُکڑا کر باہر آگئی ہو۔ ایک پتلا سا ڈولسا ہاتھ اُٹھا اور ہر پنک
پر گر گیا۔ رضیہ نے بڑی حیرت سے اس بیزر کی طرف دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ اُس کے قریب گئی، اور
پوچھنے لگی۔

”میں نے آپ کو سہانا نہیں۔ معاف کیجئے گا۔ آپ کوں ہیں“

وہ تاریک گڑھوں کے اندر کی سیاہ سیاہ پتلیاں ذرا سی جھلک گئیں۔ بہت عرصے تک وہ پلر
چہرہ رضیہ کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر وہ سوکھے سیاہ سے ہونٹ بٹے۔ ”عشرت“
”عشرت“ رضیہ جی اور اُس پاس کے پنکوں کے مریض اور اُن کے ملاقاتی چونک کر ان کی طرف
دیکھنے لگے زس نے کہا ”شیش شیش شیش شور نہ کرو“

”عشرت! اپنی آواز کی حیرت کو بدلے ہوئے فیر پھر ہوئی۔ اور عشرت کے پنک پر ٹیپ گئی عشرت! آ
”وہ بہت دیر تک اُس سخ شدہ چہرے کی طرف دیکھتی رہی اور اُن نے پھوٹے کھنڈوں
کی اینٹوں سے اس چہرے کو تعمیر کرتی رہی، جو کبھی عشرت کا چہرہ تھا۔ بہت آہستہ سے اسی

بھلا سے وہ لب اُبھرے جو کبھی عشرت کے تھے اور ان گالوں پر وہ سُرخیاں اور صباحت آئی جو کبھی
عشرت کی تھی۔ بہت ہی آہستہ سے وہ آنکھیں ان تنگ مادہ تاریک گڑبڑوں سے اُپر اُٹھنے لگیں
سیاہ دھواں کھا ہوا پُرشکن، اتھا روشن اور بھات ہوتا گیا، اور جب رُضیہ نے اپنے عشرت کو بھان لیا
تو اس نے اس کا خفیت و نزار ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور چُپ چاپ روئے لگی۔ تلتے سالتے
کی گُٹھ بوند نری ہوئی، مجروح محبت اس کی آنکھوں سے اُبل کر باہر آگئی اور اس کے خدایوں پر پہنچے
لگی اور وہ اپنے آپ کو روک نہ سکی۔ اور چُپ چاپ آنسو پونچھے بغیر روئی رہی۔ اور عشرت کا ہاتھ اس
کے ہاتھ میں کا پتار ہا۔ یہ ہاتھ جو ہاتھ نہ تھا مانی کا ایک پٹا ہوا دق تھا۔ ایک دق کتاب زندگی
سے اُکڑا ہوا جس کے مستقبل کے سب صفحے غائب تھے۔ ”تم اس زندگی کا یا پنا سکتے ہو۔“ رُضیہ تم
بچی نہیں جو کہ اس کاغذ کی ایک گشتی بناؤ اور اسے زندگی کے دریا میں بہا دو۔ اور اسے لہریں
لیتے ہوئے دریا کی سطح پر غائب ہوتے ہوئے دگتی رہو۔ تم اس قدر غیر جذباتی بھی نہیں ہو کہ اس
کاغذ سے اپنے جوتے بوجھ لو اور اُن کا پالش چکا لو۔ میت سے لوگ دوسروں کا زندگیوں سے
ایسا ہی کرتے ہیں۔ اس کاغذ پر اب وہ روشن تصویریں آ رہی ہیں۔ وہی تھاری امیدوں کا مرکز
تھی کہ تم اس وجہ سے اسے تھکر کے اپنے بلاؤں کے نیچے دھڑکتے ہوئے بننے لگاؤ۔ یہ
تو ایک شکستہ زندگی کا پٹا ہوا دق ہے جو ساج کے تیز و محرومان کے چھوڑے کھانا ہوا، بجلی
سے اُڑا ہوا، تھارے سانسے آ رہا ہے۔ اس پر راہ چلتے قدموں کی کچڑ ہے۔ گندی ٹالیوں کی برہے،
بیتے زخموں کا ہوا اور کھنکھارتے ہوئے گلوں کا شور ہے۔ اس سلسلے کچلے پٹھے پٹھے دق کا تم
کیا کرو گی، جس کی زندگی کا ایک حرف بھی اب ٹھیک طرح سے نہیں پڑ جا جاتا۔ بھاگ جاؤ
رُضیہ یہاں سے بھاگ جاؤ۔

لیکن رُضیہ بھاگ نہیں۔ دوڑی نہیں۔ غائب نہیں ہوئی۔ وہ اس بستر پر چلی۔ سکتی رہی۔ وہ اُدھ

بھی عشرت کے خاموش انکار کے باوجود اس کے قریب آگئی۔ اس نے عشرت کو سب کے سامنے اپنے گمے سے لگایا۔ اس نے اس کا ہاتھ چومنا اس کے بٹے ہوئے رخسار چومے اور اس سے آہیں ٹانھیں اور ہیکلیوں کے بیچ میں کہا۔

”تم زندہ رہو گے عشرت۔ تم زندہ رہو گے۔ میں تمہیں زندگی دوں گی۔ اپنی ساری زندگی تمہیں دے دوں گی۔ یہ کہتے ہوئے رفیع کے چہرے پر وہ جلال تھا۔ جیسے وہ خود کوئی انسان نہ ہو، ایسا ہو۔ اور سوتے ہوئے عشرت کے دل میں زندگی کا شعلہ بھڑکا، اور حیات کی بھیجی ہوئی تو پھر سے سہارا پا کر چمکنے لگی، اور وہ سوچنے لگا۔ سچ، کوئی محبت نہیں کر سکتا عورت کی طرح، اور کوئی قربانی نہیں دے سکتا عورت کی طرح، اور کوئی معاف نہیں کر سکتا عورت کی طرح، اور کوئی کسی کے لئے جان نہیں دے سکتا عورت کی طرح، ایک بہت ہی معمولی ہستی ہوتی ہے۔ بہت ہی معمولی چھوٹی اور نازک لیکے اپنے معمولی سے چھوٹے سے ماحول میں اک خدا کی طرح ہستی ہے۔ وہ حقیقت کرتی ہے اور شب و روز زندگی دیتی ہے۔ اور اس کی کوکھ سے اور پیٹ سے ہونٹ اور ہاتھ کی پھلیں سے، زندگی کے ہوا اس کے دودھ اس کے شہد اور اس کے گلاب کی بھک آتی ہے

بہت دیر تک رفیع عشرت کا سراپا آنکھوں میں لے بیٹھی وہی اور صحت دیر تک اس کی باتیں سنتی رہی۔ کوئی چھوٹی باتیں، بے ربط سے جملے۔ خاموشیوں کے وقفے جو کبھی کبھی جھلکے سے نہ بولتے تھے سیکڑوں میں ڈھیلے ہوئے فقرے بے ٹھل بے ٹھلکے طعنے آہستہ آہستہ دیر دیر سے اگلے تھیں پلاٹن میں رفیع کے کہیں بھی مشق کے امن کی کہانی کہ، فتح حاصل اختیار کرنے لگی۔ اس کہانی کی کوئی معمولی شکل و صورت نہ تھی۔ وہ ایک عیب ہونا کہ سیکڑ تھی، کیوں کہ عشرت نے زندگی کی تلپٹ کا آخری قلوہ پایا تھا، اور وہ ساج کی تہ میں ٹھوب کران کا لالہ لگا ہوا تھا، جہاں ناسودوں کے بھول کھلتے اور بیاریوں اور جراثیم کی پیپ لادے کی طرح بہتی ہے اور غیر سماجی افراد شاک پھیلیوں کی طرح ٹھو

اور بے باک اس جہر آب دنیا میں اپنا شمار ڈھونڈتے ہیں۔ عشرت نے یہ سب کچھ دیکھا تھا۔ اور اب دنیا نے اس کی ہڈیوں تک ہلگولٹ کھایا تھا۔ اور اس کی رگوں کا سارا لہو نچڑایا تھا۔ اور اسے لمبوں کی نچڑی ہوئی کھال کی طرح باہر کوٹے پر پھینک دیا تھا، کسی نہ کسی طرح عشرت اس ہسپتال میں پہنچ گیا تھا، اپنی زندگی کے آخری ایام پر سے کرنے کے لئے

عشرت نے کہا ”میں چاہتا نہیں تھا کہ میں تمہیں اپنا چہرہ دکھاؤں؟“
”کیوں؟“

”کہ نہیں سکتا“ عشرت نے اپنا دل ٹٹوتے ہوئے آہستہ آہستہ رگ دگ کر کہا ”مرن یہ چاہتا تھا کہ جب مردہاؤں تو تلاش تمہارے حوالے کر دی جائے“
”کیوں؟“

سوچتا ہوں جن لوگوں نے میری زندگی کی بے عزتی کی۔ وہ میری موت کی کبے عزت کر سکیں گے مرن یہ خیال تھا، تم میرے مرنے کے بعد میری بے عزتی نہیں کر سکو گے؟
رضیہ چپ ہو گئی۔

عشرت نے کہا ”ہاں مرنے سے پہلے راج کو اپنا چہرہ ضرور دکھانا چاہتا تھا؟“
درداک نچر کی طرح رضیہ کے گلے میں گھوما۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ جوتی نہیں لگی تک اس سے قہقہہ ہے؟

”تبت؟“ عشرت ہنسا۔ اس کی ہنسی بڑی تلخ اور ناخوش گوار تھی۔ عشرت نے بڑی تیزی اور تندہی سے کہا ”مرن ایک لمحے کے لئے اُسے یہ چہرہ دکھانا چاہتا تھا۔ آج کا چہرہ میرا چہرہ۔ جیسے آج ہے۔ مرن ایک لمحے کے لئے۔ کیا تم سمجھ سکتی ہو؟“
رضیہ نے کہا ”ہاں میں سمجھتی ہوں؟“

عشرت نے کہا ”نرس نے مجھے بتایا، ان کا خیال تھا۔ میں ایک ہفتے میں مر جاؤں گا۔ ڈاکٹر نے دس دن پہلے مجھ سے کہا تھا۔ تم اپنے گمراہوں کو اطلاع کرو۔ مگر میری ہمت نہ ہوئی اور بڑی اماں کے پاس پیسے بھی نہ ہوں گے آنے کے لئے اور پھولے پھوٹے مہین بھائی۔ نہیں۔ نہیں۔ میری ہمت نہ ہوئی۔ میں نے سوچا میں اکیلا ہی مر جاؤں گا۔ وہ ہفتہ بھی گزر گیا اور میں زندہ ہوں۔“

رفیہ نے کہا ”تم زندہ رہو گے۔ میں نہیں زندہ رکھوں گی۔ اب تم نہیں رو گے۔ رفیہ کے لیے میں بڑا یقین تھا۔ عزم اور اعتماد اور بھروسہ یکا یک ہسپتال کے وارڈوں میں گھنٹیاں بجے ٹیکس ملاقات کا وقت ختم ہو رہا تھا۔ رفیہ نے اپنے آنسو پونچھ کر کہا ”میں کل پھر نکوں گی۔ ہر روز آتی رہوں گی، مت گمراؤ اب تم باہل اپنے ہو جاؤ گے۔“

ہسپتال کے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے رفیہ گوی، عشرت برابر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اگلے دن عشرت کی حالت زیادہ خراب تھی۔ جب رضیہ وہاں پہنچی تو اس کی آنکھیں
 بے فوری نظر آتی تھیں۔ اور وہ بہت خاموش لیٹا تھا، ٹاکڑوں نے آج اُسے سیلائین پر رکھا تھا
 انیل کے سینڈ پر کلچ کی ٹوٹیوں سے سیلائین قلعہ قلعہ کر کے اُس کے جسم میں پہنایا جا رہا تھا۔
 ”تم اس قدر خاموش کیوں ہو“ رضیہ نے پوچھا۔

”کچھ نہیں! عشرت نے جواب دیا اور پھر بہت دیر تک خاموش رہا۔
 رضیہ نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کہاں سے کہہ رہے وہ اسے بہت دلائے۔ کیسے؟ یکا یک اس کی نظر
 قریب کے بیڈ پر پڑی۔ انیس خبر کے بیڈ پر آج ایک نیا مریض آیا تھا اکل والا یہاں موجود تھا، جو
 بار بار رضیہ کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ رضیہ نے پوچھا۔

”تمہارا پیڑھی آج بدل گیا؟“

”ہاں“

”وہ پُرانا کہاں چلا گیا“

”مر گیا“ عشرت نے آہستہ سے کہا۔

”اے رفیعہ کے منہ سے نکلا“ کل تک تو بھلا چکا تھا۔“

عشرت بہت دیر تک خاموش رہا۔ پھر دلا ”ہسپتال میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ وہی بھر چیک رہا رات کو بچہ ایک اس کی طبیعت بگڑی۔ رات بھر وہ اپنی بیوی کو یاد کرتا رہا۔ اور اپنے چھوٹے بچے رتن کو۔ رتن! رتن! رتن! وہ بار بار درو کے دفتوں اور درو کے پیچ میں بھی اس طرح اپنے بیٹے کا نام لیتا تھا۔ جیسے آدمی سکون آرام اور خوشی کا سانس لیتا ہے، صبح کو وہ مر گیا۔

پرسوں تک وہ سانس اٹھائیں نمبر کے بیڈ پر ایک نوجوان تھا۔ بڑا جنت والا جری بہادر اس کی بانیں ٹانگ گنگری کی وجہ سے ڈاکٹر نے کاٹ ڈالی تھی مگر وہ ٹرا بہادر تھا۔ بھائے اس کے ڈاکٹر اس کا حال پوچھتے وہ ڈاکٹر مل کا حال پوچھا کرتا تھا اور خرس کو شکام درد کرنے کی دھابتا تھا۔ اور دوسرا دھر کے پشگوں پر پڑے ہوئے مریضوں کو ہنسلنے کی کوشش کرتا، کبھی کبھی جب وہ کی انتہائی شدت سے وہ بے تاب ہوتا تو اس کی مٹھیاں بچھ جاتیں۔ اس کے علاوہ وہ پھر ہناش جٹاں جو کہ اپنے آپ پر قابو پالیتا اور لوگوں کو ہنسلنے لگتا۔ پرسوں رات کے چار بجے اچانک مر گیا۔ اس کے منہ سے ایک لمبی دردناک چیخ نکلی۔ ایک خونناک میب پیچ اور وہ اس کے بعد مر گیا۔ جنرل وارڈ میں ایسا ہی ہوتا ہے۔“

رفیعہ نے دل میں سوچا وہ اُسے جنرل وارڈ میں نہیں رکھے گی۔ وہ خرس کے پاس گئی خرس نے اُسے بتایا کہ اسپیشل روم کے لئے سات روپے روزانہ کرایہ دینا پڑے گا رفیعہ نے سوچا وہ کرایہ دے گی وہ کہیں نہ کہیں سے روپے لے کے آنے گی اور عشرت کے لئے الگ کمرے کا انتظام کرے گی اس جنرل وارڈ میں پڑے پڑے تو اس کی رہی بھی قوتِ ممانعت غائب ہو جائے گی اور وہ زندہ نہ رہے گا۔ عشرت کے لئے ایک الگ کمرہ ہونا چاہیے جہاں وہ قریب پلٹ کے کسی ساتھی کی موت کا بھینا تک چہرہ نہ دیکھ سکے۔

رضیہ نے اگلے روز رضیہ سے کچھ روپے اُدھار لئے کچھ اس کے پاس بھی تھے لہٰذا کس نے اس دن کا ایڈوائس کرایہ ہسپتال میں داخل کر دیا، اور عشرت کو پرائیوٹ وارڈ میں ایک بلکمرے میں داخل کر دیا، پرائیوٹ وارڈ میں داخل ہوتے ہی عشرت کی حالت بہتر ہونے لگی۔ رضیہ ہر روز آتی تھی ہر روز اس کے لئے پھل اور بھول لاتی تھی اور یہ قواب پرائیوٹ وارڈ کا کمرہ تھا، اس لئے رضیہ جتنی دیر چاہے وہاں ٹھہر سکتی تھی اس لئے جب بھی اُسے کام سے فرصت ملتی وہ یہاں آجاتی۔ بلکہ کئی بار تو کام کو ترجیح نہ دے کر وہ یہاں آجاتی۔ ڈاکٹر جنت جو ہر روز عشرت کو دیکھنے آتے تھے عشرت کی بہتر حالت کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ رضیہ سے بولے ”جب سے تم آئی ہو اس کی حالت اچھی ہو رہی ہے۔ میں تو تقریباً یارہ سو چھپکا تھا، کیونکہ عشرت میں اپنی زندگی سے روٹنے کے لئے اندقت ذمہ دار جب مریض ہی مرنے چاہے تو ڈاکٹر اُسے کب تک زندہ رکھ سکتا ہے؟“ جب ڈاکٹر چلا گیا تو عشرت نے کہا ”ڈاکٹر چچ کہتا تھا۔ اُن دنوں میرے دل میں بیٹنے کی خواہش تک باقی نہ رہی تھی۔“

”تم کو زندہ رہنا ہو گا! عشرت! اپنی بوڑھی ماں کے لئے اپنے غم بھائی بہنوں کے لئے۔“

”میں تمہارے لئے زندہ رہوں گا۔“ عشرت کی آنکھیاں رضیہ کی آنکھوں سے کھیلنے لگیں۔

”رضیہ! کیا تمہیں میری ڈوائیو کی سیر یاد ہے؟“

رضیہ کی آنکھیں یہ ایک سترت سے چمک اٹھیں۔

”جے کبھی یاد نہیں آئی“ عشرت نے کہا ”اتنے سالوں میں۔ راج کے ہاں، شمشاد کے ہاں،

دلایت چمک کے ہاں، قرہ کے ہاں، دادا کے ہاں۔ کبھی مجھے وہ رات یاد نہیں آئی۔ تم سے جھوٹ

نہیں بولوں گا۔ ہاں تمہارا چہرہ کئی بار سامنے آیا جیسے مجھ سے شکایت کر رہا ہو اور ہر بار میں نے

تمہارے چہرے کو اپنے ذہن سے مٹا دیا۔ آدمی شکایت کرنے والے چہرے بھول جاتا چاہتا

ہے میں بھی ایسا ہی کرتا تھا، میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ لیکن جرنل وارڈن میں بائیس نمبر کے
بستر پر موت اور زندگی کے درمیان۔ وہ خوبصورت یا کئی بار میرے ذہن میں چمک اٹھی اور مجھے ب
کچھ یاد آیا کہ کولمبے میں سوزین لیڈر شوز کی دوکان پر جاتا۔

”وہ سبز جوتا ابھی تک میرے پاس ہے اس قدر ہی کے بعد میں نے اسے کبھی نہیں پہنا۔“
عشرت نے کہا۔ ”انڈیا گیٹ سے ہم چو پائی گئے تھے وہاں ہم نے کھٹی میٹی پاٹ کھاٹی تھی پھر
انڈیا گیٹ سے ہم برٹی گئے تھے، جہاں ہم نے پھلوں والے سینڈ پر...“
رضیہ نے اس کی بات ٹوک کر کہا۔ ”بھولتے ہو چو پائی سے ہم برٹی نہیں گئے تھے برٹی جانے سے
پہلے ہم سائبرگ گئے تھے جہاں ہم نے آئس کریم کھاٹی تھی۔“

”پھر وہ ٹیکسی میں بیٹھا اور بارش کا برسنا اور ہولے ہولے ٹیکسی کا میری ڈرائیور کی طرف چلے جاتا تم
میرے پہلو میں بیٹھی تھیں۔“

”اور وہ، حند؟“ رضیہ نے آہستہ سے کہا، اور اس نوزائی یاد سے اس کا چہرہ متحرک ہو گیا۔ ”ہائے
وہ حند کبھی نہیں بھولتی۔ حند میں تمہارا وہ چہرہ، تمہاری وہ باتیں۔ تمہارا وہ ————
”بوسہ؟“ رضیہ نے شرم سے عورت کا ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ لیا۔
عشرت کے پیار چہرے پر شرم کی لہر دوڑ گئی۔

”وہ رات اس کے بعد کئی بار میرے بستر پر آئی، بائیس نمبر کے بستر پر زندگی اور موت کے درمیان
فلکے ہوئے کئی بار وہ رات میری زندگی کے مقدس لمحے کی طرح آئی۔ رضیہ تم سے بچ کہتا ہوں جب
میں نے اپنی پوری زندگی کا جائزہ لیا تو صرف ایک وہی رات معلوم ہوئی۔ جیسے میں اسی صبح و صبح
اس طرح رکنا چاہوں گا۔ اس کا ایک لمحہ تبدیل نہیں کروں گا۔ لیکن باقی ساری زندگی ————
اگر یہ میرے میں ہو، اگر مجھے دوبارہ زندگی بسر کرنے کی اجازت ملے، شروع سے آخر تک ترقیاتی

سب بدل ڈالوں گا۔ صرف وہی ایک رات باقی رہنے دوں گا۔
 رفیعہ کا دل خوشی کے مارے زور زور سے دھڑکنے لگا۔

عشرت کچھ دیر چپ رہا پھر بولا ”مگر وقت کے دھارے کے بہاؤ میں تم واپس نہیں جاسکتے
 اپنی زندگی کو بدل نہیں سکتے۔ کچھ نہیں کچھ نہیں ایک لمحے تک کو بلا نہیں جاسکتا“ عشرت کے لہجے
 میں اک پر غلوس پھٹتا ادا تھا۔

”ماضی نہیں مگر مستقبل تو یہ بلا جاسکتا ہے“ رفیعہ نے کہا۔

”اب اگر میں زندہ رہا۔ اور اب میں شب دروڑ اپنی زندگی کے لئے لالچا ہوں، تو میں نے فیصلہ کیا
 ہے۔“

ان فکروں کے لئے، فکروں کے لئے نہیں فکروں کے اندر اس صداقت کے لئے
 کب سے رفیعہ کا دل تڑپ رہا تھا اس کے کان بھوکے تھے ترے ہوئے اس آواز کے لئے وہ کب
 سے غلامی ڈھونڈ رہے تھے اس نئی آواز کے بلائے کو جو اس وقت رفیعہ کے کانوں میں گونج
 رہی تھی

عشرت چپ ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد بولا ”تم نے میری ماں دیکھی ہے؟“
 رفیعہ نے سر جلا یا۔

”اس کے بال سفید ہیں اس کا قد چھوٹا ہے اور اس کا رنگ گورا ہے۔ اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی
 اس کے کانوں پر خیریاں مگر جب وہ ہنستی ہے رفیعہ کو اس کی عمر کے دس پندرہ سال کم ہو جاتے
 ہیں وہ آج بھی ایک بچے کی طرح ہنستی ہے، بہت کم ہنستی ہے کیوں کہ اس کا خاوند مر چکا ہے اللہ
 اس کے بیٹے نے اُسے بہت دکھ دئے ہیں مگر پھر بھی ان دکھوں کے درمیان جب وہ ہنستی ہے

تو اس کا چہرہ مجھ کے تارے کی طرح جھلکنا لگا ہے۔ ان دنوں میں اپنی ماں مجھے بہت یاد آتی رہ
ہاتھوں پر مہندی ایسی عمدہ سما جاتی ہے کہ خطے بھر کی جوان لڑکیاں میری ماں سے اپنے ہاتھوں پر مہندی
کے نقش و نگار تمہارے لئے آتی ہیں۔ بایں خبر کے ہنگ پر بیٹھے بیٹھے بھی باریں نے اپنی ماں
کو تمہارے اور ہندی سے جلاتے ہوئے دیکھا ہے :

”رفیقہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔“

عشرت نے کہا ”کئی بار تخیل میں میں نے دیکھا ہے۔ اپنے آپ کو سہرا لگائے اپنے گھر کے باہر کھڑے
سائیں سے کہتے ہوئے گھوڑا لاؤ۔ پھر نہایت میں جھولنا وہ نوشاہ کا گھوڑا میرے سامنے آیا۔
میں اس پر سوار ہوا اور جانے کن پڑیچا غلیبوں میں ہوتا ہوا میں تمہاری ڈولی کے آگے آگے اپنے
گھوڑے پر سوار نہیں اپنے گھر لے آیا۔ کون گیت گارہا تھا یہ تو میں نے نہیں دیکھا میں نے تو
مرث گھوڑے سے اُتر کر تمہاری ڈولی کا پردہ کھینکا دیا۔ اور میری ماں ہمیں بڑے پیار اور محبت
سے سہارا دے کر.....“

”ہیں! ہیں! رفیقہ سبک سبک کر رونے لگی“ ”ابن تصویروں کو ہاتھ مت لگاؤ عشرت
ایک محرت انہیں تصویروں کو دیکھ دیکھ کر کسی کی سفارقت میں اپنی ساری زندگی بسر کر دیتی ہے“

عشرت کے چہرے پر اک خفیت سی مسکراہٹ آئی وہ خشک کر اپنے بچے پر جاگا اس کی آنکھیں
بند ہو گئیں۔ رفیقہ نے اس کی بغض دیکھی۔ اسے گرم گرم دودھ پلایا۔ عشرت کے چہرے پر وہ اسی
سُرخی دہیں آگئی۔

”عشرت تم زیادہ باتیں نہ کرو“ عشرت نے خوشی اور محبت سے رفیقہ کی جانب دیکھتے ہوئے بہت آہستہ
سے کہا: ”اچھا۔“

”اچھا“ زم زم شیریں لفظ اچھا چاروں طرف محبت کا مرقم مرقم نور بکھیرتا ہوا لفظ اچھا گہری
 سانس لیتا ہوا پرسکون لفظ جو رخصت کے رخساروں کو اکس بوسے کی طرح چھو گیا۔
 رخصت اپنا پر لے کر کھڑی ہو گئی۔ بولی ”یہ اب کل آؤں گی!“

دوسرے دن سیٹر باخو یا کا دیوالہ عمل گیا۔ کوریائی جنگ بند ہو گئی تھی مگر اور شاہک
 اکینچ کے بھاؤ دھڑے بچھڑ گئے تھے۔ باخو یا کا خیال تھا کہ جنگ جاری رہے گی۔ اس کا خیال تھا
 کہ امریکی کیمپ میں نہیں کریں گے۔ جنگ ہوتی رہے گی حالانکہ کئی دنوں سے طرح طرح کی خبریں آرہی
 تھیں۔ مگر باخو یا کو صبح پر بھر دوسرے نہیں تھا۔ اس کا پورے یقین تھا کہ جنگ جاری رہے گی، یہی سوچ کر
 اس نے شاہک اکینچ پر بڑے بڑے دانے کھیلے تھے وہ اور سیڈم ہمیشہ بڑے بڑے
 دانے کھیلنے کے عادی تھے اسی لئے انہوں نے لاکھوں کمائے تھے۔ اسی لئے آج ان کا دیوالہ
 بھی عمل رہا تھا۔

دلورین روڈ پر اور ادمر ادمر کے شوڈیوز میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی سیٹر باخو یا
 نے دیوالہ بحال دیا تھے میں سیٹر کو اتنی لاکھ کا ہرمانہ دیا پڑا اور اس میں کوئی مبالغہ نہ تھا
 سیٹر باخو یا ایک رات میں اسی لاکھ روپے ہار گیا تھا۔ اپنی کل پونجی۔ ایک گھنٹی کوڑی اس کے پاس
 نہ رہی تھی۔ اس کا کل بینک بیلنس۔ اس کے شوڈیوز کارخانوں میں چھتے، بندہ گیس ایک رات میں
 ہلک تبدیل کر چکی تھیں۔ اب سیٹر کے پاس بس وہی روپیہ ہونگا جو اس نے گھر میں رکھا ہوگا یا میٹم

کے زیور اور ایک گاڑی جو خوش قسمتی سے اس کے بھتیجے کے نام تھی۔

یہ خبر سننے ہی جوق و دو جوق لوگ۔ انڈسٹری کے ہر شعبہ کے لوگ سینٹر بائوڈیا کے دفتر میں اخبار افسوس کے لئے پہنچنے لگے۔ کیونکہ سینٹر بائوڈیا کچھ بھی کہنے فلم انڈسٹری کا ایک نامور مشہور آدمی تھا۔ اب تک درجنوں تصویریں بنا چکا تھا۔ سینکڑوں آدمیوں سے اس کے تعلقات تھے بہت سے اداکاروں نے اس کی آنے والی دو ایک فلموں میں مفت کام کرنے کی پیش کش کی۔ اس کے سٹوڈیو کے مزدوروں نے اگلے تین ماہ کے لئے تزاہ لینے کی آفر دی۔ ہر شخص اپنے اپنے طریقے سے اخبار افسوس کو رہتا کچھ بھی کہہ رہی تھی۔

مکرم بھی یہ سنتے ہی سینٹر بائوڈیا کے ہاں پہنچا۔ وہاں میڈم اپنے کمرے میں بدستور تاش کی بازی کھیل رہی تھی۔ وہی رمی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ صرف میڈم اپنے سینے کے اوپر کا ٹوک بار بار اس طرح جھٹکتی تھی جیسے وہ خزانہ کھتی آڑا رہی ہو مگر یہ تو میڈم کی پرانی عادت تھی میڈم کے پاس آگرے کی ایک مشہور طوائف شہی خن جو فلموں میں اپنی قسمت اڑانے آئی تھی۔

میڈم نے مکرم کے اخبار افسوس کا کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی سے وہی کھیلتی رہی۔ اس نے گھر ہی دیکھ کر بچن دت سے کہا۔

”ایک منٹ سے اوپر ہو گیا تم چال نہیں چلے“

میڈم کی آواز میں جھنجھلاہٹ تھی کیونکہ میڈم وقت کی جیسی پابند تھی۔ وہی کہتے وقت اگر کوئی چال میں دوچل رہا تھا۔ یا سیٹ پر آنے میں دیر کرتا۔ یا کسی کام میں دیر کرتا تو اسے سخت کوفت ہوتی تھی وہ وقت منٹ نہیں سینکڑوں کے حساب کی تھی سے پابند تھی بچن دت موسیقار نے مسکرا کر کہا ”میڈم میرا دل کہیں اور چلا گیا تھا“

”دل؟“ میڈم نے غصا ہو کر کہا ”دل کاری سے کیا کام؟“

”تم بھوتے بوجھن دت“ اکرم نے کہا ”میڈم کسی کے دل کی بات نہیں سمجھتی۔ وہ صرف دقت کی سوسیاں دیکھتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں۔ میڈم کے پاس کوئی دل نہیں ہے۔ وہاں اندر بھی ایک گھڑی ہے جس کی ٹک ٹک کو وہ غلطی سے اپنے دل کی دھڑکن سمجھتی ہیں“

میڈم نے چلا کے کہا ”تم خواہ خواہ اپنا فلسفہ بگھاڑ رہے ہو، دیکھتے نہیں میں کیل رہی ہوں“

”میڈم“ اکرم نے پوچھا ”کیا آج بھی آپ کو اس کیل کا پتہ نہیں چلا۔ جو آپ برسوں سے کیل رہی ہیں۔ یہ کیل ہے کہ بزنس ہے۔ جو ابے کہ قبہ خانہ ہے گناہ ہے۔ بددرو کا مٹرا ہوا پانی ہے۔ کتنے ہی بنگلوں کی چیک کریں۔ کتنی ہی عسستوں کی ڈوریں۔ کتنی ہی غلامی کی ریتیاں۔ دھلگے بھیریں۔ ان تاشوں کے تپوں سے بندھی ہیں۔“

”جکے جاؤ“ میڈم نے کہا ”ماتروں میں تمہاری بچہ ساتویں پہننے میں کیا داخل ہوئی کہ تم اکرم سے دنیا کے سب سے بڑے دانش ور بن گئے۔ یہ تو تم آج اخبار افسوس کرنے آئے ہو کہ بچہ جھاڑنے آئے ہو۔ تمہیں مشرم نہیں آتی آج میں دلیرا لہ ہوئی ہوں اور تم اس طرح“

”تم اگر دلیرا لہ ہو تو میں میڈم، تو مجھے اس قدر افسوس نہ سوتا“ اکرم نے کہا ”افسوس تو یہ ہے میڈم کہ تمہارے ساتھ آج کتنے ہی اسٹوڈنٹس کے ملازم، کتنے ہی تصویروں میں کلام کرنے والے اداکار دلیرا لہ ہوئے ہیں۔ جب تم شاگ اپنی پیٹھ پر دھاؤ لگاتے ہو تو کیا تم کبھی یہ سوچتے ہو اس ایک داؤ میں تم کتنے سو لاکھ کتنے ہزار انسانوں، زندہ گیوں کو داؤ پر لگا دیتے ہو۔ یوں ایک چکی میں“

میڈم نے کہا ”تمہاری ان باتوں کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ مگر اندر حاؤ سیٹھا محو طے بات کرو۔ وہ بے چارہ آج باطل ہو کھلوا رہا ہے۔ میرا قابل قدر شوہر۔ وہ آج تمہاری ہر بات سننے کے لئے تیار ہے“

اکرم نے کہا " میں تو اس وقت بھی ری کا کھیل دیکھوں گا۔ مجھے اس میں بٹاؤ نہ رہا ہے "۔
چند منٹ تک خاموشی رہی۔ پھر بچہ ایک میڈم گہرا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ بولی " آج اس تاش میں کوئی
خرا نہیں رہا "۔

اکرم مسکرا کر میڈم کے پاس گیا اور اس کے نازک کندھے پر ہاتھ رکھ کے بولا " تو آؤ میڈم اس
پرانی گھسی پٹی تاش کو پھاڑ ڈالیں۔ اتنے دھاگوں، رستیوں، زنجیروں، ٹوڈیلوں سے بھنی ہوئی بادی
پتروں والی تاش کو پھاڑ ڈالیں۔ اور بادل ہزار۔ بادل لاکھ، بادل کروڑ کی بہت بڑی تاش سے زندگی
کا ایک نیا کھیل کھیلیں۔ جس میں کوئی دھماکا نہ ہو، کوئی ڈھری نہ ہو، کوئی زنجیر نہ ہو۔
نیچے جاؤ " میڈم بڑی حقارت سے اکرم کی طرف دیکھتی ہوئی کمرے سے باہر چل گئیں۔

سیٹھ بانکڑیا داتنی بہت بوکھلائے ہوئے پریشان حال اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے
تھے۔ اکرم کی باتیں سن کر ان کی آنکھوں میں آنسو گئے۔ وہ تم آج میرے ڈائریکٹر ہو جس نے میرے لئے
ایک پچر فٹ بننے کی آفر دی ہے۔ آج صبح سے میرے ہاں لوگوں کا تانا بٹا ہوا ہے۔ اکرم ایک
عجیب و غریب بات مجھے مسلم ہوئی۔ جس سے ٹیلیفون پر ٹیلیفون کر رہے ہیں۔ بڑے بڑے سیٹھوں
کے میرے لکھتی دوستوں کے افسوس بھری دلی کے ٹیلیفون گمراہ شخص بھی ان لکھتوں میں سے میرے
پاس آتے نہیں آیا۔ جنہیں میں نے ضرورت کے وقت پانچ پانچ لاکھ روپے قرض دئے ہیں، اور اگر
آ رہے ہیں تو تمہارے ایسے لوگ تم سے بھی غریب لوگ میرے سٹورڈیو کے مزدور، ملازم، نوکر پیشہ
بد حال غریب لوگ ان کے پاس تو خود ایک پیسہ نہیں ہے لیکن وہ کس بچے دل سے میرے ساتھ
بھردی کر رہے ہیں۔

حالانکہ ————— حالانکہ ————— ان تمام لوگوں پر مصیبت لگنے والوں میں ہی وہ اکیلا آدمی ہیں۔ لیکن یہ لوگ بھی اپنی مصیبت کی بات نہیں کرتے۔ مرنے میری مصیبت کی بات کرتے ہیں۔
اکرم چپ رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد سیٹھ نے کہا۔

”میرا خیال ہے! اکرم! کسی کے پاس زیادہ روپیہ نہیں ہونا چاہئے اتنا زیادہ روپیہ نہیں ہونا چاہئے کہ اس کا دماغ خراب ہو جائے۔“

اکرم نے مسکرا کر کہا۔ ”سیٹھ یہ تم قو آج سوچتے ہو۔ لیکن اگر کسی کو تباہی سے پاس پھر کہیں سے ہانچے ہیں تاکہ روپیہ آجائے تو تم پر۔“

”ہاں۔“ سیٹھ ہانکھو دینے اپنی افسردگی کے بارے میں نہیں کر کہا۔ ”تم باطل ٹھیک کہتے ہو۔“ میں بھر دی۔ ”ہاں تم باطل ٹھیک کہتے ہو۔“ سیٹھ زور زور سے ہنسے گا۔ بات اس کی گہری گئی تھی

ایک رات رضیہ کو مشرت کے پاس رہنا پڑا۔ کیوں کہ اچانک ہی مشرت کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ شام کے وقت جب رضیہ اس کے ہاں پہنچی تھی تو وہ غاصہ ہشاش بشاش نظر آتا ہے۔ آج رضیہ بھی بہت خوش تھی کیونکہ اکرم کی تصویر یہ کہان ”مارو میں آٹھویں چھتریں جاری تھی۔ کھانا ان کے مزور۔ ایسے لوگ جو ہمارے شکر کے سینکڑوں مکاؤں میں اپنے چھوٹے گھر اور کھیتیاں چھوڑ کر

آئے تھے یا زینداہوں کے غلم کی وجہ سے وہاں سے بے دخل ہو کر چلنے لگے تھے اور شہر بکری میں
 اگر نئے نئے مزدور رہنے تھے۔ ان لوگوں کے لئے کسان اور اس کی زمین کا سلا ایک گہری دل چسپی کا
 باعث تھا، جو حق و جوت سینکڑوں کی تعداد میں یہ لوگ ہر مزدور ماتر دو سینا میں دس آئے فرج کر کے
 مکان - پتھر دیکھ رہے تھے اور جان رو لینڈ کہتا تھا کہ ماتر میں تاشائیوں کا یہ طبقہ کبھی سینا دیکھنے
 نہیں آیا تھا۔ خود اس کے لئے یہ تصویر ایک نیا تجربہ تھی۔ اتنے سالوں میں ہالی وڈ کی صرف ایک
 پتھر کے سوا ماتر میں کوئی اور تصویر آنٹھوں پہننے میں نہیں پہنچی تھی اور جان رو لینڈ کا خیال تھا کہ ابھی
 تین چار پہننے یہ تصویر اس طرح زندہ پتھر کے چلے گی۔ اور گو اکرم اور ستیہ رائے اور دوسرے لوگ
 پتھر کی کامیابی سے بہت خوش تھے مگر بیٹھ کر چند سے جھگڑا ہونے کی وجہ سے وہ کوئی نئی تصویر
 شروع نہیں کر سکتے تھے۔ بیٹھ سے ان کی بدستور ملائی تھی۔ ماتر کی بیٹھ کی اخراجات بہت
 تھے۔ اور ان اخراجات کو ادا کرنے کے بعد جو تھوڑا سا فائدہ جوتا تھا وہ بیٹھ کر چند کی جیب میں
 جا رہا تھا۔ ان لوگوں کے پاس ایک پائی نہ پہنچتی تھی جس سے وہ کوئی دوسری پتھر شروع کر سکتے نہ
 ابھی کسی دوسرے فائبر سے کوئی پیش کش آئی تھی۔ اس لئے ذہنی اعتبار سے نہ بھی مانی اعتبار سے
 یہ لوگ بہت پریشان تھے۔

انہیں دفوں سویت اس پورٹ فلم بکری کے غلم تھے کسان، فلم دیکھی اور بہت پسند کی
 اس نے ماسکو کو نکھا کہ اس فلم کی نمائش اگر سویت یونین میں ہو تو بہت اچھا رہے گا۔ فلم ماسکو
 بھیجی گئی۔ نہ ہاں ماہرین فن نے دیکھی پسند کی اور سویت یونین میں نمائش کے لئے خرید لی گئی۔ اکرم
 اور ستیہ رائے بہت خوش ہوئے اب وہ نئی تصویر شروع کر سکتے تھے۔

غیر نے عشرت کو بتایا کہ اکرم کہ رہا تھا جب چاروں طرف اندھیرا تھا اور کسی کوئی روشنی نہ
 تھی۔ پتھر کا سیاب تھی مگر سب مدہر بیٹھ کی تجویز میں جا رہا تھا اور وہ جنہوں نے اپنے دل و دماغ اور

جسم کی ساری محنت سے اس پتھر کو کامیاب کیا تھا۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھوے بیٹھے تھے۔ اور کوئی تھوکی
 خمرغ نہ کر سکتے تھے۔ اس وقت ہاتھ اٹائے۔ یہی میں کام کرنے والوں کے ہاتھ اور ہاتھ کے لوگوں کے
 ہاتھ۔ ایک مضبوط مصالغہ کی طرح ہمارے ہاتھوں سے مل گئے اور ہم نے محسوس کیا کہ ہم اکیلے نہیں ہیں
 مگر لاکھوں کروڑوں لوگ ہمارے ساتھ ہیں۔ ہم ان کے ساتھ ہیں۔ وہ لوگ جو ہماری ہی طرح ہیں وہ
 ہماری ہی طرح محسوس کرتے ہیں۔ سوچتے ہیں، کام کرتے ہیں۔ محنت کرتے ہیں، روتے ہیں، ہنستے
 ہیں اور صلح اور امن کی باتیں کرتے ہیں۔

اور اگر مگر رہا تھا مجھے آج محسوس ہوا ہے جیسے میری والدہ نہیں دس لاکھ دس کروڑ باتیں ہیں۔
 آج روفیہ کی آنکھوں میں مسرت کی گہری چمک تھی وہ عشرت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اپنی ”یہ
 دو تین پانچ شکل کے ہیں پھر ہماری نئی تصویر شروع ہو جائے گی اور میں نے گرم سے وعدہ لے لیا
 ہے جب تم آجئے ہو جائو گے نہیں دو اس پتھر میں ضرور کام دیں گے۔ بیرو کا نہیں مگر کوئی اچھا
 رول جسے تم بخوبی جانتا ہو۔“

”اچھا ہو کے اب میں کام کرنا چاہتا ہوں۔ کوئی معمولی سا کام، مگر اپنے ہاتھوں کی محنت کا کام۔
 جس سے میرے ہاتھ سے پسینہ چمکے میرے ہاتھوں میں قوت آئے۔ میرے سینے میں سانس
 مضبوطی سے چلنے لگے۔ میں اب ایسا کام کرنا چاہتا ہوں۔ اور اچھا ہو کے اب میں بھی کروں گا۔“
 عشرت چپ ہو گیا۔ روفیہ خوشی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔
 عشرت نے کہا ”کیا تم نے مجھے سمجھا کر دیا ہے؟“

روفیہ نے اپنے رخسار عشرت کے گالوں سے لگا دئے ”کیسی باتیں کرتے ہو جس صورت میں مجھے
 معلوم تھا۔ ایک دن تم میرے پاس آؤ گے۔ میری محنت اتنی مضبوط تھی۔“
 یہ ایک عشرت کا چہرہ باہل نمودار کیا۔ اس نے آہستہ سے اپنی آنکھیں بند کر لیں وہ نیچے پر لٹکے

گہرے سانس لینے لگا۔

”کیا ہوا۔“

”پتہ نہیں بہت ہی سخت درد ہو رہا ہے۔“

رضیہ بلدی ہے نس کو بلا لائی۔ نس بھاگی بھائی ڈاکٹر کے پاس گئی۔ اب عشرت کا درد بڑھتا جا رہا تھا اس کے ہاتھ پاؤں ٹیٹور ہو چکے تھے۔ اس کا چہرہ نیلا پڑتا جا رہا تھا۔

ڈاکٹر نے غور سے دیکھنے کے بعد کہا ”پیٹ کے اندر مہرچ ہو رہا ہے اللہ اندر کا زخم کھل گیا ہے۔“

”زخم؟ رضیہ چونکی۔“

”گروے کا آپریشن جو ہوا تھا۔ وہ زخم شاید کھل گیا ہے اندر سے۔“

”پھر؟“

ڈاکٹر نے اپنے شلے ہلائے اور خاموش بہت درنگ وہ عشرت کے پاس بیٹھا رہا۔ دوا دی گئی انجکشن لگائے گئے۔ سب نرکیں کی گئیں۔ مگر عشرت کی حالت بگڑتی گئی۔ رات کے تین بجے ڈاکٹر رضیہ کو کچرے کے باہر لے گیا۔ اور اس سے کہنے لگا ”اب کوئی اُمید نہیں رہی“

رضیہ خاموش تھی۔

ڈاکٹر نے اپنی گمڑی دیکھ کر کہا ”اب یہ چند گھنٹوں کا نہاں ہے۔ یہیں اس سے اگر کوئی خاص بات کہنی ہو تو کرو۔ اس کے گمڑوں کو بلانا ہو تو بلاؤ۔ میں اپنی گاڑی دیتا ہوں۔ اب فائدہ قریب ہے۔ رضیہ باہل خاموش رہی، ڈاکٹر نے گمڑی دیکھ کر کہا ”مجھے ایک دوسرے رخص کو دیکھنے

جانا ہوگا۔ دوسرے ڈاکٹر کو ادھر بھیجتا ہوں۔ ہم لوگ تو آخری دقت تک لڑیں گے۔ مگر...“

ڈاکٹر نے اپنے شلے ہلائے اور سر جھکائے وارڈ سے باہر چلا گیا۔

”ٹاکٹر کیا کہتا تھا “ عشرت نے پوچھا۔

”وہ کہتا تھا تم زندہ رہو گے۔“ رضیہ نے کہا۔

”میں جانتا ہوں اس نے کیا کہا تھا۔ میں مر رہا ہوں“

”نہیں عشرت!“

”ہاں! میں جانتا ہوں۔ میرے جسم کی ہر گ اور ہر شے۔ داغ اور اعصاب کا ہر ذرہ اس وقت جانتا ہے۔ رضیہ میرے قریب آ جاؤ۔ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو۔ اپنے رخسار میرے رخساروں سے لگا دو۔ ہاں اس طرح۔ رضیہ میری بیوی!“

رضیہ کے ہونٹ کانپے۔ اس نے زور سے ہونٹ اپنے دانتوں تلے دبائے اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔ اس نے زور لگا کر بڑی خصل سے ان آنسوؤں کو اپنی آنکھوں میں دھکا دیا۔ مگر آنسو نہیں رکے چلا کہ اس کے رخساروں پر بہنے لگے۔ اس کے رخساروں سے ہوتے ہوئے عشرت کے رخساروں پر بہنے لگے جیسا پہلے ہی سے عشرت کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔

”دوؤ۔ دوؤ۔ رضیہ! آنسوؤں کو اپنے دل نہ لے آنسوؤں کو میرے آنسوؤں کو ایک قدم سے پھل جانے دو! آنسوؤں کا سنگم ہے۔ میری روح اس میں نہا کر پاک و صاف ہو رہی ہے۔ آج ساری غلطیاں ساری کوتاہیاں اور ساری برائیاں چٹ گئی ہیں اور میری روح دلی و صوفیٰ تمہاری محبت کے نور کا لباس پہنے جگمگ رہی ہے۔ دیکھو رضیہ آج میں پھر حیا ہوں۔ پہلے کی طرح پھر پھر دمیں.... تمہارا بیرو!“

آج میں ایک ہیرو کی موت مروں گا۔ تباہی باہنوں میں ایک ہیرو کی طرح اُودہ زور سے چلتا ہوا۔ پھر
یہ ایک اس کے بازو ڈھیلے پڑ گئے اور وہ بے ہوش ہو کر بستر پر گر گیا۔

اس کے بعد وہ ہوش میں نہیں آیا۔ لمحہ بہ لمحہ۔ سیکنڈ منٹ۔ گھنٹے گزر گئے۔ دیوار پر لگی
ہوئی گھڑی ٹپک ٹپک کرتی رہی ٹپک ٹپک میں جاتی ہوں۔ ٹپک ٹپک میں جاتی ہوں۔ ٹپک ٹپک میں جاتی
ہوں۔ . . . ٹپک ٹپک میں جاتی ہوں۔

”عشرت“

”ٹپک ٹپک میں جاتی ہوں“

لیکن عشرت نے رضیہ کی آواز نہیں سنی۔ اس کا بے ہوش سنا ہوا چہرہ اب باہل نیلا چڑ گیا تھا۔
آنکھیں بند تھیں۔ اور سینے میں الٹی سیدی سانسون کا شور عالم سکرات کا پتہ دیتا تھا۔ سیکنڈوں منٹ
سیکنڈوں صدیوں کی طرح گزر گئے۔ صبح کے پانچ بجے کے قریب عشرت نے آنکھیں کھولیں، اور
اس نے کہا: ”ماں ڈولی آگئی“

اس کے بعد اس نے آنکھ بند کر لی۔ اس کے گلے کا منکا ڈھلک گیا۔ اور اس کا ہاتھ رضیہ کے ہاتھ
میں سرور ہو گیا۔

عشرت — ”رضیہ زور سے چلتی ہے۔“

”ٹپک ٹپک میں جاتی ہوں“

رضیہ یہ دیکھ کر رضیہ کی باہنوں میں جاگزی۔ رضیہ نے ایک بچی کی طرح اُن سے گلے سے لگایا۔ اور اسے
ٹوہا رس دینے لگی۔ مگر رضیہ اس طرح بلک بلک کر رو رہی تھی، جیسے ایک انسان نہیں ایک زخم
رو رہا ہو۔

کہتے ہیں مرنے والے کے ساتھ اس کی ساری مصیبتیں اور دکھ ختم ہو جاتے ہیں۔ جب وہ
مرتا ہے تو اپنی ساری زندگی اپنے ساتھ لے جاتا ہے اور پھر اس دنیا میں اس کا کچھ نہیں رہتا اس
کی یاد رہتی ہے ابھی یا بُری۔

اور ہونا بھی ایسا ہی چاہئے۔ مگر ہم لوگ بڑے عجیب وقت میں ایک عجیب زمانے میں ایک عجیب نظام
زندگی میں رہتے ہیں یہاں مرکز کی غلامی نہیں ہوتی اور مصیبت کم نہیں ہوتی۔ جو بے عزتی
زندگی میں حاصل ہوتی ہے وہ مرنے کے بعد دو چند ہو جاتی ہے۔ ایک حد ہے جس کے آگے کوئی
نہیں جانا۔ جہاں مرنے والے کے سارے گناہ بخش دئے جاتے ہیں۔

مگر جس دنیا میں ہم رہتے ہیں وہاں مردوں کو بھی معاف نہیں کیا جاتا۔ یہاں کوئی حد نہیں ہے کوئی
معافی نہیں ہے۔

رضیہ جوں ہی وارڈ سے باہر نکلی۔ سر جھکائے ہوئے آنسوؤں نہتی ہوئی۔ زم نے اس کے ہاتھ میں ایک
پل دیا، رضیہ نے جھللاتے ہوئے آنسوؤں میں اسے پڑھا۔

۲۴۲ — — — — — کرے کارایہ

۳۲۱ — — — — — انجکشن دلائیاں

۴۰ — — — — — خاص غذا اور کمی

۴۶۳ — — — — —

۲۰ — — — — — جو رستم اب تک دی جا چکی ہے

۴۶۳ — — — — — بقایہ

زیر نے کہا ”جیسے تم سے بڑی ہمدردی ہے۔ ہم نے پوری کوشش کی۔ مگر اُسے دیکھا سکے۔ موت ناگزیر ہے۔ تم ایسا کرنا کہ یہ بل عشرت کی لاش کو لے جانے سے پہلے ادا کر دینا۔ ہسپتال کا قاعدہ ہے۔“

رضیہ نے کہا ”بہت اچھا“ مگر اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ چار سو تریسٹھ روپے اکٹھا آنے کا بل آج ہی ان اعلیٰ چار گھنٹوں میں کہاں سے ادا کر سکے گی۔ اکرم کے پاس پیسے نہیں تھے سیدنا کے پاس پیسے نہیں تھے اور اب تو رضیہ کے پاس بھی پیسے نہیں تھے۔

پھر وہ کہاں سے یہ چار سو تریسٹھ روپے اکٹھا آنے کا بل ادا کرے گی۔

یہ ایک اسے راج کا خیال آیا جس لڑکی نے عشرت کو تباہ کیا تھا جس لڑکی نے عشرت کے بیٹے سے لگ کر اس کی جوانی کا سارا رس چوس لیا تھا۔ یقیناً وہ عشرت کے کفن کے پیسے تو دے دے گی۔

اگر رضیہ کے پاس پیسے ہوتے تو وہ مر جاتی مگر کبھی راج کے پاس نہ جاتی مگر اس وقت کوئی چارہ بنتا وہ اپنے محبوب کی لاش ہسپتال میں مٹا نہیں سکتی تھی۔

باندھ بیچ کر وہ دیر تک راج کے بنگلے کے باہر گل ہر کے درخت کے نیچے کھڑی رہ فیصلہ کرنے کی کوشش کرتی رہی کہ وہ اندر جانے نہ دے۔ اس کا دل اندر جانے کو نہ چاہتا تھا۔ وہ ایک قدم اٹھاتی مگر پھر اس کا احساس اسے روک لیتا۔ پورے میں راج کی بادامی رنگ کی کپڑی لگ سورج کی شعاعوں میں چمک رہی تھی، اس کا خاندان شکر کاٹھی کے اندر خاموش بیٹھا تھا پتھر کی صورت۔ شاید راج کہیں باہر جانے والی تھی۔ یہ ایک رضیہ نے سوچا۔ وہ بڑھ کر اندر چلی ہی جائے اور راج سے بات کرے۔ کہیں راج باہر چلی گئی تو اسے ایسا موقع نہیں ملے گا۔

اس نے بلاؤں سے دوہلی نکالا۔ چار سو تریسٹھ روپے اٹھانے والا۔ اور جرأت کر کے کینڈی لک کے کنگے سے گھوم کے اندر ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔ جین اس وقت راج اپنے کمرے سے باہر نکلی۔ بھی بھائی۔ ایک عمدہ بناری ساڑھی میں ملبوس، خوب صورت، دل کش، دل ربا، اس کے ہوشوں پر ایک تابناک تبسم تھا اور اس کی نینل میں ایک نوجوان چل رہا تھا۔ رخصتے دیکھ کر حیرت کی پیچ لہر کر ٹھٹھک کر رہ گئی۔

”بائیں یہ عشرت تھا، زندہ؟“

دوسرے لمحے میں جب وہ نوجوان قریب آیا تو رخصی نے محسوس کیا کہ یہ عشرت نہ تھا، یہ تو کوئی اور تھا۔ مگر جلدے کیوں اس نوجوان کا چہرہ بہرہ کسی ان جلدے طریقے سے عشرت کی یاد دلانا تھا جیسے اس نوجوان اور عشرت میں کوئی رمانٹ ہو۔ دوسرے لمحے یہ اچانک رخصی کی سمجھ میں آ گیا۔ ہاں اس نوجوان کا چہرہ بھی ایٹن ٹاؤسے ملتا تھا۔

راج نے رخصی کو اس نوجوان کی طرف گھورتے ہوئے دیکھ کر اس کا تبارون کولنے ہوئے کہتا یہ بری سہیلی رخصی۔ آپ ہی عشرت؟“

عشرت؟ رخصی چوٹھی۔

راج نے ہنس کر کہا۔ نہ تریس گنج والا عشرت نہیں۔ ان کا نام بھی اتفاق سے عشرت ہے۔ وہی فراخ سینہ، مسکراتے ہوئے ہونٹ۔ وہی بروگ کے جوئے، وہی دونوں راتلی لہن

کی بیش خیرت..... وہی نام..... وہی لباس رخصی کا بھی چادر بڑھ کر اس عشرت کو اپنی باجھوں میں جکڑے، اس سے چلا چلا کے کچھ نہ جاوے عشرت سے بچے عشرت۔ اس زندہ موت کے ساتھ کہیں نہ جاوے راج نے مسکو کے پریشان حالی رخصی سے پوچھا کہوں۔ کچھ کام ہے کچھ چاہئے؟
رخصی نے دل میں کہا: ہاں مجھے تمہے کام تھا۔ میں تم سے کچھ ملنے آئی تھی۔

ایک کفن ! _____

عشرت کے لئے ایک کفن _____

مگر اب میں سوچتی ہوں تم سے کس کے لئے کفن مانگوں؟

اس عشرت کے لئے جو ہسپتال میں مرنے پڑا ہے؟

یا اس عشرت کے لئے جو تباہی بانہوں میں زندہ ہے؟

رفیقہ نے ایک لمحے کے لئے نظر بھر کے راج کی طرف دیکھا اور پھر چپ چاپ خاموشی سے اسکا میں

سر ملا دیا بغیر شعوری طور پر اس نے وہ بات چہچہے کر لیا جس میں ہنسی بھرا رکھا تھا۔

پھر نہ ہلٹ کر اپنے آنسوؤں کو روکتی ہوئی تیز تر قدموں سے دوڑتی ہوئی بچلے کے باہر چلی گئی۔

فہرست کتب

| | | |
|-------|------------------|--------------------------|
| 90 00 | دیوان سنگھ مہزون | ناقابل فراموش |
| 80.00 | جوش ملیح آبادی | یادوں کی بارات |
| 27 00 | سعادت حسن منٹو | منٹو کے ڈرامے |
| 18'00 | ،، | منٹو کے افسانے اور ڈرامے |
| 15 00 | ،، | چمنازے |
| 15 00 | ،، | چغند |
| 18 00 | ،، | پھندلے |
| 12.00 | ،، | دھواں |
| 12 00 | ،، | برقیے |
| 12 00 | ،، | بغیر اجازت |
| 10 00 | ،، | آتش پارے |
| 10 00 | ،، | سرگزشتِ اسیر |
| 8 00 | ،، | شکاری عورتیں |
| 6.00 | ،، | نور جہاں سرور جاں |
| 10 00 | ،، | بغیر عنوان کے |
| 27 00 | کرشن چندر | باون ہنرے |
| 18 00 | ،، | ایک کروڑی بوتل |
| 12 00 | ،، | پوکاپس کی ڈالی |
| 12.00 | ،، | وزیرون کا کلب |

مکتبہ شعروادب سمن آباد۔ لاہور